رأس الحكمة مخافة الله

دین میں ترجیحات

علامہ یوسف القرضاوی

ترجمہ

گُل زادہ شیرپاؤ

منشُورات

دین میں ترجیحات ہر مسلمان کی زندگی کا اہم عملی مسئلہ ہے۔ آج اُمت کے بہت سے مسائل کی وجہ یہ ہے کہ ترجیحات کو اُلٹ دیا گیا ہے۔ فرع اصول سے زیادہ اہم ہوگئی ہے۔ اُمت مسلمہ کی نشاتِ ثانیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ انفرادی و اجتماعی طور پر اپنے تمام معاملات میں اہم اور غیر اہم کا تعین کر کے اہم کو غیر اہم پر مقدم کرے۔ مصنف نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کی ہے اور احکامِ الٰہی اور فرامینِ نبوی سے ترجیحات کے تعین کے لیے رہنمائی دی ہے۔ اس کے مطالعے سے دین پر عمل کی راہ آسان ہوتی ہے۔

یوسف مصطفیٰ القرَضاوی [پ ۹ ستمبر ۱۹۲۶ء، مصر]۔ جامعہ ازہر سے ۱۹۵۳ء میں کلیہ اصول دین سے بی۔ اے اور ۱۹۵۴ء میں تدریس کی سند حاصل کی۔ ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹریٹ کی۔ ڈاکٹر قرضاوی عنفوانِ شباب ہی سے اسلام کی دعوتی سرگرمیوں سے وابستہ ہوگئے۔ وہ ایک خطیب اور علم و تحقیق کی دُنیا کے عظیم رجال میں شمار ہوتے ہیں۔ سو سے زائد چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں۔

علامہ قرضاوی میں ایک فقیہ کی دِقتِ نظر بھی پائی جاتی ہے اور ایک ادیب کی شان بھی، ایک مجدد کی فکری عظمت اور ایک داعی کی حرارتِ ایمانی بھی۔ وہ متعدد عالمی تحقیقی و علمی اداروں سے وابستہ ہیں۔

اِنھیں شاہ فیصل ایوارڈ برائے خدمات اسلامی سال ۱۴۱۳ ہجری، کے علاوہ اسلامی بنک برائے معاشی ترقی کا ایوارڈ سال ۱۴۱۱ ہجری اور سلطان حسن البلقیہ [شاہ برونائی] ایوارڈ برائے فقہ اسلامی، سال ۱۹۹۷ء بھی دیا گیا۔

منشُورات ۱۹۹۳ سے ملک میں تعمیری لٹریچر کی اشاعت میں سرگرمِ عمل ہے۔ ہماری دین کے وسیع تصور کے مطابق ہم زندگی کے ہر گوشے سے متعلق ادب کی ہر صنف شائع کرتے ہیں۔

04136 / 240

دین میں ترجیحات از علامہ یوسف القرضاوی، ترجمہ: گل زادہ شیر پاؤ

پہلا ایڈیشن: مئی ۲۰۰۸ء_ تعداد: ۲۰۰۰

دوسرا ایڈیشن: دسمبر ۲۰۱۲ء_ تعداد: ۱۱۰۰_ کوڈ: 04136_ قیمت: ۲۹۶ روپے

سرورق: راشد الیاس مہر _ کمپوزنگ: فراز احمد سلیم

ناشر: منشورات، منصورہ، لاہور۔۵۴۷۹۰_ مطبع: عرفان افضل پریس، بندروڈ، لاہور۔

فون: 35434909_ فیکس: 042-35434907_ ای میل: manshurat@gmail.com

ترتیب

❖❖❖

پیش لفظ

فی زمانہ کلمہ گو مسلمانوں میں ایک اچھی بھلی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کا کلمہ پڑھنا انھیں دین پر عمل کے لیے نہیں ابھارتا، وہ نماز تک کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ لیکن جو لوگ، حضرات وخواتین، دین پر عمل کرنا چاہتے ہیں ان کی مشکل یہ ہے کہ انھیں دین کا جتنا جیسا علم ہے، وہ اس پر عمل کرتے ہیں، اور اہم اور غیر اہم کی تمیز کے بغیر، جوشِ ایمانی میں اس پر اصرار بھی کرتے ہیں، خواہ اس سے کچھ بھی مسئلہ پیدا ہو رہا ہو۔ اس طرح دین پر عمل، جو ایک فطری اور آسان کام ہے، مشکلات ومسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔

دینی احکامات کا تعلّق زندگی کے ہر دائرے سے ہے۔ عمل کرتے ہوئے روزمرہ زندگی میں ایسے مواقع پیش آتے ہیں کہ دین کے ہی دو راستے نظر آتے ہیں، کس پر عمل کیا جائے؟ کسے ترجیح دی جائے؟ ایک بنیادی رہنمائی تو ہر ایک کو یہ معلوم ہے کہ نفل کو فرض پر ترجیح نہ دی جائے۔ نفل ترک ہو جائے، فرض ترک نہ ہو۔

ہمارے معاشرے میں نفل حج اور ایک کے بعد ایک عمرے کرنے کا رواج کافی بڑھ گیا ہے، جب کہ دوسری طرف معاشرے میں بھوک غربت اور جہالت عام ہے اور دین کے اجتماعی تقاضے پورے کرنے کے لیے وسائل فراہم نہیں ہو پاتے۔ یہ موضوع بھی ترجیحات سے متعلق ہے۔

اسی طرح فروعات، جزئیات اور اصولی دُنیاوی معاملات میں فرق کرنے کا مسئلہ ہے۔ اُمت کا ایک مسئلہ اس وقت یہ بھی ہے کہ مسالک سے وابستہ افراد مسلکی معاملات کو اتنی اہمیت

دیتے ہیں کہ دین کے بنیادی امور نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

علامہ یوسف القرضاوی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ آپ نے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس اہم مسئلہ پر "**فی فقه الأولویات**" کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں مبحث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے دین کا وہ فہم پیدا ہوتا ہے کہ احکامات میں ترجیحات طے کی جا سکیں اور کم اہم، زیادہ اہم اور غیر اہم کا تعین کیا جا سکے۔

عالم عرب میں جدید تقاضوں کے تحت وافر معیاری لٹریچر تیار ہو رہا ہے۔ ضرورت تو یہ ہے کہ بڑے پیمانے پر ان تمام کتب کا اردو ترجمہ اور اشاعت ہو۔ تاہم اس بڑے کام میں شرکت کرتے ہوئے منشورات اس اہم کتاب کا ترجمہ پیش کر رہا ہے۔ اُمید ہے کہ دین سے وابستگی رکھنے والے، دین پر کما حقہ عمل کی خواہش رکھنے والے لوگ اس سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

مسلم سجاد

❖❖❖

عرضِ مترجم

عالم اسلام کی علمی شخصیات میں علامہ یوسف القرضاوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ زمانہ شباب سے لے کر اب تک ان کی بے شمار کتابیں علمی حلقوں سے داد تحسین پا چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے اسی طرح کے ایک علمی شاہکار **في فقه الأولويات** کا ترجمہ ہے۔ اس میں انھوں نے دین کے مختلف پہلوؤں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ترجیحات جیسے اہم موضوع پر قرآن وسنت کی روشنی میں اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ انھوں نے اپنے موقف پر جو دلائل پیش کیے ہیں ان پر کلام کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان کی بعض فقہی آرا سے اختلاف ممکن ہے۔ ہم نے بعض جگہ حاشیے میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ مگر اس کتاب کا جو بنیادی نظریہ ہے وہ امت کی نشأۃ ثانیہ کے لیے یقیناً بہت اہم ہے۔ اور وہ یہ کہ امت مسلمہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے تمام معاملات میں اہم اور غیر اہم یا زیادہ ضروری اور کم اہمیت والی چیزوں کا تعین کر کے اہم کو غیر اہم پر مقدم کرے اور زیادہ اہمیت والی چیزوں کو کم اہمیت والی چیزوں سے پہلے رکھے۔ ہماری رائے میں اس کتاب کی اس بنیادی فکر سے انکار ممکن نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ترجیحات کا مسئلہ جتنا زیادہ اہم ہے اسی قدر موجودہ دور میں ہم اسے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت ایک انتشار اور افراتفری کی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ ہر معاملے میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ بعض امور میں اتنا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ ان میں اسلامی حدود کے اندر نہیں رہا جاتا اور بعض اہم امور کو ایسے نظر انداز کیا جاتا ہے جیسے ان

کی اسلام میں کوئی اہمیت ہی نہیں۔ مثال کے طور پر تراویح میں تعداد رکعات کا معاملہ ہے تو اس میں ہر مسلک کے پیروکار اپنی بات پر اتنا زور دیتے ہیں کہ بعض اوقات نوبت لڑائی جھگڑے اور قتل وقتال تک پہنچ جاتی ہے۔ حالانکہ تراویح میں رکعتوں کی تعداد کا مسئلہ ایک فروعی مسئلہ ہے جب کہ کسی مسلمان کو عمداً قتل کرنا اتنا سنگین جرم ہے کہ اس پر خلود فی النار کی وعید سنائی گئی ہے۔ مؤلف نے زندگی کے ہر میدان کے بارے میں واضح طور پر نشان دہی کی ہے اور تفصیل سے تمام مسائل میں ہونے والی افراط وتفریط کا ذکر کیا ہے۔

میں اپنے تمام اساتذہ کے لیے دست بدعا ہوں جن کے دم سے مجھے کسی نہ کسی حد تک دین کی خدمت کا موقع مل رہا ہے۔ ان میں سے خاص طور پر اپنی والدہ مرحومہ (جنھوں نے مجھے قاعدہ بغدادی پڑھایا تھا) اور حضرت مولانا گوہر رحمان رحمہ اللہ کے لیے خصوصی طور پر دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور انھیں اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائے۔

اس موقع پر میں برادر مولانا سمیع الحق شیرپاؤ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو میرے محسن بھی ہیں اور اس کتاب کے ترجمے کے محرک بھی۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب اردو دان طبقے کے لیے ترجیحات کے تعین میں راہنما ثابت ہو اور یہ امت کی نشأۃ ثانیہ کی بنیاد بنے۔ آمین

گل زادہ شیرپاؤ
منصورہ، لاہور
۲۷ رنومبر ۲۰۰۷ء

دیباچہ طبع دوم

چند سال پہلے علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی اس اہم کتاب کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اللہ کے فضل وکرم سے یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں کئی بار اس کو چھپوانا پڑا۔

کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد جہاں قارئین کی طرف سے اس کی پسندیدگی کا اظہار کیا گیا وہاں بعض احباب نے اس بات کی طرف بھی متوجہ کیا کہ کتاب میں مؤلف کی بعض ایسی آرا جو تفرد کے زمرے میں آتی ہیں' کی وضاحت حواشی وتعلیقات کے ذریعے کی جانی چاہیے۔

ان احباب میں سرفہرست میرے استاذ محترم مولانا مفتی سید محمود فاروقی اور اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور کے شعبہ نباتیات کے چیئرمین ڈاکٹر سید ذاکر شاہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے کتابت کی غلطیوں کو نوٹ کر کے ہمیں ان سے آگاہ کیا تھا۔ اسی طرح مرکز علوم اسلامیہ کے استاذ الحدیث مولانا محمد احمد واسطی صاحب نے بھی ہماری درخواست پر کتاب کو پڑھا اور بہت مفید مشورے دیے۔ ہم ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

جیسا کہ طبع اول کے 'عرضِ مترجم' میں بتایا گیا تھا، اس کتاب کا بنیادی تصور تو مختلف اُمور میں ترجیحات کا خیال رکھنا ہے جو یقیناً ایک اہم موضوع ہے، مگر ان کی تمام آرا سے اتفاق ضروری نہیں۔ چنانچہ اصولوں کی وضاحت کے لیے جو مثالیں دی گئی ہیں اُن سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔

طبع اول میں اس غرض سے بعض حواشی لکھے گئے تھے، مگر بعض مثالیں پھر بھی ایسی تھیں جن کی وضاحت ضروری تھی۔

اس کے علاوہ شروع ہی میں ترجمہ وتدوین کی بعض اصلاحات کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ نیز کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کی بعض اغلاط بھی سامنے آگئی تھیں جن کو درست کرنا ضروری تھا۔ اس حوالے سے کتاب پر نظرثانی بھی کافی عرصہ پہلے شروع کی گئی تھی مگر مختلف وجوہات کی بنا پر یہ کام تشنہ تکمیل تھا۔

اب اللہ کے فضل سے نظرثانی کے بعد نئی تدوین، اصلاحات اور حواشی کے علاوہ بعض عنوانات میں تھوڑی بہت تبدیلی اور بعض نئے عنوانات کے اضافے کے ساتھ اس کو پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے قارئین اس اشاعت کو پسند فرمائیں گے۔

گل زادہ شیرپاؤ

منصورہ، لاہور

۱۶/نومبر ۲۰۱۲ء

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ، اَلَّذِيْ هَدَانَا لِهٰذَا، وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ، وَصَلَوَاتُ اللّٰهِ وَتَسْلِيْمَاتُهٗ عَلٰى رَحْمَةِ الْمُهْدَاةِ لِلْعَالَمِيْنَ سَيِّدِنَا وَإِمَامِنَا وَأُسْوَتِنَا وَحَبِيْبِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَمَنِ اتَّبَعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ. أَمَّا بَعْدُ!

یہ کتاب ایک ایسے موضوع سے بحث کرتی ہے جو میرے خیال میں انتہائی اہم ہے۔ اُمت مسلمہ میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر مختلف معاملات ونظریات کے پیمانوں میں جو عظیم خلل پیدا ہوا ہے اور ان کو ایک دوسرے پر مقدم یا مؤخر کرنے کے حوالے سے جو غلطیاں ہوتی رہتی ہیں، یہ موضوع اس مسئلے کا حل پیش کرتا ہے۔ یہ بات طے کرنا ایک مشکل مسئلہ بن گیا ہے کہ احکامِ الٰہی اور فرامینِ نبوی کی سیڑھی میں کس چیز کا کیا مقام ہے، ان میں سے کس کام کو مقدم کیا جائے اور کس کو مؤخر کیا جائے، کس کو پہلے نمبر پر رکھا جائے اور کس کا نمبر دوسرا ہو۔ خاص طور پر آج کل تو ترجیحات کا تعین کرنے میں بہت افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے۔

اس چیز کے لیے میں پہلے 'مراتبِ اعمال' کی اصطلاح استعمال کیا کرتا تھا۔ اب کئی سالوں سے میں اس کے لیے 'ترجیحات کا مسئلہ' کی اصطلاح استعمال کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ لفظ زیادہ جامع، وسیع اور موضوع پر زیادہ بہتر طریقے سے دلالت کر رہا ہے۔

اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ بعض ایسی ترجیحات سے بحث کی جائے جن کا شریعت نے زندگی کے مختلف امور کے بارے میں تعین کیا ہے اور ان کی پشت پر قوی دلائل موجود ہیں۔

ممکن ہے کہ اسلامی فکر کی درستی، طریق کار کے تعین، اور اس مسئلے کے حل کے لیے بنیاد فراہم کرنے میں یہ گزارشات کوئی کردار ادا کر سکیں۔ جو لوگ اسلامی دعوت کے میدان میں کام کرتے ہیں ممکن ہے ان کے لیے اس میں کوئی رہنمائی کا سامان فراہم ہو اور ان کے دلوں میں یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہو کہ کس چیز کو شریعت نے مقدم رکھا ہے اور کسے مؤخر کیا ہے، کس چیز کے بارے میں اس نے سختی اختیار کی ہے اور کس کے بارے میں نرمی سے کام لیا ہے، کون سا معاملہ ہے جسے شریعت نے اہم قرار دیا ہے اور کون سا ایسا ہے جسے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

امید ہے کہ اس سے ایک طرف افراط کا راستہ اختیار کرنے والوں کے افراط اور دوسری طرف تفریط کرنے والوں کی تفریط میں کمی واقع ہوگی اور دین کے لیے برسرِ پیکار افراد کے درمیان نقطہ نظر اور طریق کار میں پیدا ہونے والے اختلافات بھی کم ہوں گے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کتاب ایک مکمل اور جامع تحقیق ہے بلکہ یہ ایک آغاز اور نئے راستے کے لیے نشانات کا تعین ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی صاحب علم کو یہ توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس بحث کو زیادہ گہرائی میں جا کر اچھے انداز سے پیش کر سکے، کہ ہر شخص کا اپنا اپنا حصہ ہے۔

میں ان کلمات کو حضرت شعیب علیہ السلام کی اس دعا پر ختم کرتا ہوں جسے قرآن نے ہمارے لیے محفوظ کیا ہے۔ فرمایا:

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (ھود ۱۱:۸۸)

میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے۔ اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے۔ اسی پر میں نے بھروسا کیا اور ہر معاملے میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

الفقیرُ إلیٰ عفوِ ربّہ

یوسف القرضاوی

دوحہ: ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ موافق ستمبر ۱۹۹۴ء

۱

موضوع کی اہمیت و ضرورت

تمہید

آج کل ہمارے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ 'ترجیحات' کا ہے۔ میں نے اپنی کئی کتابوں میں اس کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے پہلے میں اپنی کتابوں میں — خاص طور پر **الصَّحوۃُ الإسلامیۃُ بینَ الجُحُودِ والتَّطرُّفِ** میں — اسے 'مراتبِ اعمال کا مسئلہ' کہا کرتا تھا۔

اس سے میری مراد یہ تھی کہ احکامِ شریعت، قومی اقدار اور اعمال میں سے ہر چیز کو پورے اعتدال کے ساتھ اپنے مقام پر رکھا جائے۔ ان میں سے جو پہلے ہو اسے پہلے درجے پر رکھا جائے اور جو بعد میں ہو اسے بعد میں رکھا جائے۔ اس ترتیب کا معیار اور اس کی بنیاد شریعت ہو، جن میں سے بعض کا ادراک نورِ وحی سے ہوتا ہے اور بعض کا نورِ عقل سے: **نُورٌ عَلٰی نُوْرٍ** (النور ۲۴:۳۵)

غیر اہم کو اہم پر مقدم نہ کیا جائے اور اہم کو اہم تر پر۔ اسی طرح مرجوح کو راجح سے پہلے نہ رکھا جائے اور مفضول کو فاضل یا افضل پر ترجیح نہ دی جائے۔

پوری باریک بینی کے ساتھ مقدم اسی چیز کو کیا جائے جو تقدیم کی مستحق ہو اور مؤخر بھی وہی ہو جو تاخیر کے قابل ہو۔ چھوٹی چیز کو بڑھا کر پیش نہ کیا جائے اور بڑی چیز کو چھوٹا کر کے نہ دکھایا جائے۔ بلکہ [قرآنی اصطلاح کے مطابق] قسطاسِ مستقیم کے ساتھ ہر چیز کو اپنے صحیح مقام پر رکھا جائے۔ اس میں کسی طرح کی کمی بیشی بالکل نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ٥ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِيْزَانِ ٥ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ٥(الرحمن ۵۵:۷-۹)

اُس نے آسمان کو بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو، انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔

اس کی بنیاد یہ ہے کہ اقدار، اعمال اور ان احکام شریعت کی نظر میں بہت مختلف اور متفاوت ہوتے ہیں۔ ان ساری چیزوں کا ایک رتبہ نہیں ہوتا؛ ان میں سے کوئی چھوٹی ہوتی ہے کوئی بڑی، کوئی اصل ہوتی ہے کوئی فرع، کوئی رکن ہوتی ہے اور کوئی تکملہ؛ اسی طرح ان میں بعض چیزیں وہ ہوتی ہیں جن کا مقام متن میں ہوتا ہے اور بعض ایسی جو حاشیے میں رکھنے کے قابل ہوتی ہیں؛ ان میں سے کوئی اعلیٰ ہوتی ہے اور کوئی ادنیٰ، کوئی فاضل اور کوئی مفضول۔

یہ بات بھی نصوص سے واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ٥(التوبۃ ۹:۱۹-۲۰)

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھیرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر، اور روزِ آخر پر، اور جس نے جاں فشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ اللہ کے نزدیک تو انھی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا، وہی کامیاب ہیں۔

اسی طرح رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں:

اَلْاِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً، اَعْلَاهَا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ[1] ایمان کے ۷۰ کے لگ بھگ شعبے ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ شعبہ لا الٰہ الا اللہ ہے اور ادنیٰ یہ کہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹایا جائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس بات کے بہت زیادہ شوقین رہتے تھے کہ وہ اعمال میں اعلیٰ اور ادنیٰ کو پہچانیں، تاکہ وہ اس سے تقرب الی اللہ حاصل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے کئی مواقع پر یہ بات روایت کی گئی ہے کہ وہ اللہ کے ہاں افضل الاعمال اور احب الاعمال کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام کے سوال اور نبی ﷺ کی طرف سے ان کے جواب سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر احادیث میں اس چیز کا بہت ذکر آتا ہے کہ اللہ کے ہاں افضل الاعمال یہ ہے اور اس کے ہاں احب الاعمال یہ ہے۔[2]

یہاں ہم صرف ایک ہی حدیث پر اکتفا کریں گے:

حضرت عمرو بن عبسۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: یارسول اللہ! اسلام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

اَنْ يُّسْلِمَ لِلّٰهِ قَلْبُكَ، وَاَنْ يَّسْلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِكَ وَيَدِكَ يه کہ تیرا دل اللہ کے آگے جھک جائے اور تیرے ہاتھ اور تیری زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔ اس نے کہا:

۱- یہ حدیث ایک بڑی جماعت نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ بخاری میں اس کے الفاظ ہیں: بِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ، مسلم میں: بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ اور ایک روایت میں بِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ ہے، ترمذی اور نسائی میں بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ. ان سب نے اس حدیث کو کتاب الإیمان میں ذکر کیا ہے، البتہ ابوداؤد نے کتاب السنة میں اور ابن ماجہ نے مقدمة میں۔

۲- جیسے: اَفْضَلُ الصَّدَقَةِ اَنْ تَصَدَّقَ وَاَنْتَ صَحِيْحٌ شَحِيْحٌ، تَخْشَى الْفَقْرَ وَتَاْمَلُ الْغِنٰى. بہترین صدقہ یہ ہے کہ تم ایسی حالت میں صدقہ دو جب تم صحت مند اور مال کے حریص ہو، تجھے غریبی کا خوف بھی ہو اور مال داری کی امید بھی۔
اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ اِمَامٍ جَائِرٍ. بہترین جہاد یہ ہے کہ جابر امام یعنی حکمران کے سامنے کلمہ حق کہا جائے۔
اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ اَدْوَمُهَا وَاِنْ قَلَّ. اللہ کے ہاں محبوب ترین عمل وہ ہوتا ہے جسے ہمیشہ کیا جائے، خواہ وہ کم ہی ہو۔
خَيْرُ دِيْنِكُمْ اَيْسَرُهٗ. تمھاری بہترین دین داری وہ ہے جس میں آسانی ہو۔ وغیرہ

کون سا اسلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: اَلْإِیْمَانُ ایمان۔ اس نے پوچھا: ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: أَنْ تُؤْمِنَ بِاللهِ، وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ یہ کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور بعث بعد الموت پر یقین کرلو۔ اس نے پوچھا: کون سا ایمان افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: اَلْهِجْرَةُ ہجرت۔ اس نے پوچھا: ہجرت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: أَنْ تَهْجُرَ السُّوْءَ یہ کہ تو برائی کو چھوڑ دو۔ اس نے کہا: کون سی ہجرت افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: اَلْجِهَادُ جہاد۔ اس نے پوچھا: جہاد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: أَنْ تُقَاتِلَ الْكُفَّارَ إِذَا لَقِيْتَهُمْ یہ کہ جب کفار کے ساتھ مڈبھیڑ ہو تو اس کے خلاف لڑو۔

اس نے کہا: کون سا جہاد افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: مَنْ عُقِرَ جَوَادُهُ وَأُهْرِيْقَ دَمُهُ [۳] اس شخص کا جہاد جس کے گھوڑے کی ٹانگیں کاٹی جائیں اور اسے شہید کردیا جائے۔

قرآن وسنت میں اس حوالے سے کسی سوال کے جواب یا کسی حقیقت کے اظہار اور بیان کے سلسلے میں جو تعلیمات وارد ہوئی ہیں، جو شخص ان کی تحقیق کرے گا تو وہ دیکھے گا کہ ہمارے سامنے کچھ معیارات رکھے گئے ہیں جن کے ذریعے ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں افضل، اولیٰ اور احب اقدار واعمال کیا ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ ان کے درمیان بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ بعض احادیث میں ان کے درمیان جو نسبت ہوتی ہے وہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ جیسے: صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ تَفْضُلُ صَلَاةَ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَعِشْرِيْنَ دَرَجَةً [۴] نماز باجماعت انفرادی نماز سے ۲۷ درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔

سَبَقَ دِرْهَمٌ أَلْفَ دِرْهَمٍ [۵] ایک درہم ہزار درہموں پر سبقت لے گیا۔

۳- منذری اپنی کتاب الترغیب والترهیب میں کہتے ہیں کہ اس حدیث کو امام احمد نے صحیح سندوں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس کے راوی ایسے ہیں جن پر صحیح میں اور طبرانی وغیرہ میں اعتماد کیا گیا ہے۔ اور ہیثمی ۳/ ۲۰۷ میں کہتے ہیں کہ اسے احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ایسے ہیں جیسے صحیح کے راوی ہوتے ہیں۔

۴- متفق علیہ، بروایت ابن عمرؓ، بحوالہ: اللؤلؤ والمرجان، ص ۳۸۱

۵- یہ اس حدیث کا تتمہ ہے کہ: رَجُلٌ لَهُ دِرْهَمَانِ أَخَذَ أَحَدَهُمَا فَتَصَدَّقَ بِهِ. وَرَجُلٌ لَهُ مَالٌ كَثِيْرٌ، فَأَخَذَ مِنْ عَرْضِهِ

رِبَاطُ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ دَهْرٍ وَقِيَامِهِ [۶] ایک دن رات اللہ راہ میں پہرہ دینا اس سے بہتر ہے کہ آدمی ایک عرصے تک دن کو روزہ رکھے اور رات کو نماز پڑھتا رہے۔

إِنَّ مَقَامَ أَحَدِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ أَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِهِ فِيْ بَيْتِهِ سَبْعِيْنَ عَامًا [۷] اللہ کی راہ میں ایک لمحے کے لیے کھڑا ہونا گھر میں ستر سال تک نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔

دوسری طرف برے اعمال کے لیے بھی کچھ معیار مقرر کیے گئے ہیں اور اللہ کے ہاں ان کے تفاوت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ صغائر ہیں کچھ کبائر، بعض مشتبہات ہیں اور بعض مکروہات۔

بعض اوقات ان کی آپس میں نسبتیں بھی بیان کی جاتی ہیں۔ جیسے: دِرْهَمُ رِبًا يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ - وَهُوَ يَعْلَمُ - أَشَدُّ عِنْدَ اللهِ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلَاثِيْنَ زَنْيَةٍ [۸] اگر ایک آدمی جان بوجھ کر ایک درہم سود کھائے تو یہ اس سے زیادہ شدید ہے کہ ایک شخص ۳۶ بار زنا کا مرتکب ہوجائے۔

نیز بعض چیزوں سے محتاط رہنے کی تلقین کی گئی ہے جسے شریعت نے دوسرے اعمال کے مقابلے میں زیادہ برا اور بدتر قرار دیا ہے۔ جیسے: شَرُّ مَا فِي الرَّجُلِ شُحٌّ هَالِعٌ وَجُبْنٌ

بقیہ ۵: مِئَةَ أَلْفٍ، فَتَصَدَّقَ بِهَا. ایک آدمی کے پاس دو درہم تھے۔ اس نے ان میں ایک لے کر صدقہ کردیا [یعنی اس نے اپنے آدھے مال کا صدقہ کیا، حالانکہ وہ خود اس کے لیے محتاج تھا] دوسرا آدمی تھا جس کے پاس بہت سارا مال تھا۔ اس نے اپنے مال کے ایک کونے سے ایک لاکھ روپے لیے اور ان کا صدقہ کیا۔ یہ حدیث نسائی ۵/۹۵، ابن خزیمہ ۲۴۴۳، ابن حبان ۳۳۴۷ اور حاکم نے ابوہریرہؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔ اور اسے مسلم کی شرطوں کے مطابق صحیح قرار دیا ہے۔ امام ذہبیؒ نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے ۱/۴۱۶۔

۶- اس حدیث کو امام احمد، امام مسلم اور ترمذی نے سلمانؓ سے اور ایک روایت میں امام احمد نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر، ۳۴۸۰، ۳۴۸۱، ۳۴۸۳۔

۷- اسے امام ترمذی نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے ۱۳۵۰ اور اسے حسن قرار دیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح علی شرط مسلم قرار دیا ہے اور ذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے ۲/۶۸۔ اس میں سِتِّيْنَ عَامًا کا لفظ آیا ہے۔ امام احمد نے اسے ابوامامہؓ سے روایت کیا ہے۔

۸- یہ حدیث امام احمد اور طبرانی نے عبداللہ بن حنظلہ سے روایت کی ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۳۳۷۵۔

خالعٌ۔[9] آدمی کی بدترین صفت بے صبری میں مبتلا کرنے والا حرص اور بے انتہا بزدلی ہے۔

شَرُّ النَّاسِ: يَسْأَلُ بِاللهِ، ثُمَّ لَا يُعْطِي۔[10] بدترین آدمی وہ ہے جو اللہ کے نام پر مانگتا ہے [مگر جب اس سے مانگا جائے تو] پھر نہیں دیتا۔

شِرَارُ أُمَّتِي: الثَّرْثَارُوْنَ الْمُتَشَدِّقُوْنَ الْمُتَفَيْهِقُوْنَ، وَخِيَارُ أُمَّتِي: أَحَاسِنُهُمْ أَخْلَاقًا۔[11] میری اُمت کے بدترین لوگ وہ ہیں جو منہ ٹیڑھا کر کے فضول بولتے رہتے ہیں اور اکڑ کر چلتے ہیں۔ اور بہترین لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں۔

أَسْرَقُ النَّاسِ: الَّذِي يَسْرِقُ صَلَاتَهُ، لَا يُتِمُّ رُكُوْعَهَا وَلَا سُجُوْدَهَا، وَأَبْخَلُ النَّاسِ: مَنْ بَخِلَ بِالسَّلَامِ۔[12] سب سے بڑا چور وہ ہے جو اپنی نماز سے چوری کرتا ہے، اس طرح کہ وہ اس کا رکوع اور سجدہ ٹھیک طریقے سے ادا نہیں کرتا۔ اور سب سے بڑا بخیل وہ ہے جو سلام میں بھی بخل کرتا ہے۔

اسی طرح قرآن پاک نے یہ بات بھی بیان کی ہے کہ سارے لوگ مرتبے کے لحاظ سے آپس میں برابر نہیں ہیں، اگرچہ انسانیت کے لحاظ سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ علم و عمل کے لحاظ سے لوگوں کے درمیان نمایاں فرق ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقٰكُمْ ط (الحجرات ۴۹:۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں

۹- اسے امام بخاری نے تاریخ میں اور ابوداؤد نے سنن میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۳۷۰۹۔

۱۰- اس حدیث کو امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی اور ابن حبان نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ دیکھیے: ایضاً ۳۷۰۸۔

۱۱- اس حدیث کو امام بخاری نے الأدب المفرد میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ ایضاً ۲۷۰۴۔

۱۲- اسے طبرانی نے عبداللہ بن مغفل سے روایت کیا ہے۔ ایضاً ۹۶۶۔

بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ط (الزمر ۳۹:۹)

ان سے پوچھو: کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے کبھی یکساں ہوسکتے ہیں؟

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ط فَضَّلَ اللهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ط وَكُلًّا وَّعَدَ اللهُ الْحُسْنٰى ط وَفَضَّلَ اللهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًا o دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ط وَكَانَ اللهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا o (النساء ۴:۹۵-۹۶)

مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے۔ مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ o وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ o وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ o وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَآءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ط (فاطر ۳۵:۱۹-۲۲)

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے، نہ تاریکی اور روشنی یکساں ہیں، نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے اور نہ زندے اور مردے مساوی ہیں۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ج فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ج وَمِنْهُمْ

مُقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۭ (فاطر ۳۵:۳۲)

پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنایا ان لوگوں کو جنھیں ہم نے [اس وراثت کے لیے] اپنے بندوں میں سے چن لیا۔ اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، اور کوئی بیچ کی راس ہے، اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان بھی اسی طرح تفاوت اور تفاضل پایا جاتا ہے جس طرح کہ اعمال آپس میں متفاوت اور متفاضل ہیں۔ مگر لوگوں کے درمیان جو تفاوت اور تفاضل ہے وہ صرف علم، عمل، تقویٰ اور جہاد کی بنیاد پر ہے۔

❖❖❖

عصرِ حاضر میں اُمت کو ترجیحات کی ضرورت

ترجیحات کے توازن میں خرابی

اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں اور مادی، معنوی، فکری، معاشی، معاشرتی اور سیاسی ہر پہلو سے اس پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا ہمارے ہاں ترجیحات کا توازن مکمل طور پر تہہ وبالا ہو چکا ہے۔

تقریباً اسلامی ممالک میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عجیب طرح کی افراط اور تفریط ہے۔

فن وتفریح کو تعلیم وتعلم پر ترجیح دی جاتی ہے۔

نوجوانوں کی سرگرمیوں میں جسمانی ورزشوں کو عقل وفکر اور روحانی تربیت پر مقدم کیا جاتا ہے، گویا کہ نوجوانوں کی تربیت کا ایک ہی مطلب ہے کہ ان کی جسمانی تربیت کی جائے۔ ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ کیا انسان صرف جسم کا نام ہے یا انسان کی انسانیت اس کے جسم اور عقل کے مجموعے کو کہتے ہیں۔

پرانے زمانے کی بات ہے۔ ہم ابوالفتح البستی کی یہ مشہور نظم یاد کیا کرتے تھے:

يَا خَادِمَ الْجِسْمِ كَمْ تَسْعٰى لِخِدْمَتِهِ   أَتَطْلُبُ الرِّبْحَ مِمَّا فِيهِ خُسْرَانُ؟
أَقْبِلْ عَلَى النَّفْسِ وَاسْتَكْمِلْ فَضَائِلَهَا   فَأَنْتَ بِالنَّفْسِ لَا بِالْجِسْمِ إِنْسَانُ!

اے جسم کے خادم! تو کب تک اس کی خدمت کرتا رہے گا؟ کیا تو اُس چیز سے کمائی کی امید لگائے بیٹھا ہے جس میں نقصان ہی نقصان ہے؟

نفس کی طرف توجہ دو اور اس کے فضائل کی تکمیل کردو۔ تُو اگر انسان ہے تو جسم کی وجہ سے نہیں بلکہ نفس کی وجہ سے ہے۔

اور اس سے پہلے ہم نے زہیر بن ابی سلمٰی کے معلقہ سے یہ شعر یاد کیا تھا:

لِسَانُ الْفَتٰی نِصْفٌ وَّنِصْفٌ فُؤَادُهٗ   فَلَمْ يَبْقَ إِلَّا صُوْرَةُ اللَّحْمِ وَالدَّمِ!

نوجوان کی زبان اس کا آدھا حصہ ہے، باقی آدھا اس کا دل و دماغ ہے۔[اگر دل و دماغ کو نکال دیں] تو انسان گوشت پوست کے ایک بت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

لیکن آج کل ہم دیکھتے ہیں جیسے انسان ہر چیز سے پہلے جسم اور اعصاب کا نام ہے۔

پچھلے سال [۱۹۹۳ء کے] موسم گرما میں مصر کے لوگوں کا اس کے علاوہ کوئی موضوعِ بحث نہیں تھا کہ ایک کھلاڑی کا لباس فروخت کے لیے پیش کیا گیا تھا اور اس کی قیمت تقریباً ساڑھے تین لاکھ جُنَیہُ تک پہنچ گئی تھی۔

کاش، کہ یہ لوگ تفریح کی ان قسموں کا اہتمام کرتے ہوتے جن سے عوام اپنی روزمرہ زندگی میں مستفید ہوسکتے ہیں۔ مگر ان کی ساری توجہ کھیل کے مقابلوں کی طرف ہوتی ہے، خاص طور پر فٹ بال [اور کرکٹ]، جس میں چند کھلاڑی کھیل رہے ہوتے ہیں اور باقی محض دل بہلانے والے تماشائی ہوتے ہیں۔

معاشرے میں شہرت اور ستاروں کا مقام نام وَر علما، ادیبوں اور اہلِ دین و دانش کو نہیں بلکہ اداکاروں، گلوکاروں اور کھلاڑیوں کو حاصل ہے۔

اخبارات و رسائل، ٹی وی اور ریڈیو کے مذاکروں کا موضوع بحث یہی لوگ ہوتے ہیں۔

میڈیا پر ان کے کھیلوں اور 'کارناموں' کی خبریں نشر ہوتی رہتی ہیں، خواہ وہ کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہوں۔ رہے دوسرے لوگ [جو کوئی فائدے کا کام کرتے ہیں] ان کا کسی کو سایہ بھی نہیں لگنے دیا جاتا بلکہ وہ طاقِ نسیان میں پڑے رہتے ہیں۔

اگر ایک فن کار فوت ہوجائے تو پوری دنیا میں تہلکہ مچ جاتا ہے اور اخبارات اس کے بارے میں تعریف وتوصیف کے دریا بہادیتے ہیں مگر کوئی عالم، ادیب، یا کوئی بڑا ماہر فن وفات پاتا ہے تو کسی کے ناک پر جوں تک نہیں رینگتی۔

معاشی پہلو سے دیکھا جائے تو کھیل کود اور فن کاری کو فروغ دینے کے لیے، اور حکمرانوں کی ذاتی حفاظت کے لیے تو بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جاتی ہیں، جسے 'ملکی امن وامان' کا نام دیا جاتا ہے، اور کسی میں یہ پوچھنے کی جرأت نہیں ہوتی کہ یہ سب کچھ کیوں ہورہا ہے۔

دوسری طرف تعلیمی اور فلاحی ادارے، ہسپتال اور شفاخانے اور دعوتِ دین کی تحریکیں فنڈز کا رونا روتی رہتی ہیں۔ وہ جب اپنی ترقی کے لیے اور عصری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کوئی مطالبہ کرتی ہیں تو ان کو معذرت کی جاتی ہے اور ہزار بہانے بنا کر ان سے جان چھڑائی جاتی ہے۔ آدمی حیران ہوجاتا ہے کہ اُدھر سخاوت کے دریا اور اِدھر ایک گھونٹ کو بھی ترسنا!! جیسے ابن مقفع نے بہت پہلے کہا تھا: میں نے کوئی اسراف نہیں دیکھا مگر ضرور اس میں کسی کا حق مارا جاتا ہے۔

ترجیحات کا مسئلہ اور دین دار طبقہ

ترجیحات کے مسئلے میں یہ خرابی صرف عوام میں یا بے دین طبقے میں نہیں آئی۔ بلکہ خود دین دار طبقہ بھی طرح طرح کی بے اعتدالیوں کا شکار ہے۔ کیوں کہ ان میں بھی معاملات کے درست فہم اور دین کے صحیح علم کی کمی پائی جاتی ہے۔

صحیح علم تو وہی ہوتا ہے جو آدمی کے سامنے راجح اور مرجوح کو واضح کردے، فاضل اور مفضول کے درمیان فرق کو نمایاں کردے اور اس کے ذریعے معلوم ہوسکے کہ صحیح کیا ہے اور فاسد کیا، مقبول کیا ہے اور مردود کیا۔ وہ اسے بتاسکے کہ کون سی چیز سنت ہے اور کون سی بدعت۔ اسی طرح وہ شریعت کے مطابق ہر چیز کی اصل قدر وقیمت کی پہچان کرائے۔

اکثر اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ اس طرح کے لوگ جو علم کے نور سے اور معاملات کی سمجھ سے محروم ہوتے ہیں وہ مختلف امور کے درمیان قائم حدود کو مٹا دیتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتے۔ وہ ان کے بارے میں وہ حکم لگاتے ہیں جو شریعت میں اس کے حقیقی حکم سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ یا تو افراط کرتے ہیں یا تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس مقام پر دین بے چارہ چکی کے دو پاٹوں کی طرح متشدد دین اور منحرفین کے درمیان پس جاتا ہے۔

ہم نے کئی بار دیکھا ہے کہ ایسے لوگ ــــــ اگر چہ پوری طرح مخلص ہوتے ہیں مگر وہ ــــــ راجح کو چھوڑ کر مرجوح پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں، اور مفضول میں منہمک ہو کر فاضل سے غفلت اختیار کر جاتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ایک ہی عمل ایک وقت میں فاضل ہوتا ہے اور دوسرے وقت میں مفضول ہوتا ہے، اور ایک حالت میں وہ راجح ہوتا ہے اور دوسری حالت میں وہ مرجوح ہوتا ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنی کم علمی اور ناسمجھی کی وجہ سے ان دو حالتوں اور الگ الگ اوقات کے درمیان فرق نہیں کرتے۔

میں نے بہت سے نیک طینت مسلمانوں کو دیکھا ہے کہ وہ کسی ایسے شہر میں مسجد کے لیے عطیہ دیتے ہیں جہاں پہلے سے بے شمار مساجد ہوتی ہیں اور اس پر پانچ دس لاکھ ڈالر یا اس سے بھی زیادہ رقم خرچ کر ڈالتے ہیں۔ مگر جب ان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ اس کی آدھی یا چوتھائی کے برابر رقم دعوت اسلام کی اشاعت میں، کفر والحاد کا مقابلہ کرنے میں یا اسلامی نظام کے نفاذ کی خاطر کی جانے والی کوششوں میں یا اس طرح کی دوسرے عظیم اہداف میں خرچ کریں جن کے لیے بعض اوقات افراد تو دستیاب ہوتے ہیں مگر مال کی کمی ہوتی ہے، تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ آپ کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوگی اور وہ آپ کو کوئی مثبت جواب نہیں دیں گے۔ وہ اینٹوں اور پتھروں کی عمارتیں تعمیر کرتے ہیں مگر انسانوں کی تعمیر ان کی نظر میں فضول ہے۔

ہر سال حج کے دنوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ صاحبِ ثروت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اسی بات پر بضد ہوتی ہے کہ وہ نفل حج کی سعادت سے محروم نہ ہوں۔ اور بہت سے لوگ ہیں کہ رمضان کے مہینے میں عمرہ کرنا بھی اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں۔ اس میں وہ پوری سخاوت کے ساتھ اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اپنے ہی خرچ پر دوست احباب کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے نہ حج کا مکلف کیا ہوتا ہے اور نہ عمرے کا۔

ان سے جب آپ کہتے ہیں کہ وہ یہ سالانہ اخراجات فلسطین میں یہودیوں کے مقابلے کے لیے یا بوسنیا اور ہرزگ میں سربوں کے مقابلے کے لیے یا انڈونیشیا، بنگلہ دیش یا دوسرے ایشیائی اور افریقی ممالک میں عیسائی مبلغین کا مقابلہ کرنے کے لیے دے دیں، یا کوئی دعوتی اور تحریکی مرکز قائم کرنے کے لیے یا ایسے داعیوں کی تیاری کے لیے خرچ کریں جو اس میں تخصص حاصل کر کے اپنے آپ کو اسی کام کے لیے وقف کریں، یا اسے تصنیف وتالیف اور ترجمے یا دینی کتابوں کی اشاعت کا کوئی ادارہ قائم کرنے کے لیے عطیہ کر دیں، تو قرآن کے الفاظ میں:

لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ٥(المنافقون ۶۳:۵)

تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رکتے ہیں۔

یہ ہے لوگوں کی حالت، اور دوسری طرف قرآن سے یہ بات وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ جہاد سے متعلقہ اعمال ان اعمال سے افضل ہیں جو حج سے متعلق ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَاللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ٥ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ٥(التوبة۹:۱۹-۲۱)

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھیرالیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخر پر اور جس نے جاں فشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ اللہ کے نزدیک تو انھی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا۔ وہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب انھیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لیے پائیدار عیش کے سامان ہیں۔

اور لوگوں کا یہ طرزِ عمل اس صورت میں ہے کہ ان کا حج اور عمرہ نفلی ہوتا ہے، جبکہ کفر و الحاد، لادینیت، اباحیت اور انھیں قوت فراہم کرنے والے دوسرے عوامل کے خلاف جہاد فریضہ وقت اور لازمی امر ہے۔

تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے ایامِ حج سے قبل ہمارے دوست اور معروف اسلامی سکالر استاذ فہمی ہویدی نے اپنے ہفتہ وار مقالے میں وضاحت کے ساتھ مسلمانوں سے یہ بات کہی تھی کہ بوسنیا کی آزادی فریضہ حج پر مقدم ہے۔

جن لوگوں نے یہ مقالہ پڑھا تھا ان میں سے بہت سے لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ بات شرعی اور فقہی نقطہ نظر سے کس حد تک درست ہے۔ میں نے اس وقت کہا تھا کہ ہویدی صاحب کی بات کا ایک درست پہلو موجود ہے جو فقہی لحاظ قابلِ اعتبار بھی ہے۔ شرعی طور پر یہ بات متعین ہے کہ جو فرائض فوری طور پر مطلوب ہوں ان کو ایسے فرائض پر مقدم کیا جائے گا جن میں تاخیر کی گنجایش ہوتی ہے۔ اور فریضہ حج میں تاخیر کی گنجایش موجود ہے۔ بعض ائمہ کے نزدیک یہ واجب عند التراخی ہے، یعنی اس میں ڈھیل ہو سکتی ہے۔ رہا بوسنیا کے مسلمانوں کو موت، بھوک و افلاس، امراض، سردی اور اجتماعی ہلاکت سے ـــــ جس کا انھیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے ـــــ بچانا، تو وہ ایک فوری فریضہ ہے، جسے بروقت انجام دینے کی ضرورت ہے اور اس میں نہ تاخیر کی گنجایش ہے اور

نہ تراخی یعنی ڈھیل کی۔ کیوں کہ یہ فریضہ وقت ہے اور ساری اُمت پر آج کا اہم ترین واجب ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ فریضہ حج کو قائم کرنا اور موسمِ حج کو معطل ہونے سے بچانا بھی ایک فریضہ ہے، اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ لیکن یہ کام تو حرمین کے باشندوں کے ذریعے بھی انجام پاتا ہے اور اردگرد کے وہ لوگ بھی اس میں حصّہ لے سکتے ہیں جن کے سفری اخراجات زیادہ نہیں ہیں۔

اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ استاذ ہویدی کا جو مقصد ہے وہ اس کے بغیر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ہر سال حج میں زیادہ ہجوم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جنھوں نے پہلے فریضہ حج ادا کیا ہوتا ہے۔ پہلی مرتبہ حج پر آنے والوں کی تعداد مجموعی حاجیوں کی نسبت زیادہ سے زیادہ ١٥ فی صد ہوگی۔ اگر حاجیوں کی مجموعی تعداد بیس لاکھ ہو تو ان میں پہلی مرتبہ حج کرنے والے عموماً تین لاکھ سے زیادہ نہیں ہوتے۔

جو لوگ ہر سال نفل حج ادا کرتے ہیں ـــــ اور ان کی تعداد یقیناً دوسروں سے زیادہ ہی ہوتی ہے ـــــ اسی طرح وہ لوگ جو سارا سال نفل عمرے کرتے رہتے ہیں، خصوصاً رمضان کے دنوں میں، کاش! کہ وہ اپنے حج اور عمرے کی قربانی دیں اور ان کے اخراجات اللہ کی راہ میں دے دیں۔ یعنی اپنے مال کو اپنے ان مسلمان بھائیوں اور بہنوں کو نجات دلانے کے لیے خرچ کریں جو مادی اور معنوی ہلاکت سے دوچار ہیں، جنھیں بے انتہا ظلم و جبر کا سامنا ہے۔ ان کا دشمن ان کی جان و مال اور عزت کے درپے ہے، اور چاہتا ہے کہ دنیا سے ان کا نام و نشان مٹ جائے۔ رہی ترقی یافتہ دنیا، تو وہ خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے اور ٹس سے مس نہیں ہو رہی۔ کیوں کہ یہاں قوت کا حق غالب ہے نہ کہ حق کی قوت [یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس]۔

میں مصر، قطر اور دوسرے خلیجی ممالک کے بہت سے دین دار دوستوں کو جانتا ہوں جو ہر سال فریضہ حج کی ادائیگی کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو چالیس سال

سے مسلسل حج کرتے آئے ہیں۔ یہ رشتہ داروں، دوستوں اور کاروبار میں شریک بھائیوں کا ایک پورا گروہ ہے، جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ایک سال ایسا ہوا کہ میں انڈونیشیا سے ابھی ابھی واپس آیا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ وہاں عیسائی مبلغین کتنے بڑے پیمانے پر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہاں ان کے بالمقابل تعلیمی، طبی اور اجتماعی ادارے قائم کرنے کی کتنی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے ان نیک طینت بھائیوں سے کہا: کیا خیال ہے اگر اس سال آپ حضرات حج کا ارادہ ترک کردیں اور اس پر اٹھنے والے خراجات انڈونیشیا میں عیسائیت کے خلاف خرچ کریں۔ اگر ایک سو افراد ہوں اور ایک فرد کا خرچہ دس ہزار جُنَیہُ ہو تو اس کا مجموعہ دس لاکھ جُنَیہُ بنتا ہے۔ اس رقم سے ایک بہت بڑے منصوبے کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم نے اس طرح کے کسی منصوبے کا آغاز کیا اور اس کی تشہیر کی تو دوسرے لوگ بھی ہماری تقلید کریں گے اور ان کے کام میں ہمیں بھی ثواب ملے گا۔

مگر ان دوستوں نے کہا: جب بھی ذوالحجہ کا مہینہ آتا ہے تو ہم اپنے دل میں حج کا ایسا جذبہ محسوس کرتے ہیں جس کا ہم کسی طرح مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ہم اپنی روح کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ جب ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ حج پر حاضر ہوتے ہیں تو ہمیں اس میں بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے۔

یہ وہی بات ہے جو اس سے بہت پہلے بِشر حافی سے کسی نے کہی تھی۔ اگر فہم کی صحت موجود ہوتی، ایمان میں صداقت ہوتی اور مسلمانوں کے ہاں ترجیحات کے مسئلے کی اہمیت ہوتی تو یقیناً وہ اس سے زیادہ خوشی، سعادت اور روحانیت اس وقت محسوس کرتے جب وہ اپنے حج وعمرے کے اخراجات کو کسی اسلامی منصوبے کا آغاز کرنے، یتیموں کی کفالت، بھوکوں کو کھانا کھلانے، جن لوگوں کو ملک بدر کیا گیا ہے ان کو پناہ دینے، مریضوں کا علاج کرنے، ان پڑھ لوگوں کو تعلیم دینے اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے میں صرف کردیتے۔

میں نے بہت سے نوجوانوں کو دیکھا ہے جو یونی ورسٹی کے طبی، زرعی، انجینئرنگ،

یا ایجوکیشن کے شعبے میں یا دوسرے نظری یا علمی شعبوں میں پڑھتے تھے۔ وہ ان شعبوں میں کامیاب جا رہے تھے بلکہ دوسروں سے آگے تھے۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا ہوگا کہ انھوں نے اپنے اپنے شعبے سے منہ موڑا اور یہ کہتے ہوئے ان کو خیر باد کہا کہ اس طرح وہ دعوت وارشاد کے لیے فارغ ہوجائیں گے۔ لیکن اگر وہ اپنے تخصص کے شعبے میں کام کرتے ـــ جو ایک فرض کفایہ تھا، اور اگر پوری اُمت اس سے غفلت برتتی ہے تو گناہ گار ہوجاتی ہے ـــ تو وہ اچھی نیت سے اپنے کام کو پوری مہارت کے ساتھ انجام دیتے ہوئے اور اس میں حدود اللہ کی پابندی کرتے ہوئے اسے عبادت اور جہاد میں تبدیل کرسکتے تھے۔

اگر ہر مسلمان اپنے پیشے کو چھوڑ دے تو پھر اُمت کی ضروریات کون پوری کرے گا؟ رسول اللہ ﷺ کو جب دنیا میں مبعوث کیا گیا تو صحابہ کرام مختلف پیشوں سے وابستہ تھے۔ آپ نے ان میں سے کسی سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے پیشے کو چھوڑ کر اپنے آپ کو دعوت کے لیے فارغ کرے۔ ہجرت سے پہلے بھی اور ہجرت کے بعد بھی یہی طریقہ رہا کہ سارے لوگ اپنے اپنے پیشے سے وابستہ رہے۔ مگر جب جہاد کا موقع آتا اور انھیں جہاد کے لیے بلایا جاتا تو سارے لوگ، خواہ ہلکے ہوتے یا بوجھل، میدانِ جہاد کی طرف چل پڑتے اور اپنی جان ومال اللہ کی راہ میں قربان کردیتے تھے۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنے دور میں لوگوں کے لیے یہ بات ناپسند کی کہ ان کے اکثر طالب علم فقہ اور اس طرح کے دوسرے علوم کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور دوسری طرف مسلمان ممالک میں کسی یہودی یا عیسائی طبیب کے علاوہ کوئی معالج نہ ہوتا تھا۔ وہ انھی سے اپنے مردوں اور عورتوں کا علاج کراتے تھے اور اپنی جانیں اور عزتیں انھی کے حوالے کردیتے تھے۔ وہ ان سے ایسے امور بھی معلوم کرتے تھے جن کا تعلق شرعی احکام کے ساتھ ہوتا تھا، جیسے روزہ دار کا روزہ افطار کرنا اور زخمی ہونے کی صورت میں تیمم کرنا وغیرہ۔

میں نے کچھ اور لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ روزانہ ایسے معرکے گرم کرتے ہیں جن کا مقصد

جزئی یا اختلافی مسائل پر مناظرے کرنا ہوتا ہے۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہمارا بڑا معرکہ ایسے دشمن کے ساتھ ہے جسے اسلام سے چڑ ہے، وہ اس سے نفرت کرتا ہے، وہ اس کو کمزور کرنے کی آس لگائے بیٹھا ہے اور اس سے خوف زدہ بھی ہے۔ وہ اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

یہاں تک کہ امریکہ، کینیڈا اور دوسرے یورپی ممالک میں رہائش پذیر مسلمان سوسائٹی میں بھی ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کے ہاں سب سے اہم مسئلہ جو پوچھنے کے لیے رہ گیا ہے تو وہ یہ ہے کہ گھڑی دائیں ہاتھ میں پہنی جائے یا بائیں ہاتھ میں، کوٹ پتلون کے مقابلے میں سفید کرتا قمیص پہننا فرض ہے یا سنت، اور عورتوں کا مسجد میں جانا حلال ہے یا حرام۔ اسی طرح کھانے کے لیے میز کرسی استعمال کرنا اور چھری کانٹے سے کھانا کیا تشبّہ بالکفار میں شامل ہے یا نہیں ہے۔

یہ اور اس طرح کے بے شمار مسائل ہیں جو ہمارے بہت سارے اوقات کو کھا جاتے ہیں، لوگوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، دلوں کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں اور اس سے بہت سی محنتیں اور صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کیوں کہ یہ ایسی کوشش ہے جس کا کوئی ہدف نہیں اور یہ ایسا جہاد ہے جو دشمن کے خلاف نہیں بلکہ اپنوں کے خلاف کیا جا رہا ہے۔

میں نے بہت سے نوجوانوں کو دیکھا ہے جو اپنے ماں باپ کے ساتھ اور اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں اور ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ گناہ گار اور دین سے منحرف ہیں۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے خواہ وہ مشرک ہوں اور دین کے معاملے میں جھگڑا کرتے ہوں، اور ان کی ہر طرح سے یہ کوشش ہو کہ اپنے بچے کو اسلام سے برگشتہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ (لقمان ۳۱:۱۵)

اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مانو۔ البتہ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے رہو۔

اس طرح والدین کی طرف سے اس پُر زور دباؤ کے باوجود ـــــ جسے قرآن نے **مجاھدہ علی الشرك** کہا ہے ـــــ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ ان کے ساتھ معروف کے ساتھ پیش آیا جائے۔ کیوں کہ والدین کا حق ایسا ہے جس پر اللہ کے سوا کسی کا حق فوقیت نہیں رکھتا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ (لقمان ۳۱:۱۴)

میرا شکر کرو اور اپنے والدین کا شکر بھی بجا لاؤ، میری ہی طرف تجھے پلٹ کر آنا ہے۔

مگر شرک میں ان کی اطاعت ممنوع ہے کیوں کہ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ [خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں] رہا معروف کے ساتھ پیش آنے کا معاملہ تو اس سے کوئی چھٹکارا نہیں ہے اور اس سے جان چھڑانے کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاۗءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ (النساء ۴:۱)

اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو، اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔

انحطاط کے دور میں مسلمان جن بری عادات کے شکار ہوئے اور اب تک چلے آ رہے ہیں ان میں سے چند عادات یہ ہیں:

۱- انھوں نے ایسے فرائضِ کفایہ کو بڑی حد تک چھوڑ دیا ہے جن کا تعلق بحیثیتِ مجموعی پوری اُمت کے ساتھ تھا، مثلاً سائنسی، صنعتی اور عسکری برتری، جو اُمت کو اپنے اختیارات کا مالک بناتی ہے اور اسے ـــــ صرف دعوے اور قول کی حد تک نہیں بلکہ ـــــ حقیقی معنوں میں دنیا کی قیادت دلاتی ہے۔ یا مثلاً فقہی مسائل میں اجتہاد اور احکامِ شریعت کا استنباط، دعوتِ اسلامی

کی نشر و اشاعت، شوریٰ کے حکمِ ربانی کو بیعت اور آزادانہ اختیارات کی بنیاد پر قائم کرنا، ظالم اور دین سے منحرف بلکہ دین دشمن حکمران کے خلاف جہاد کرنا وغیرہ۔

۲- انھوں نے بعض ایسے امور کو بھی چھوڑ دیا ہے جو فرضِ عین کے درجے میں ہیں، یا اگر چھوڑا نہیں تو کم از کم یہ ہے کہ انھیں وہ مقام نہیں دیا جو ان کو دینا چاہیے تھا۔ جیسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ، جسے قرآن نے اہلِ ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے نماز اور زکوٰۃ سے بھی زیادہ اہمیت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (التوبۃ ۹:۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔

اس فریضے کو اُمت مسلمہ کے بہترین اُمت ہونے کا سب سے پہلا سبب قرار دیا گیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (آل عمران ۳:۱۱۰)

اب دُنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس فریضے کے ترک کو بنی اسرائیل کے لیے ان کے نبیوں کی زبان سے لعنت کیے جانے کا ذریعہ بتایا گیا ہے:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (المائدۃ ۵:۷۸-۷۹)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیوں کہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، انھوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ برا طرزِ عمل تھا جو انھوں نے اپنایا۔

۳- بعض ارکان کو بعض دوسرے ارکان پر زیادہ اہمیت دی ہے۔ مثلاً نماز کے مقابلے میں روزے کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان میں دن کے وقت کوئی مسلمان مرد یا عورت بہت کم کھانا کھاتے ہوئے نظر آتی ہے، خاص طور دیہاتی علاقوں میں۔ لیکن بہت سے مسلمان، خصوصاً خواتین، نماز میں غفلت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جنھوں نے عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی اللہ کے سامنے رکوع اور سجدہ کرنے کی زحمت نہیں ہوگی۔ اسی طرح بعض لوگ پائے جاتے ہیں جو نماز کا تو بہت اہتمام کرتے ہیں مگر زکوٰۃ کے معاملے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ۲۸ مقامات پر ان دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے اور جو شخص زکوٰۃ نہیں دیتا اس کی نماز نماز ہی نہیں ہے۔[۱۳]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا تھا:

وَاللّٰهِ لَأُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ [۱۴] خدا کی قسم! میں ان لوگوں کے خلاف ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق روا رکھتے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد پر اسی طرح ہوگئے تھے جس طرح کہ وہ نبوت کے جھوٹے دعوے داروں اور ان کی پیروی کرنے والے مرتدین کے خلاف متفق تھے۔ اس طرح

۱۳- اس قول کو ہیثمی نے مجمع الزوائد ۳/۶۲ میں ذکر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ اسے طبرانی نے الجامع الکبیر میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۱۴- متفق علیہ بروایت ابوہریرہؓ، بحوالہ: اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان، حدیث ۱۳۔

گویا اسلامی حکومت روئے زمین پر وہ پہلی حکومت تھی جس نے غریبوں کے حقوق کی جنگ لڑی۔

۴-بعض نوافل کا اتنا اہتمام کیا جاتا ہے جتنا فرائض اور واجبات کا نہیں کیا جاتا۔ اور یہ بات بہت سے دین دار لوگوں میں دیکھی جاسکتی ہے جو ذکر واذکار اور تسبیحات و اوراد کا بے حد اہتمام کرتے ہیں مگر ان کے ہاں بعض فرائض کے بارے میں یہ اہتمام دیکھنے میں نہیں آتا۔ خصوصاً معاشرتی فرائض جیسے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی، پڑوسی کے ساتھ احسان، کمزوروں پر رحم کرنا، یتیموں اور مسکینوں کا خیال رکھنا، منکر کو روکنا اور اجتماعی وسیاسی ظلم وجبر کے خلاف جہاد کرنا۔

۵-بعض اوقات انفرادی عبادات، جیسے نماز اور ذکر وغیرہ کی بڑی پابندی کی جاتی ہے مگر اجتماعی فرائض عبادات، جن کا فائدہ دوسروں کو بھی پہنچتا ہے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ جیسے جہاد، علم، اصلاح بین الناس، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون، صبر اور رحم کی تلقین، عدل وانصاف اور شوریٰ کے قیام کی دعوت، عمومی انسانی حقوق کی پاسداری اور خاص طور پر کمزور انسانوں کا خیال رکھنا۔

۶- بہت سے لوگ فروعی اعمال کی طرف حد سے زیادہ توجہ دیتے ہیں اور اصول کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ حالانکہ کسی بزرگ کا قول ہے کہ مَنْ ضَيَّعَ الْأُصُوْلَ حُرِمَ الْوُصُوْلَ [15] [یعنی جس نے بنیاد کو چھوڑ دیا وہ منزل پر نہیں پہنچ سکتا]۔ انھوں نے پوری عمارت کی بنیاد یعنی عقیدۂ توحید، ایمان باللہ اور اخلاص فی الدین سے غفلت برتی ہے۔

۷-اسی طرح جن مسائل کے درمیان توازن میں خلل پیدا ہوا ہے، اُن میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ مکروہات اور مشتبہ امور کے خلاف برسرِ پیکار ہیں مگر انھوں نے حلال حرام اشیاء کے بارے میں اتنی سرگرمی نہیں دکھائی، نہ ان واجبات کو قائم کرنے کا کوئی خاص اہتمام کیا ہے جنھیں لوگوں نے چھوڑ کر ضایع کر دیا ہے۔ اور اسی طرح کا معاملہ یہ بھی ہے

۱۵- یہ بات آگے مؤلف نے امام راغبؒ کے حوالے سے نقل کی ہے۔ (مترجم)

کہ بعض لوگ ان امور پر اپنی زیادہ قوتیں صرف کرتے ہیں جن کی حلت وحرمت میں اختلاف پایا جاتا ہے اور ان چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے جن کی حرمت قطعی اور یقینی ہے۔ دوسری طرف کچھ لوگ ایسے ہیں جو اسی طرح کے اختلافی مسائل کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں اور انھوں نے اسے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا دیا ہے۔ جیسے تصویر، موسیقی، چہرے کا پردہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل۔ گویا کہ ان کا بھی اس کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے کہ وہ ان مسائل کے گرد جنگ کی بھڑکائی ہوئی آگ کو ایندھن فراہم کریں اور لوگوں کو زبردستی اپنی بات ماننے پر مجبور کریں۔ حالانکہ وہ بڑے اور فیصلہ کن لڑائیوں سے غافل ہیں جن کا تعلق اُمت کے وجود، اس کے انجام، اور دنیا کے نقشے پر اس کے بقا کے ساتھ ہے۔

اسی طرح کے مسائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بعض لوگ صغائر کو ختم کرنے کے لیے ایڑھی چوٹی کا زور لگاتے ہیں مگر ہلاکت میں ڈالنے والے کبیرہ گناہوں سے غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں، خواہ وہ دینی لحاظ سے ہلاکت میں ڈالنے والے ہوں (جیسے: غیب کی خبریں بتانا، جادو کرنا، علمِ نجوم، قبروں کو سجدے کرنا، ان کی نذریں چڑھانا، مُردوں کے نام جانور ذبح کرنا، ان سے استعانت کرنا، ان سے اپنی حاجتیں مانگنا، مصیبتیں دور کروانا، اور اس طرح کے دوسرے اعمال جن کی وجہ سے عقیدۂ توحید کی شفافیت مکدر ہوتی ہے)، یا معاشرتی اور سیاسی طور پر ہلاکت سے دوچار کرنے والے ہوں (جیسے شوریٰ اور عدلِ اجتماعی کا ضایع ہونا، آزادی، انسانی حقوق، احترامِ آدمیت کا نہ ہونا، معاملات کو نااہل لوگوں کے سپرد کرنا، انتخابات میں دھاندلی کرنا، قومی دولت لوٹنا، نسلی اور طبقاتی امتیازات کو رواج دینا اور عیش وعشرت کی فراوانی)۔

یہ ایک بہت بڑی بیماری ہے جو ترجیحات اور ان کے معیارات کے بارے میں ہماری اُمت کو لاحق ہو چکی ہے۔ بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بڑے کو چھوٹا بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور چھوٹے کو بڑا کرنے کا رجحان ہے۔ رائی کو پہاڑ بنالیا جاتا ہے اور ایک اہم ترین معاملے کو بالکل نظرانداز کیا جاتا ہے۔ پہلے کو آخر پر رکھا جاتا ہے اور آخری کو پہلے لایا جاتا ہے۔ فرضوں کو

چھوڑ دیا جاتا ہے اور نوافل کی پابندی کی جاتی ہے۔ صغائر کے بارے میں فکر مندی کا اظہار ہوتا ہے اور کبائر کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اختلافی مسائل کے لیے میدانِ جنگ گرم کیا جاتا ہے اور اتفاقی احکام ضایع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ساری باتیں آج کے دور میں امتِ مسلمہ کو اس ضرورت کا احساس دلاتی ہیں، بلکہ شدت کے ساتھ اس بات کا محتاج بناتی ہے کہ وہ ترجیحات کے مسئلے کو سمجھے، تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنے طریق کار کا نئے سرے سے جائزہ لے، اس کے بارے میں گفت و شنید کرے، افہام و تفہیم کرے اور ہر ایک اپنی بات سامنے رکھے۔ اس کے نتیجے میں ذہنوں کو قناعت نصیب ہوگی، دلوں کو اطمینان ہوگا، بصیرت کو روشنی ملے گی اور اس کے بعد اُمت کے ارادے عملِ خیر اور خیر العمل کی طرف متوجہ ہوں گے۔

❖❖❖

۲

ترجیحات اور دوسری ملتی جلتی اصطلاحیں

ترجیحات اور موازنات

ترجیحات کا یہ مسئلہ دوسری قسم کے مسائل سے بھی تعلق رکھتا ہے جن میں بعض کی وضاحت ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔

• ان میں سے ایک مسئلہ موازنات کا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں اپنی کتاب **أولويات الحركة الإسلامية** میں گفت گو کی ہے۔ میں نے اس میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے قیمتی اقوال ذکر کیے ہیں۔

موازنات کے مسئلے کے اہم ترین اہداف درج ذیل ہوتے ہیں:

۱- جائز مَصالح، مَنافع اور بھلائیوں کا آپس میں موازنہ۔

۲- ممنوع مَفاسد، مَضرّتوں اور برائیوں کا آپس میں موازنہ۔

۳- اسی طرح مصالح ومفاسد اور بھلائیاں اور برائیاں جب ایک دوسرے سے متصادم ہوں اس وقت ان کے درمیان موازنہ۔

● **مَصالح کا آپس میں موازنہ**

پہلی قسم یعنی مصالح میں ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت کے متعین کردہ مصالح رتبے کے لحاظ سے سب ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ وہ ـــــ جس طرح کہ علمائے اصول نے ان کی وضاحت کی ہے ـــــ تین بنیادی مراتب پر مشتمل ہیں: ضروریات، حاجیات اور تحسینیات۔ ضروریات وہ

ہوتی ہیں جن کے بغیر زندگی نہیں گزرتی۔ حاجیات وہ ہوتی ہیں جن کے بغیر زندگی گزر تو سکتی ہے مگر مشقت اور حرج کے ساتھ۔ اور تحسینیات وہ ہیں جو زندگی کو حسین و جمیل بناتے ہیں۔ ان کو عرف میں تکمیلی اُمور بھی کہتے ہیں۔

موازنات کا مسئلہ —— اور اس کے ساتھ ہی ترجیحات کا مسئلہ بھی —— ہم سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ:

ضروریات کو حاجات پر اور اس سے بھی زیادہ اہمیّت کے ساتھ تحسینیات پر مقدم کریں۔

اور حاجیات کو تحسینیات اور تکمیلی امور پر مقدم کریں۔

اسی طرح ضروریات خود آپس میں بھی مختلف اور متفاوت ہیں۔ وہ —— جیسا کہ علما نے بیان کیا ہے —— پانچ ہیں: دین، جان، نسل، عقل اور مال۔ اور بعض علما نے ان کے ساتھ ایک چھٹی چیز بھی شامل کی ہے اور وہ ہے: عزت۔

ان میں سے دین سب سے پہلے اور اہم ہے۔ وہ باقی ضروریات پر مقدم ہے۔ یہاں تک کہ جان پر بھی۔ اور جان پھر باقی ضروریات پر مقدم ہے۔

مصالح کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے درج ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے گا:

یقینی مصلحت کو ظنی اور موہوم مصلحت پر مقدم کیا جائے گا۔

بڑی مصلحت کو چھوٹی مصلحت پر مقدم کیا جائے گا۔

جماعتی مصلحت کو انفرادی مصلحت پر مقدم کیا جائے گا۔

اکثریت کی مصلحت کو اقلیت کی مصلحت پر مقدم کیا جائے گا۔

دائمی مصلحت کو عارضی یا ختم ہونے والی مصلحت پر مقدم کیا جائے گا۔

اصل اور بنیادی مصلحت کو ظاہری اور جانبی مصلحت پر مقدم کیا جائے گا۔

مستقبل کی قوی مصلحت کو حال کی کمزور مصلحت پر مقدم کیا جائے گا۔

صلح حدیبیہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اصل اور بنیادی اور مستقبل کے قوی مصلحتوں کو ان ظاہری اور فوری مصلحتوں پر مقدم کرتے ہیں جن سے بعض لوگ چمٹے ہوئے تھے۔ اس لیے آپ ﷺ نے ایسی شرطوں کو بھی قبول کیا جن کے بارے میں پہلی نظر میں یہی کہا جا سکتا تھا کہ اس میں اسلامی جماعت کے لیے نقصان ہے، یا کم پر رضامندی ہے۔ اس بات پر رضامند ہونا کہ صلح نامے سے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے الفاظ مٹا کر ان کی جگہ بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ لکھا جائے، آپ ﷺ کے اسمِ مبارک سے رَسُوْلُ اللّٰہِ کے الفاظ مٹا کر ان کی جگہ ابْنُ عَبْدُ اللّٰہِ کے الفاظ لکھے جائیں، ان تمام امور پر رضامندی کا مقصد یہ ہے تھا کہ آپ ﷺ کچھ اطمینان کا سانس لیں، دعوت کی اشاعت کے لیے فارغ ہو جائیں اور دنیا کے مختلف ممالک کے بادشاہوں کو مخاطب کر سکیں۔ قرآن نے اس کو بجا طور پر فتح مبین کہا ہے۔ اس کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

● مَفاسد اور مَضرّتوں کے درمیان موازنہ

دوسری قسم یعنی مفاسد اور مضرتوں میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بھی مصالح کی طرح باہم مختلف اور متفاوت ہیں۔

وہ مَفسدہ جو کسی 'ضروری' چیز کی تعطیل کا ذریعہ بنے، اس مفسدہ سے مختلف ہے جو کسی 'حاجی' امر کو معطل کر دے، اور وہ اس مفسدہ سے مختلف ہے جو کسی 'تحسینی' چیز میں رکاوٹ بنے۔

وہ مَفسدہ جو مال کے لیے مُضر بنے، اس مفسدہ سے کم درجے میں ہے جو جان کے لیے مُضر ہو، اور یہ اس مفسدہ سے کم ہے جو دین اور عقیدے کو نقصان پہنچائے۔

پھر مفاسد اور مضرّتیں اپنے حجم، اثرات اور خطرات کے لحاظ سے بھی آپس میں مختلف اور متفاوت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا نے بعض قواعد وضع کیے ہیں جو دین کے اہم ترین احکام کو منضبط کرتے ہیں۔ ان میں سے چند قواعد درج ذیل ہیں:

لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ نقصان پہنچانے میں پہل کرنا اور ضرر کا جواب ضرر سے دینا دونوں ممنوع ہیں۔

اَلضَّرَرُ یُزَالُ بِقَدْرِ الْاِمْکَانِ ضرر کو ممکن حد تک زائل کیا جائے۔

اَلضَّرَرُ لَایُزَالُ بِضَرَرٍ مِّثْلِہٖ اَوْ اَکْبَرَ مِنْہُ ضرر کو اس کے برابر یا اس سے بڑے ضرر سے زائل نہ کیا جائے۔

یُرْتَکَبُ اَخَفُّ الضَّرَرَیْنِ وَاَھْوَنَ الشَّرَّیْنِ دو ضرروں یا دو شرّ میں سے جو زیادہ خفیف ہوگا اس کا ارتکاب کیا جاسکتا ہے۔[1]

یُتَحَمَّلُ الضَّرَرُ الْاَدْنیٰ لِدَفْعِ الضَّرَرِ الْاَعْلیٰ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا چھوٹے نقصان کو برداشت کیا جائے۔

یُتَحَمَّلُ الضَّرَرُ الْخَاصُّ لِدَفْعِ الضَّرَرِ الْعَامِّ عام ضرر سے بچنے کے لیے خاص ضرر کو برداشت کیا جائے۔

● مصالح و مفاسد میں تعارض کے وقت موازنہ

اگر کسی معاملے میں مصالح اور مفاسد یا منفعت اور مَضَرّت دونوں جمع ہوں، تو ان کے درمیان موازنہ کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اس میں 'اَغلب' اور 'اکثر' کا اعتبار کیا جائے گا کیوں کہ 'اکثر'، 'کل' کے حکم میں ہوتا ہے۔

اگر کسی معاملے میں مفاسد اور مضرتیں مصالح اور منافع پر غالب ہوں تو اس کام کو روکنا ضروری ہوگا۔ کیوں کہ اس میں فساد کا غلبہ ہے۔ یہاں اُس منفعت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا جو اس میں موجود ہے۔ یہی بات قرآن نے شراب کے مسئلے میں اس وقت بیان فرمائی جب پوچھنے والوں نے اس کے بارے میں پوچھا تھا:

1- اھون البلیتین کا یہ قاعدہ اس صورت میں جاری ہوتا ہے جب دونوں میں سے ایک کے ارتکاب کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔ اگر کوئی اور صورت موجود ہو تو پھر دونوں ضرروں سے بچنا ضروری ہوگا۔ (مترجم)

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ط قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز وَاِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا ط (البقرۃ ۲:۲۱۹)

پوچھتے ہیں: شراب اور جوے کا کیا حکم ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی برائی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔

اس کے برعکس جب منفعت بڑی اور غالب ہو تو اس کام کی اجازت دی جائے گی اور اسے مشروع سمجھا جائے گا۔ اس میں جو چھوٹی مفسدہ موجود ہے اس کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں جو اہم ترین قواعد ہیں وہ درج ذیل ہیں:

دَرْءُ الْمَفْسَدَۃِ مُقَدَّمٌ عَلٰی جَلْبِ الْمَصْلَحَۃِ خرابی کو دفع کرنا مصلحت کے حصول پر مقدم ہے۔

اس قاعدے کی تکمیل ایک اور قاعدے سے ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اَلْمَفْسَدَۃُ الصَّغِیْرَۃُ تُغْتَفَرُ مِنْ اَجْلِ الْمَصْلَحَۃِ الْکَبِیْرَۃِ چھوٹی خرابی کو بڑی مصلحت کی خاطر نظر انداز کیا جائے گا۔

اور تُغْتَفَرُ الْمَفْسَدَۃُ الْعَارِضَۃُ مِنْ اَجْلِ الْمَصْلَحَۃِ الدَّائِمَۃِ عارضی خرابی کو دائمی مصلحت کی خاطر نظر انداز کیا جائے گا۔

اور اسی طرح لَاتُتْرَکُ مَصْلَحَۃٌ مُحَقَّقَۃٌ مِنْ اَجْلِ مَفْسَدَۃٍ مُتَوَھَّمَۃٍ یقینی مصلحت کو موہوم خرابی کی وجہ سے نہیں چھوڑا جائے گا۔

موازنات کے اس مسئلے کی عملی زندگی میں بڑی اہمیّت ہے، خاص طور پر شرعی سیاست کے باب میں۔ کیوں کہ یہ وہ بنیاد ہے جس پر سیاستِ شرعیہ کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور ترجیحات کے مسئلے کے لیے بھی اس کی بڑی اہمیّت ہے۔

● مصالح اور مفاسد کی پہچان کیسے

قابلِ لحاظ مصالح یا دنیوی ہوں گی یا اخروی، یا پھر دنیوی اور اخروی دونوں۔ اور یہی

معاملہ یقیناً مفاسد کا بھی ہے۔

ان میں سے ہر ایک کی پہچان کا شرعی یا عقلی یا دونوں لحاظ سے ایک طریقِ کار ہے۔

● عز بن عبدالسلام کی رائے

امام عزالدین بن عبدالسلام ﷫ نے اپنی کتاب **قواعد الأحکام فی مصالح الأنام** کی فصل **فِيْمَا تُعْرَفُ بِهِ الْمَصَالِحُ وَالْمَفَاسِدُ وَفِيْ تَفَاوُتِهِمَا** میں اس کی پوری تفصیل بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس مقام پر بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

❖ اکثر دنیوی مصالح ومفاسد عقل سے ہی معلوم ہو جاتی ہیں اور وہی زیادہ تر قانونی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرع کے وارد ہونے سے پہلے بھی ایک عقل مند سے یہ بات چھپی نہیں تھی کہ انسان اور دوسری اشیا کے لیے فوائد کا حصول اور خرابیوں کا سد باب اچھا اور قابلِ تعریف ہے۔ اسی طرح اچھے سے اچھے فوائد کا حصول بھی قابلِ تعریف ہے اور خرابیوں میں جو زیادہ بڑی خرابی ہو اس کا اپنے اپنے درجے کے مطابق سد باب بھی قابلِ تعریف ہے۔ نیز غالب فوائد کو مغلوب خرابیوں پر مقدم کرنا بھی پسندیدہ ہے اور غالب خرابیوں کو روکنا مغلوب فوائد کے حصول پر مقدم ہے۔ اس پر حکما کے درمیان اتفاق ہے۔ اسی طرح خون کی حرمت، مال ومتاع اور عزت کی حرمت، اور اقوال واعمال میں افضل سے افضل کے حصول کے قوانین کا معاملہ ہے۔

اگر چہ ان میں سے بعض میں اختلاف ہوا ہے مگر اس کی غالب وجہ بھی یہی ہے کہ وہاں برابری یا ان کے درمیان کسی کے راجح اور کسی کے مرجوح ہونے میں اختلاف ہوا ہوتا ہے۔

جب دو امور میں مساوات ہوتا ہے تو عام لوگ حیرت کا شکار ہوتے ہیں اور جب تفاوت یا مساوات میں انھیں حیرت ہوتی ہے تو توقف اختیار کرتے ہیں۔

اسی طرح کا معاملہ طبیبوں اور ڈاکٹروں کا ہوتا ہے کہ وہ بڑی بیماری کو دفع کرتے ہیں خواہ اس کے ساتھ آدمی چھوٹی بیماری کا مستقل مریض ہی بن جائے۔ وہ دو صحتوں میں سے جو اعلیٰ

ہوتا ہے اس کو حاصل کرتے ہیں اور صحت کی چھوٹی قسم کے چلے جانے کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ مگر جب وہ مساوات یا تفاوت کے حوالے سے حیرت میں پڑ جاتے ہیں تب وہ توقف اختیار کرتے ہیں۔ علمِ طب بھی شریعت کی طرح صحت وعافیت کے حصول اور صحت کی خرابی کو روکنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ان میں جن بیماریوں کو دفع کیا جا سکتا ہے ان کو دفع کیا جائے گا اور جن عافیتوں کو حاصل کیا جا سکتا ہے ان کو حاصل کیا جائے گا۔ اگر ساری بیماریوں کو دفع کرنا اور ساری صحتوں کو حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو پھر دیکھا جائے گا، اگر سب آپس میں برابر ہیں تو طبیب کو اختیار ہوگا کہ کس بیماری کو پہلے دفع کرے اور کس مصلحت کو پہلے حاصل کرے۔ اگر ان کے درمیان تفاوت پایا جاتا ہے تو ان کے درمیان ترجیح کی صورت کو پہچان کر اس پر عمل پیرا ہو جائے۔ اگر اسے ان کے درمیان تفاوت یا ترجیح کا علم نہیں ہے تو پھر توقف کرلے۔ جس نے شریعت وضع کی ہے اسی نے طب کو بھی وضع کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اسی لیے وضع کیا گیا ہے کہ بندوں کے مصالح کو حاصل کیا جائے اور ان سے خرابیوں کو دفع کیا جائے۔

جس طرح یہ جائز نہیں ہے کہ آدمی دینی مصالح میں راجح پہلو کے واضح ہونے تک ان میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینے میں توقف ہی کرے، اسی طرح طبیب کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ راجح پہلو کے واضح ہونے تک بیماریوں میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینے میں توقف بھی کرے اور علاج بھی شروع کرے۔ اس اصول سے کوئی بھی تجاوز نہیں کرتا سوائے اُس کے جو صالح و اَصلح اور فاسد و افسد میں فرق کرنے سے بے خبر ہو۔ وجہ وہی ہے کہ انسان کی طبیعت میں یہ بات رکھ دی گئی ہے۔ اس کی خلاف ورزی صرف وہی کرے گا جو جاہل ہو اور اس پر شقاوت غالب آ گئی ہو یا احمق ہو اور اس میں حماقت کا غلبہ ہو۔ کافروں میں سے جن لوگوں نے حیوان کی ذبح حرام قرار دیا اور اس نے حیوان کی مصلحت چاہی وہ بھی حق کی پٹڑی سے اتر گیا۔ کیوں کہ اس نے حیوانِ خسیس [جانور] کے فائدے کو حیوانِ نفیس [انسان] کے فائدے پر مقدم کر دیا۔ اگر وہ جہالت اور خواہشات کی پیروی سے آزاد ہو جاتا تو یقیناً وہ احسن کو خسیس پر

مقدم کرتا اور قبیح پر عمل پیرا ہو کر وہ اَقبح کو دفع کرتا۔ لیکن فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ أَضَلَّ اللهُ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِيْنَ (الروم ۳۰:۲۹) کون ہے جو اس شخص کو ہدایت دے سکے جسے اللہ نے گم راہ کر دیا ہو اور جس کا کوئی مدد گار نہ ہو۔

جس کو اللہ نے توفیق دی ہو، اسے غلطی سے بچایا ہو اور اسے اس مسئلے کے مَا لَهَا وَمَا عَلَيْهَا کا علم دیا ہو اور پھر اس علم پر عمل کی توفیق بھی عطا فرمائی ہو تو وہ یقیناً کام یاب ہوں گے اور وہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے:

وَقَدْ كُنَّا نَعُدُّهُمْ قَلِيْلاً   فَقَدْ صَارُوْا أَقَلَّ مِنَ الْقَلِيْلِ!

ہم ان کو پہلے بھی کم سمجھ رہے تھے۔ مگر اب تو اور بھی کم ہو گئے ہیں۔

اسی طرح مجتہدین فی الاحکام کا معاملہ ہوتا ہے۔ ان میں سے جسے اللہ نے توفیق دی ہو اور اسے غلطی سے محفوظ رکھا ہو اس کو اللہ تعالیٰ نے راجح دلائل سے آگاہ کیا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ حق تک پہنچ پاتا ہے۔ اس کے لیے دوگنا اجر ہوتا ہے۔ ایک ارادے کا اجر اور ایک حق تک پہنچنے کا۔ اس کے برعکس جو شخص کسی بات کو کسی پر ترجیح دینے میں غلطی کرتا ہے اسے اپنے ارادے اور اجتہاد کا ثواب مل جاتا ہے اور اس سے جو غلطی ہو جاتی ہے وہ معاف ہوتی ہے۔ ان خطاؤں میں سب سے بڑی وہ ہوتی ہے جو مجتہد سے اصولی مسائل میں ہو جاتی ہے۔

جان لو کہ اَصلح کو مقدم کرنا اور اَفسد کا سد باب کرنا یہ دونوں باتیں انسانی طبیعت میں مرکوز کی گئی ہیں اور یہ ان پر رب الارباب کی خصوصی نظر کرم ہوتی ہے، جیسا کہ ہم نے اس کتاب میں ذکر کیا ہے۔ اگر آپ ایک چھوٹے بچے کو لذیذ اور لذیذ تر میں انتخاب کا اختیار دے دیں تو یقیناً وہ لذیذ تر کو منتخب کرے گا۔ اسی طرح اگر اسے حسین اور حسین تر میں انتخاب کا اختیار دے دیں تو وہ حسین تر کو اپنائے گا۔ اگر اسے کانسی اور چاندی کے سکوں میں انتخاب کا اختیار دیا جائے تو وہ چاندی کے سکے کو منتخب کرے گا۔ نیز اگر اسے سونے اور چاندی میں انتخاب کا اختیار دیا جائے تو وہ سونے کا انتخاب کرے گا۔ اَصلح پر صالح کو کوئی بھی مقدم نہیں کرتا، سوائے

اس کے کہ وہ اَصلح کی فضیلت سے بے خبر ہو یا ایسا بدبخت ہو جس نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو جاہل بنایا ہوا اور وہ دونوں کے درمیان موجود فرق کو نہ دیکھتا ہو۔[۲]

❖ رہے آخرت کے مصالح اور مفاسد تو وہ نقل کے بغیر معلوم نہیں کیے جا سکتے۔

جن مصالح کا تعلق دین اور دنیا دونوں سے ہے وہ متفرق اور متفاوت درجات میں ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض اونچے درجے کے ہوتے ہیں اور بعض ادنیٰ کے، اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دونوں کے درمیان متوسط ہوتے ہیں۔ پھر جو متوسط ہوتے ہیں ان میں بھی کچھ متفق علیہ ہوتے ہیں اور بعض میں اختلاف ہوتا ہے۔

شریعت میں جس چیز کا حکم دیا جاتا ہے اس میں یا تو دنیا اور آخرت دونوں کا فائدہ ہوتا ہے یا پھر کسی ایک کا۔ اور جس چیز سے روکا جاتا ہے تو اس میں یا تو دین و دنیا دونوں کا نقصان ہوتا ہے یا ان میں سے کسی ایک کا۔ جس عمل کے کرنے سے بہترین مصلحت کو حاصل کیا جائے وہ افضل الاعمال ہوتا ہے اور جو ان میں سے سب سے بدترین خرابی کا ذریعہ بنے تو وہ ارذل الاعمال ہوگا۔ چنانچہ دنیا میں کوئی سعادت نہیں ہے جو معرفتِ حق، ایمان اور اطاعتِ الٰہی سے زیادہ صالح ہو اور کوئی شقاوت نہیں ہے جو جہالت، کفر اور فسوق وعصیان سے زیادہ بری ہو۔

اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ مصالح کے تفاوت سے اخروی ثواب میں فرق واقع ہوتا ہے اور مفاسد کے تفاوت سے اخروی عذاب میں تفاوت پیدا ہوتا ہے۔ مقاصدِ قرآن میں چند اہم مقاصد یہ ہیں: مصالح اور ان کے اسباب کو حاصل کرنے کا حکم دینا اور مفاسد اور ان کے اسباب سے روکنا۔ چنانچہ دنیا کے مصالح اور مفاسد کی آخرت کے مفاسد و مصالح سے کوئی نسبت نہیں۔ کیوں کہ اخروی مصالح میں جنت میں دائمی قیام، اللہ کی رضامندی اور پھر اللہ کی دیدار اصل چیزیں ہیں۔ اے کاش! یہ واقعی دائمی نعمتیں ہیں!! اسی طرح آخرت کے مفاسد میں دائمی عذاب جہنم، اللہ کی ناراضی اور دیدارِ الٰہی سے محرومی ہے۔ ہائے افسوس! یہ واقعی دردناک عذاب ہے!!

۲-(قواعد الأحكام في مصالح الأنام ۱/۵-۷)

مصالح کی تین قسمیں ہیں: ایک مباحات کے مصالح، دوسرے مستحبات کے مصالح اور تیسرے واجبات کے مصالح۔

مفاسد کی دو قسمیں ہیں: ایک مفاسدِ مکروہات اور دوسرے مفاسدِ محرمات۔

● **دارین کے مصالح ومفاسد کا پیمانہ**

دنیا اور آخرت کے مصالح ومفاسد، ان کے شرعی اسباب جانے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے۔ ان میں سے کوئی چیز مخفی ہو جائے تو اسے شریعت ہی سے معلوم کیا جائے گا، اور شریعت نام ہے کتاب وسنت، اجماع، قیاسِ معتبرہ اور استدلال صحیح کا۔ رہے دنیا کے مصالح، اس کے اسباب اور اس کے مفاسد، تو وہ ضروریات، تجربات، عادیات اور معتبر گمان سے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی مخفی ہو جاتی ہے تو وہ اپنے مذکورہ دلائل سے معلوم ہو سکے گی۔ جو چاہتا ہے کہ ان مناسبات، مصالح اور مفاسد میں راجح اور مرجوح کو پہچان لے تو اسے اپنی عقل کے ترازو پر پرکھے، بشرطیکہ اس کے بارے میں شریعت کا کوئی صریح حکم موجود نہ ہو اور پھر اس کے اوپر احکام کی بنیاد رکھے۔ اس سے شاید کوئی حکم بھی خارج نہیں ہوگا، سوائے ان افعال کے جن کو اللہ نے بندوں پر عبادت کے طور پر لازم کیا ہے اور انھیں اس کی مصلحتوں یا مفاسد سے آگاہ نہیں کیا۔ اس طرح سے اعمال کا حسن وقبح معلوم کیا جا سکتا ہے، باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ پر یہ بات لازم نہیں ہے کہ وہ حسن اشیا کے مصالح کو حاصل کرے اور قبیح اعمال کے مفاسد کے دفع کرے۔ اسی طرح اس پر یہ بھی لازم نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو پیدا کرے، اسے رزق دے، اسے مکلف کرے اور اسے ثواب یا عذاب دے۔ وہ حسن افعال کے مصالح کو حاصل کرتا ہے یا قبیح کے مفاسد کو دور کرتا ہے تو اپنے اختیار سے اور اپنے بندوں پر فضل وکرم کرتے ہوئے کرتا ہے۔

● **کتاب قواعد الاحکام کا مقصد**

امام عز بن عبدالسلام رحمہ اللہ اپنی کتاب کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس کتاب کی تصنیف کا مقصد طاعات، معاملات اور باقی اعمال کے مصالح کا بیان ہے تا کہ لوگ اس کے حصول کی سعی کریں۔ اسی طرح اس کا مقصد ممنوعات کی مصلحتوں کا بیان ہے تا کہ لوگ ان کو دفع کرنے کی کوشش کریں۔ نیز عبادات کے مصالح کا بیان ہے تا کہ لوگ اس سے آگاہ رہیں۔ اسی طرح جن مصالح کو مقدم کرنا ہے اور جن کو مؤخر کرنا ہے ان کا بیان بھی اس کا مقصد ہے۔ اس کے علاوہ ان اعمال کی مصلحتوں کا بیان جو انسانوں کی قدرت میں ہیں اور جو ان کی قدرت میں نہیں ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ شریعت ساری فائدہ ہی فائدہ ہے۔ وہ یا تو خرابیوں کو دفع کرتی ہے یا فوائد کو حاصل کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب بھی فرماتا ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا [اے ایمان والو!] تو اس کے بعد جو حکم دیا جاتا ہے اس پر غور کریں۔ وہاں آپ کو اس کے سوا کوئی چیز نہیں ملے گی کہ یا تو تجھے بھلائی پر ابھارا جاتا ہے یا تجھے برائی سے روکا جاتا ہے، یا پھر یہ دونوں چیزیں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بعض چیزوں کے مفاسد کھل کر بیان کر دیے ہیں اس کی وجہ یہ ہے لوگوں کو برائی سے اجتناب پر ابھارا جائے۔ اسی طرح بعض احکام میں جو مصالح ہیں ان کو بھی کھل کر بیان کر دیا ہے تا کہ لوگوں کو مصالح کو عملی جامہ پہنانے پر ابھارا جائے۔[۳]

۳- قواعد الأحكام في مصالح الأنام ۱/۵-۱۱

ترجیحات اور مقاصد شریعت

ترجیحات کے مسئلے کا تعلق مقاصد شریعت کے مسئلے کے ساتھ بھی ہے۔ یہ بات متفق علیہ ہے کہ شرعی احکام کسی نہ کسی علت کے ساتھ معلل ہوتے ہیں اور ان کی ظاہری شکل کے پیچھے ایک مقصد پوشیدہ ہوتا ہے جن کو وجود میں لانا شریعت کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام حکیم ہے۔ یہ نام قرآن پاک میں کم وبیش ۹۰ بار استعمال ہوا ہے۔ اور یہ بات متعین ہے کہ حکیم کسی عبث اور فضول چیز کو قانونی شکل نہیں دیتا۔ جیسا کہ وہ کسی چیز کو عبث اور باطل طور پر پیدا نہیں کرتا۔ اللہ اس سے پاک ہے۔

یہاں تک کہ عباداتِ محضہ کے بھی اپنے شرعی مقاصد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے عبادات کی بھی علتیں بیان کر دی ہیں۔ چنانچہ نماز کے بارے میں فرمایا کہ:

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت۲۹:۴۵) بے شک نماز بے حیائی اور منکر سے روکتی ہے۔

زکوٰۃ کا مقصد ہے:

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (التوبۃ۹:۱۰۳) تم اس کے ذریعے ان کی تطہیر اور تزکیہ کرو۔

روزے کا مقصد ہے:

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرۃ۲:۱۸۳) تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

اور حج کے بارے میں فرمایا:

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ (الحج ۲۲:۲۸)

تاکہ وہ اپنے فائدے کے لیے حاضر ہو جائیں اور اللہ کا ذکر کریں۔

دین کی صحیح سمجھ کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ہم شریعت کے مقاصد سے آگاہی حاصل کریں تاکہ ہم ان کو وجود میں لانے کے لیے کام کر سکیں اور اپنے آپ پر یا دوسرے لوگوں پر ایسی چیزوں کے بارے میں تشدد نہ کریں جن کا تعلق شریعت کے مقاصد اور اہداف کے ساتھ نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مجھے اس بات کا کوئی جواز نظر نہیں آتا کہ ہم اپنے دور میں صدقہ فطر کو اشیائے خوردونوش کی صورت میں دینا لازمی قرار دیں، یہاں تک کہ شہری علاقوں میں بھی یہی فتویٰ جاری کریں۔ اس میں اصل مقصود اشیائے خوردونوش کا کسی کو دینا نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس مبارک دن میں غریب آدمی اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کریں۔

اسی طرح میں اس بارے میں تشدد کے بھی کوئی معنی نہیں سمجھتا کہ حج کے دوران 'جمرات' کو کنکریاں مارنے کے لیے زوال سے پہلے کا وقت لازمی قرار دیں، خواہ اس کے لیے کتنا ہی رش بن جائے اور اس کی بنا پر کتنے ہی لوگ بھیڑ میں دوسروں کے پاؤں کے نیچے کچلے جائیں۔ جیسا کہ پچھلے چند سالوں سے معمول بن گیا ہے۔ شریعت میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہو کہ زوال سے پہلے 'جمرات' کو کنکریاں مارنا مقصود بالذات ہے۔ اصل مقصود تو اللہ کا ذکر اور آسانی پیدا کرنا اور حرج کو دور کرنا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی ضروری ہے کہ مسائل ثابتہ اور وسائل متغیرہ میں تمیز کیا جائے۔ پہلی چیز کے بارے میں ہمیں فولاد کی طرح سخت ہونا چاہیے اور دوسری کے بارے میں ریشم سے زیادہ نرم۔ یہ بات ہم نے اپنی کتاب **کیف نتعامل مع السنة النبوية** میں خوب واضح کی ہے۔[۴]

۴- دیکھیے مذکورہ کتاب کی فصل: اَلتَّمْيِيْزُ بَيْنَ الْوَسِيْلَةِ الْمُتَغَيِّرَةِ وَالْهَدَفِ الثَّابِتِ لِلسُّنَّةِ

ترجیحات اور فہمِ نصوص

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ترجیحات کے مسئلے کا جزئی نصوصِ شریعت کی سمجھ سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اور وہ اس طرح کہ یہ اسے مقاصدِ کلیہ اور قواعدِ عامہ کے ساتھ جوڑ دیتی ہے۔ چنانچہ جزئیات کو اپنی کلیات کی طرف لوٹایا جاتا ہے اور فروع کو اصول کی طرف۔

یہاں بھی یہ بات اہم ہے کہ قطعی اور ظنی نصوص کے درمیان اور محکم اور متشابہ کے درمیان فرق روا رکھا جائے۔ ظنی کو قطعی کی روشنی میں دیکھا جائے اور متشابہ کو محکم کے قالب میں کسا جائے۔

اگر یہ بات دیکھی جائے کہ یہ فقہ زیادہ تفصیلات کے ساتھ کس قسم سے تعرض کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس فقہ کا سب سے زیادہ لزوم علمِ حدیث کے ساتھ ہوتا ہے کیوں کہ اس کے فہم میں قرآن سے بھی زیادہ اختلاف پیدا ہوتا ہے اور اس کا عمل دخل بہت سی جزئیات اور تطبیقات میں ہوتا ہے۔ اس میں بعض قسمیں ایسی ہوتی ہیں جن کا تعلق قانون سازی کے ساتھ اور بعض ایسی ہوتی ہیں جن کا تعلق قانون سازی سے نہیں ہوتا۔ مثلاً کھجور میں قلم لگانے کی حدیث یا اس طرح کی بعض اور احادیث ایسی ہیں جن کا تعلق قانون سازی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ پھر ان میں بعض ایسی ہوتی ہیں جو مستقل قانون سازی کے لیے ہوتی ہیں اور بعض ایسی بھی، جن کا تعلق عارضی قانون سازی کے ساتھ ہوتا ہے۔ نیز بعض اشیا عام قانون سازی کے لیے ہوتی ہیں اور بعض کا خاص قانون سازی کے ساتھ۔ یہ ساری قسمیں محققین علما نے تفصیل کے ساتھ

بیان کردی ہیں۔

ہم نے بھی اسے اَلْجَانِبُ التَّشْرِيْعِيُّ لِلسُّنَّةِ کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے مجلة مركز بحوث السنة والسيرة میں اور اپنی کتاب السنۃ: مصدراً للمعرفة والحضارة میں بیان کیا ہے۔ جو لوگ زیادہ تفصیل چاہتے ہیں وہ ان کی طرف رجوع فرمائیں۔

بِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ

❖❖❖

۳

مقدار پر معیار کی ترجیح

مقدار پر معیار کی ترجیح

شرعی طور پر یہ ایک اہم بات ہے کہ کیفیت اور نوعیت کو کمیت اور حجم پر مقدم کیا جائے۔ شریعت میں عددی اکثریت یا حجم میں بڑے ہونے کا اعتبار نہیں ہوتا بلکہ اصل دار و مدار چیز کی نوعیت اور کیفیت پر ہوتا ہے۔

صرف کثرت قابلِ تعریف نہیں

● قرآن کریم نے اُس اکثریت کی مذمت کی ہے جس کے افراد نہ عقل رکھتے ہوں اور نہ علم، یا یہ کہ وہ ایمان نہ لاتے ہوں اور شکر نہ کرتے ہوں۔ اس پر کتاب اللہ کی بہت سی آیات دلالت کرتی ہیں، مثلاً:

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (العنکبوت ۲۹:۶۳)

بلکہ ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الاعراف ۷:۱۸۷)

لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (ھود ۱۱:۱۷)

لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ (البقرۃ ۲:۲۴۳)

لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الانعام ۶:۱۱۶)

اگر تم نے زمین کے اکثر لوگوں کی پیروی کی تو وہ تمھیں سیدھے راستے سے گم راہ کر دیں گے۔

● دوسری طرف قرآن اس قلیل گروہ کی تعریف کرتا ہے جو مومن، باعمل اور شاکر ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ (ص ۳۸:۲۴)

سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، اور وہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (سبا ۳۴:۱۳)

اور ہمارے بندوں میں تھوڑے ہی ہوتے ہیں جو شکر گزاری کرتے ہیں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ (الانفال ۸:۲۶)

یاد کرو جب تم تھوڑے تھے اور زمین میں کم زور کیے گئے تھے۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ (هود ۱۱:۱۱۶)

پھر کیوں نہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ایسے اہلِ خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم، جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچالیا۔

اس بنا پر ضروری یہ نہیں ہے کہ محض تعداد زیادہ ہو بلکہ اہم یہ ہے کہ لوگوں میں جو مومنین صالحین ہوں ان کی تعداد زیادہ ہو۔

● بہت سے لوگ یہ حدیث تو بیان کرتے ہیں کہ تَنَاكَحُوْا تَنَاسَلُوْا تَكَثَّرُوْا فَاِنِّي

مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْاُمَمَ [1] نکاح کرو اور نسل کو آگے بڑھاؤ اور اپنی تعداد میں اضافہ کرو۔ میں تمھارے ذریعے سے کثیر الامم بننا چاہتا ہوں] لیکن یہ نہیں سوچتے کہ رسول کریم ﷺ جاہل، فاسق اور ظالم لوگوں پر تو فخر نہیں کرتے بلکہ آپ ﷺ نیک، پاک، باعمل اور نفع بخش لوگوں پر فخر کریں گے۔

نبی ﷺ فرماتے ہیں: اَلنَّاسُ كَاِبِلٍ مِّائَةٍ لَا تَجِدُ فِيْهَا رَاحِلَةً [2] بعض انسانوں کی مثال ان سو اونٹوں کی طرح ہوتی ہے جن میں ایک بھی سواری کے لائق نہ ہو۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ لوگوں میں بھی بہترین قسم کے لوگ ایسے ہی نادر ہوتے ہیں جیسے اونٹوں میں ایسے اونٹ بہت کم ہوتے جو سواری کے لیے، سفر کے لیے اور نقل وحمل کے لیے صالح ہوتے ہیں، حتیٰ کہ بعض اوقات سو اونٹوں میں ایک بھی ان صفات کا حامل نہیں ہوتا۔

اور انسان کے اندر یہ تفاوت اور فرق دوسری قسم کے جانوروں کی نسبت کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ حدیث میں آیا ہے: لَيْسَ شَيْءٌ خَيْرًا مِّنْ اَلْفٍ مِّثْلِهٖ اِلَّا الْاِنْسَانُ۔ [3] دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اپنے جیسے ہزار سے بہتر ہو سوائے انسان کے۔

ہم ہر چیز میں کمیت اور تعداد کے خوگر بن گئے ہیں اور چاہتے ہیں سلسلہ نمبر میں ہزاروں اور لاکھوں سے آگے نکل جائیں۔ مگر اکثر ہمیں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی کہ اس کثرت کے پیچھے اصل حقیقت کیا ہے، نہ ہم اس حوالے سے سوچتے ہیں کہ یہ ہندسے کس چیز پر مشتمل ہیں۔

دورِ جاہلیت کے ایک عربی شاعر نے بھی اس بات کا ادراک کیا تھا کہ نوعیت کی اہمیت تعداد سے زیادہ ہے۔ وہ کہتا ہے:

۱- اسے ابوداؤد اور نسائی نے معقل بن یسار سے نقل کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۲۹۴۰۔

۲- متفق علیہ بروایت حضرت ابن عمرؓ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۱۶۵۱

۳- طبرانی نے اسے المعجم الکبیر میں اور ضیاء نے سلمانؓ سے روایت کیا ہے۔ صحیح الجامع الصغیر ۵۳۹۴ میں اسے حسن قرار دیا گیا ہے۔

تُعَيِّرُنَا أَنَّا قَلِيلٌ عَدِيدُنَا   فَقُلْتُ لَهَا: إِنَّ الْكِرَامَ قَلِيلٌ
وَمَا ضَرَّنَا أَنَّا قَلِيلٌ وَجَارُنَا   عَزِيزٌ وَجَارُ الْأَكْثَرِينَ ذَلِيلٌ

وہ ہمیں عار دلاتی ہے کہ ہماری تعداد کم ہے۔ میں نے کہا کہ شریف لوگوں کی تعداد تو کم ہی ہوتی ہے۔ اور پھر ہمارا کم ہونا ہمیں کوئی نقصان نہیں دیتا۔ کیوں کہ ہمارے پڑوسی [یا حلیف] معزز لوگ ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ تعداد میں زیادہ ہیں ان کے پڑوسی [یا حلیف] ذلیل ہیں۔

قرآن نے ہمارے سامنے یہ بھی بیان کیا ہے کہ طالوت کی فوج جو قلیل تعداد میں تھی کس طرح جالوت کی کثیر التعداد فوج پر غالب آ گئی:

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ ...... اور آگے جا کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ (البقرۃ ۲:۲۴۹-۲۵۱)

پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا تو اس نے کہا: ''ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمھاری آزمائش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پیے گا، وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے جو اس سے پیاس نہ بجھائے۔ ہاں ایک آدھ چلو کوئی پی لے تو پی لے۔'' مگر ایک گروہِ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے۔ پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے، تو انھوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے، انھوں نے کہا: ''بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔''

......آخر کار اللہ کے اذن سے انھوں نے کافروں کو مار بھگایا۔

قرآن نے ہمارے سامنے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ کس طرح رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ غزوہ بدر میں مشرکین پر غالب آ گئے حالانکہ مشرکین بڑی تعداد میں تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد بہت کم تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (آل عمران ۳:۱۲۳)

یقیناً جنگ بدر میں اللہ تمھاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کم زور تھے۔ لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔

اور وَاذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهِ (الأنفال ۸:۲۶)

یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی اور اپنی مدد سے تمھارے ہاتھ مضبوط کیے۔

دوسری طرف غزوۂ حنین میں جب مسلمانوں نے تعداد کی طرف دیکھا، اس کے دھوکے میں آ گئے اور معیار کو نہیں جانچا، انھوں نے روحانی قوت اور جنگی تیاری کو نظر انداز کر دیا تو قریب تھا کہ وہ شکست کھا جاتے۔ پہلے پہل ان کی حالت بگڑ گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ سیکھیں، متنبہ ہوں اور توبہ کریں۔ پھر اللہ نے انھیں فتح عطا فرمائی اور ان کی ایسی فوجوں سے مدد کی جنھیں وہ دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ۝ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا

وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ○ (التوبۃ ۹: ۲۵-۲۶)

اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمھاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز (اس کی دست گیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اس روز تمھیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرہ تھا۔ مگر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کا جو حق کا انکار کریں۔

قرآن نے یہ بات بھی بیان کی ہے کہ ایک انسان میں جب قوتِ ایمانی اور قوتِ ارادی، جسے صبر سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو اس کی طاقت اپنے اُس دشمن کے مقابلے دس گنا تک بڑھنے کا امکان ہوتا ہے جو قوتِ ایمانی اور قوتِ ارادی سے عاری ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَي الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○ (الانفال ۸: ۶۵)

اے نبی! مومنوں کو جنگ پر ابھارو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرینِ حق میں ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے۔ کیوں کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔

یہ تناسب اس صورت میں ہے جب مسلمان طاقت ور ہوں۔ اگر وہ کم زور ہوں تو پھر ممکن ہے کہ اس کی طاقت اپنے دشمن کے مقابلے میں دگنا ہو جائے۔ جیسا کہ اس کی طرف سورۂ انفال کی اگلی آیت اشارہ کر رہی ہے:

اَلْــٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ (الانفال ۸: ۶۶)

اب اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ اب تم میں کم زوری ہے، پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے۔

معلوم ہوا کہ کام یابی کا اصل دار و مدار ایمان اور ارادے پر ہے، تعداد اور کثرت پر نہیں۔

● معیار کی اہمیت

جس نے سیرتِ رسول ﷺ کا مطالعہ کیا ہو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی توجہ کمیت کی طرف نہیں ہوتی تھی بلکہ کیفیت پر ہوتی تھی۔

سیرتِ نبوی اور سیرتِ خلفائے راشدین سے بھی یہی بات پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو فتح مصر کے لیے بھیجا تھا۔ ان کے ساتھ صرف چار ہزار کی فوج تھی۔ پھر انھوں نے کمک مانگی تو مزید چار ہزار فوج بھیجی۔ اس کمک کے ساتھ چار مخصوص افراد تھے جن کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان میں ہر فرد ایک ہزار کے برابر ہے۔ اس طرح مجموعی فوج کو بارہ ہزار سمجھو! اور بارہ ہزار افراد کو اس سے کم افراد سے شکست نہیں کھانا چاہیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اصل اعتبار لوگوں کی کیفیت، ان کی قدر و قیمت اور ان کی صلاحیتوں کا ہوتا ہے، نہ کہ ان کی تعداد اور حجم کا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بات منقول ہے کہ وہ ایک دن کسی کشادہ مکان میں اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اس دوران انھوں نے فرمایا: اپنی اپنی خواہش ظاہر کرو!

ان میں سے ایک نے کہا: میری خواہش تو یہ ہے کہ میرے پاس اس گھر کے برابر چاندی کے دراہم ہوں اور میں انھیں اللہ کی راہ میں خرچ کروں۔

دوسرے نے کہا: میں چاہتا ہوں کے میرے پاس اتنے ہی سونے کے دینار ہوں اور میں انھیں اللہ کی راہ میں خرچ کروں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرے پاس اس گھر کے برابر ابوعبیدہ بن الجراحؓ، معاذ بن جبلؓ، ابوحذیفہ کے غلام سالمؓ جیسے افراد ہوں اور میں ان کو اللہ کی راہ میں استعمال کروں۔

ہمارے دور میں پوری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد سوا ایک ارب سے تجاوز کر گئی ہے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ان کی حالت اُسی طرح ہے جس طرح کہ حدیث میں ان کی حالت بیان کی گئی ہے۔ **مسند أحمد** اور **أبو داؤد** میں حضرت ثوبانؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

يُوشِكُ أَنْ تَدَاعَى عَلَيْكُمُ الْأُمَمُ مِنْ كُلِّ أُفُقٍ، كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا
عنقریب قومیں ہر طرف سے تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کہ کھانے والے دستر خوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

کسی نے کہا: یارسول اللہ! کیا اس وقت ہم تھوڑے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:
بَلْ أَنْتُمْ كَثِيرٌ، وَلَكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ، وَلَيَنْزِعَنَّ اللهُ مِنْ صُدُورِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ، وَلَيَقْذِفَنَّ فِي قُلُوبِكُمُ الْوَهْنَ نہیں، اس وقت تم بہت زیادہ ہو گے مگر تمھاری مثال سیلاب کے خس وخاشاک کی طرح ہوگی۔ تمھارے دشمن کے [illegible] سے اللہ تعالیٰ تمھارا رعب نکال دے گا اور تمھارے دلوں میں وہن ڈال دے گا۔

کسی نے پوچھا: یارسول اللہ! یہ وہن کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ[۴] دنیا کی محبت اور موت کا خوف۔

یہ حدیث وضاحت کرتی ہے کہ اگر کثرت باہر سے پھولی ہوئی اور اندر سے بوسیدہ ہو تو کسی کام کی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ امت کی تاریخ کے اس دور میں ہوتا ہے جب وہ خس وخاشاک کی طرح بن جاتی ہے، اور جب وہ خفت، عدمِ اتحاد اور فقدانِ ہدف کی اسی صفت کے ساتھ متصف ہوتی ہے جس سے خس وخاشاک متصف ہوتی ہے۔

ان حالات میں توجہ کیفیت اور نوعیت پر مرکوز ہونی چاہیے نہ کہ صرف کمیت پر۔ اور یہاں کمیت سے مراد ہر وہ چیز ہے جو صرف مادی پہلو کی تعبیر ہو، جیسے تعداد کی کثرت، میدان کار کی وسعت، بڑی جسامت، بھاری وزن، مدتِ دراز، یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز جو اسی سلسلے کے ساتھ تعلق رکھتی ہو۔

● ہم نے جو بات کثرتِ تعداد کے بارے میں کہی ہے وہی بات دوسرے امور کے بارے میں بھی ہے۔

مثلاً ایک انسان کا اصل اندازہ اس کے لمبے قد، جسمانی قوت، موٹے جسم یا خوب صورت شکل کی بنیاد پر نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ ساری چیزیں اس کی اصل جوہر اور اس کی انسانیت کی حقیقت سے خارج ہیں۔ جسم تو انسان کے لیے ایک غلاف اور پوشش کی طرح ہے۔ رہی انسان کی حقیقت تو وہ عقل اور قلب کا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے منافقین کی صفت یہ بیان کی ہے:

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ (المنافقون ۶۳:۴) انھیں دیکھو تو ان کے جسم تمھیں بڑے شاندار نظر آئیں۔

اسی طرح قومِ عاد کی صفت ان کے نبی حضرت ہود علیہ السلام کی زبان سے ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: **وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً** (الأعراف ۷:۶۹) اور تمھیں خوب تومند کیا۔

۴- دیکھیے صحیح الجامع الصغیر ۸۱۸۳۔

لیکن خلقت اور جسامت میں ان کی اس بڑائی نے انھیں دھوکے اور تکبر میں ڈال دیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (حم السجدة ۴۱:۱۵)

عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے: کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔

اور حدیث صحیح میں ہے کہ: إِنَّهُ لَيَأْتِي الرَّجُلُ الْعَظِيمُ السَّمِينُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَلَا يَزِنُ عِنْدَ اللهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ[5] قیامت کے دن ایک بڑے موٹے تازے شخص کو لایا جائے گا مگر اللہ کے ہاں اس کا وزن مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا۔ [اور پھر فرمایا:] چاہو تو اس کے بارے میں یہ آیت پڑھو کہ:

فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (الکهف ۱۸:۱۰۵)

قیامت کے دن ہم ان کو کوئی وزن نہ دیں گے۔

ایک بار حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کسی درخت پر چڑھ گئے تو نیچے سے ساتھیوں نے ان کی پنڈلیاں دیکھیں جو بہت پتلی تھیں۔ وہ انھیں دیکھ کر ہنس پڑے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَتَضْحَكُونَ مِنْ دِقَّةِ سَاقَيْهِ؟ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَهُمَا أَثْقَلُ فِي الْمِيزَانِ مِنْ جَبَلِ أُحُدٍ ● اچھا! تم لوگ اس پر ہنس رہے ہو کہ اس کی پنڈلیاں پتلی ہیں؟ خدا کی قسم! میزان میں یہ اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ بھاری ہوں گی۔

معلوم ہوا کہ جسم کی موٹائی کا کوئی اعتبار نہیں ہے اگر اس میں عقل صحیح اور قلب صافی سکونت پذیر نہ ہو۔ ایک پرانا عربی مقولہ ہے: تَرَى الْفِتْيَانَ كَالنَّخْلِ، وَمَا يُدْرِيكَ

۵۔ متفق علیہ بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، دیکھیے: اللؤلؤ المرجان ۱۷۷۳۔

● مسند احمد ۷/۹۹، باختلاف الفاظ

مَا الدَّخْلُ. ان نوجوانوں کو تم بظاہر تو کھجور جیسا سمجھتے ہو لیکن تمھیں کیا معلوم کہ اس کے اندر کیا ہے۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کسی قوم کی ہجو کرتے ہوئے کہا تھا:

لَا بَأْسَ بِالْقَوْمِ مِنْ طُولٍ وَمِنْ قَصَرٍ جِسْمُ الْبِغَالِ وَأَحْلَامُ الْعَصَافِيرِ

اس قوم کے چھوٹے بڑے ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کے جسم خچروں جیسے مگر ان کی عقل وسمجھ چڑیوں جیسی ہے۔

● اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام جسمانی صحت اور قوت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ہرگز نہیں، وہ تو اس کی انتہائی حد تک اہتمام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کی اسی بنا پر تعریف کی ہے۔ فرمایا:

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرة ۲:۲۴۷)

اور اسے علمی اور جسمانی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

اور حدیث صحیح میں ہے کہ: إِنَّ لِبَدَنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا.[6] تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے۔

اسی طرح ارشاد ہے:

اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ[7] طاقت ور مسلمان اللہ کے ہاں کم زور مسلمان سے بہتر اور محبوب ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام جسمانی قوت اور بڑائی کو فضیلت کا معیار نہیں بناتا۔

پھر جس طرح کہ جسم کا موٹا ہونا اور اس کا طاقت ور ہونا مردانگی اور فضیلت کا معیار نہیں ہے اسی طرح کا معاملہ چہرے کی خوشنمائی اور حسن صورت کا بھی ہے۔ حدیث میں ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ وَلَا إِلَى صُوَرِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ[8]

اللہ تعالیٰ تمھارے جسموں اور صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دلوں کو دیکھتا ہے۔

۶۔ متفق علیہ بروایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ۔

۷۔ اسے امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۸۔ مسلم، بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۲۵۶۴۔

کسی شاعر نے عبدالملک بن مروان کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

يَأْتَلِقُ التَّـاجُ فَوْقَ مَفْرَقِهِ   عَلٰـى جَبِيْنٍ كَـأَنَّهُ الذَّهَبُ!

اس کے سر پر تاج سجا ہوتا ہے اور وہ اس کی سنہری جبین پر چمک رہا ہوتا ہے۔

تو اس نے شاعر پر ملامت کی کہ تم نے تو میری اس طرح تعریف کی ہے جیسے خوب صورت اور نرم و نازک لڑکیوں کی کرنی چاہیے۔ اور اس سے کہا کہ تم نے میری اس طرح تعریف کیوں نہ کی جس طرح کسی شاعر نے مصعب بن زبیر کی تعریف کی تھی۔ اس نے کہا تھا:

إِنَّمَا مُصْعَبٌ شِهَابٌ مِّنَ اللهِ   تَجَلَّتْ بِنُوْرِهِ الظَّلْمَاءُ

حُكْمُهُ حُكْمُ قُوَّةٍ لَيْسَ فِيْهِ   جَبَرُوْتٌ مِّنْهُ وَلَا كِبْرِيَاءُ

مصعب تو اللہ کے ستاروں میں سے ایک ستارا ہے، جس کی روشنی سے اندھیرے چھٹ گئے ہیں۔ اس کا فیصلہ قوت کا فیصلہ ہے مگر اس میں کوئی تکبر اور جبروت نہیں ہے۔

جی ہاں! مردوں کے جانچنے کا معیار ان کا علم، ایمان اور عمل ہوتا ہے۔

● اسلام اور احسان

یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ اسلام میں عمل اس کے حجم یا اس کی مقدار کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لحاظ سے ناپا جاتا ہے کہ اس میں احسان کتنا ہے اور اس میں پختگی کس قدر ہے۔

اسلام میں احسان کا مقام نفل کا نہیں بلکہ یہ ایک فریضہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر لازم کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ان پر روزے اور دوسرے فرائض لازم کر دیے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ.[9]

۹- اسے امام مسلم نے حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ۱۹۵۵۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے بارے میں احسان کو لازم کیا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کسی چیز کو قتل کرو تو احسن طریقے سے اور جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو وہ بھی اچھے طریقے سے۔ اپنی چھری کو خوب تیز کیا کرو اور جس جانور کو ذبح کرنا ہو اسے اذیت سے بچاؤ۔

یہاں لفظ کَتَبَ استعمال ہوا ہے اور اس کے بارے میں اصول یہ ہے کہ یہ وجوب اور فرضیت کے لیے آتا ہے۔ آپ ﷺ کا ایک ارشاد یہ بھی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ مِنَ الْعَامِلِ إِذَا عَمِلَ أَنْ يُحْسِنَ [10] اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ ایک عامل جب کوئی عمل کرے تو اسے احسن طریقے سے انجام دے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر عمل میں احسان کو لازم کیا ہے اور اسے واجب قرار دیا ہے اسی طرح وہ احسان کو بھی پسند فرماتا ہے اور صاحبِ احسان کو بھی۔

بلکہ قرآن تو مکلفین سے صرف عملِ حسن کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ انھیں عمل احسن کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاتَّبِعُوْا أَحْسَنَ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الزمر ۳۹:۵۵)

اور پیروی اختیار کرو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ o الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهُ (الزمر ۳۹:۱۷-۱۸)

پس بشارت دے دو میرے ان بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔

قرآن تو مخالفین کے ساتھ جدال کے لیے بھی طریق احسن کا حکم دیتا ہے:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ (النحل ۱۶:۱۲۵)

اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔

۱۰- اس حدیث کو بیہقی نے کلیب سے روایت کیا ہے اور صحیح الجامع الصغیر میں اسے حسن قرار دیا گیا ہے۔ ۱۸۹۱۔

وہ برائی کو احسن طریقے سے دفع کرنے کا حکم دیتا ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (حٰمٓ السجدة ۴۱:۳۴)

نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔

وہ یتیم کے مال کے قریب جانے سے بھی روکتا ہے سوائے اس کے کہ طریق احسن کے ساتھ ہو:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ (الأنعام ۶:۱۵۲)

مالِ یتیم کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ سنِ رشد کو پہنچ جائے۔

بلکہ قرآن نے آسمان، زمین، باقی کائنات اور موت وحیات کی تخلیق کا مقصد یہی بیان کیا ہے کہ مکلفین کو آزمایا جائے کہ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً (الکهف ۱۸:۷) [ان میں سے کون احسن عمل کرنے والا ہے] جیسا کی اس پر کتاب اللہ کی کئی آیات گویا ہیں۔ [دیکھیے: هود ۱۱:۷، الملك ۶۷:۲، الكهف ۱۸:۷] ان کے درمیان تسابق اور مقابلہ اس میں نہیں ہے کہ کون برا عمل کرتا ہے اور کون اچھا، بلکہ اصل مقابلہ اس بات میں ہوتا ہے کہ کون حسن [اچھا] عمل کرتا ہے اور کون احسن [زیادہ اچھا]۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک مسلمان فرد کا اصل کام ہی یہ ہو کہ وہ ہمیشہ احسن اور ارفع کی کوشش کرتا رہے۔حدیث میں ہے:

إِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ الْجَنَّةَ، فَاسْأَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ، فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الْجَنَّةِ، وَأَعْلَى الْجَنَّةِ، وَفَوْقَهُ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ.[11] جب تم اللہ سے جنت مانگو تو اس سے جنت الفردوس کی دعا کرو۔ یہ سب سے بہترین جنت ہے، یہ سب سے اعلیٰ ہے اور اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔

اور مشہور حدیث جبریل میں بھی ہے کہ جب جبریل نے نبی ﷺ سے احسان کے بارے میں سوال کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا:

۱۱-اسے امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب التوحید، باب: وکان عرشہ علی الماء، میں روایت کیا ہے۔ الفتح ۴۰۴/۱۳

اَلْإِحْسَانُ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ.[12] احسان یہ ہے کہ اللہ کی ایسی عبادت کرو، گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ یقیناً تمھیں دیکھ رہا ہے۔

یہ عبادت میں احسان کی تفسیر ہے، اور اس سے مراد ہے: ایسا مگن ہونا اور اس قدر اخلاص کا مظاہرہ کرنا کہ جیسے اللہ سامنے نظر آ رہا ہے۔

● اخلاص کی اہمیت

اللہ کے ہاں جو اعمال شرف قبولیت حاصل کرتے ہیں ان کی شکل وصورت اور ان کی تعداد نہیں دیکھی جاتی، بلکہ ان کی اصل حقیقت اور ان کی کیفیت دیکھی جاتی ہے۔کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک عمل ظاہری شکل کے لحاظ سے بالکل درست ہوتا ہے مگر اس میں وہ روح نہیں پائی جاتی جو اسے زندگی دیتی ہے، اس بنا پر نہ اس کا کوئی بدلہ اور ثواب ہوتا ہے اور نہ میزانِ قبولیت میں اسے رکھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (الماعون ۱۰۷:۴-۷)

ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنے نمازوں سے غافل رہتے ہیں اور جو ریاکاری کرتے ہیں۔

اور رسول اللہ ﷺ روزے کے بارے میں فرماتے ہیں:

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ، فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ أَنْ يَّدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ.[13] جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اس کا کھانا پینا چھوڑ دے۔

۱۲-متفق علیہ بروایت ابو ہریرہؓ، بحوالہ اللؤلؤ والمرجان ۵، اور مسلم نے اسے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے ۸۔

۱۳-اسے امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

اورفرمایا: رُبَّ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الْجُوعُ، وَرُبَّ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ إِلَّا السَّهَرُ [14] کئی بار ایک روزے دار کو اپنے روزوں کی وجہ سے اس کے سوا کچھ نہیں ملتا کہ وہ بھوکا رہے، اور کئی بار ایک قیام کرنے والے کو اپنے قیام کے بدلے میں اس کے سوا کچھ نہیں ملتا کہ وہ رَت جگا کرے۔

• اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ أُمِرُوٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَآءَ (البینۃ ۹۸:۵)

ان کو اسی بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کرتے رہیں، اللہ کے لیے دین کو خالص کر کے اور حنیف بن کر۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلٰى دُنْيَايُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ. [15] اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے بے شک ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس کی ہجرت اللہ کی خاطر ہو اس کی ہجرت اللہ کی طرف شمار ہوگی اور جس کی ہجرت حصول دنیا کے لیے یا کسی عورت سے شادی کرنے کی خاطر ہو تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف شمار

[14]-امام منذری الترغیب والترھیب میں کہتے ہیں کہ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے مگر الفاظ ان کے ہیں۔ نسائی، ابن خزیمہ [صحیح میں] اور حاکم نے بھی اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ بخاری کی شرطوں کے مطابق صحیح ہے۔ ابن خزیمہ اور حاکم کے الفاظ یہ ہیں: رُبَّ صَائِمٍ حَظُّهُ مِنْ صِيَامِهِ الْجُوعُ وَالْعَطَشُ، وَرُبَّ قَائِمٍ حَظُّهُ مِنْ قِيَامِهِ السَّهَرُ. کئی بار ایک روزہ کے حصے میں اپنے روزوں کے بدلے میں اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ وہ بھوکا اور پیاسا رہے اور کئی بار ایک قیام کرنے والے کے حصے میں اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ وہ رات کو نہ سو سکے۔ امام ذہبی نے حاکم کے ساتھ اتفاق کیا ہے مگر اس کی روایت میں العطش کا لفظ نہیں آیا۔ دیکھیے: صحیح ابن خزیمہ، تحقیق: الاعظمی ۲۳۲/۳ رقم: ۱۹۹۷۔

[15]-متفق علیہ بروایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔ یہ صحیح بخاری کی پہلی حدیث ہے۔

ہوگی جس کی خاطر اس نے ہجرت کی۔

یہی وجہ ہے کہ دین اسلام کے ماہرین نے اس حدیث کو بڑی اہمیت دی ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح کا آغاز اسی حدیث سے کیا ہے۔ بعض علما نے اسے ایک چوتھائی اور بعض نے ایک تہائی اسلام قرار دیا ہے۔ کیوں کہ نیت کا اعمال کی قبولیت میں بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس حدیث کو علما نے اعمال کے باطنی پہلو کے لیے ایک معیار قرار دیا ہے۔ جیسا کہ حدیث: مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ [16] [جس نے ایسا عمل کیا جس پر ہمارا حکم نہ ہو تو وہ رد ہے] یعنی اسے اس کے عامل پر لوٹایا جائے گا۔ یہ حدیث اعمال کے ظاہری پہلو کے لیے کسوٹی ہے۔

فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً (ھود ۱۱:۷) [تم میں سے کون ہے سب سے زیادہ حسن عمل والا] میں احسن العمل کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: احسن العمل وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ درست اور انتہائی درجے کا اخلاص والا ہو۔

پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ درست اور انتہائی درجے کا اخلاص والا ہونے سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کسی عمل کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک کہ وہ بیک وقت درست اور خالص نہ ہو۔ اگر وہ درست ہو مگر اخلاص کے ساتھ نہ ہو تو قبول نہیں ہوتا اور اگر خالص ہو مگر درست نہ ہو پھر بھی قبول نہیں ہوتا۔ عمل کا خلوص یہ ہے کہ وہ اللہ ہی کی خاطر ہو اور اس کا درست ہونا یہ ہے کہ وہ سنت کے مطابق ہو۔

دینی معاملات اور عبادت کے بارے میں احسن العمل کا یہ مطلب ہے۔

● اب رہا دنیوی امور میں احسان کا معاملہ تو وہ یہ ہے کہ اسے پختگی کے اس مقام تک پہنچا دیا جائے جس میں دوسرے لوگوں کے برابر ہو جائے بلکہ ان سے فوقیت حاصل کرے۔

[16]-اس حدیث کو امام مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے انھی الفاظ میں نقل کیا ہے۔ اور یہ متفق علیہ بھی روایت ہوئی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ. جس نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات گھڑ لی جو اس میں سے نہ ہو تو وہ مردود ہے۔

چنانچہ دنیا میں ان لوگوں کے سوا کسی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے جو پختگی سے کام کرنے والے ہیں۔

بعض احادیث جو اس مسئلے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو مسلم وغیرہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے:

مَنْ قَتَلَ وَزَغاً فِي أَوَّلِ ضَرْبَةٍ كُتِبَ لَهُ مِئَةُ حَسَنَةٍ، وفِي الثَّانِيَةِ دُونَ ذٰلِكَ، وَفِي الثَّالِثَةِ دُونَ ذٰلِكَ [17-1] جس نے چھپکلی کو پہلے ہی وار میں مار ڈالا اس کے لیے سو نیکیاں ہیں اور جس نے دوسرے وار میں مارا اس کے لیے اس سے کم اور جس نے تیسرے وار میں، اس کے لیے اس سے بھی کم۔

یہ حدیث بھی اسی بات کی طرف رہنمائی کر رہی ہے کہ ہر کام میں مہارت اور پختگی کے ساتھ ساتھ حسن ادا کا خیال رکھنا چاہیے، خواہ چھپکلی کو مارنے جیسا ایک چھوٹا سا معاملہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ہے قتل میں احسان کا مطلب، جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ جب کسی جانور کو قتل کرنا ہو تو اچھے طریقے سے قتل کرو۔

کسی چیز کو سرعت کے ساتھ قتل کرتے ہیں تو اس میں اس کو اذیت نہیں ہوتی، خواہ وہ کوئی بھی جانور ہو۔

● زندگی کا معیار

پھر جس طرح کہ اعمال کمیت اور حجم سے نہیں ناپے جاسکتے اسی طرح لوگوں کی عمریں بھی لمبائی سے نہیں ناپی جاسکتیں۔ بعض اوقات ایک انسان کو لمبی عمر دی جاتی ہے لیکن اس میں کوئی برکت نہیں ہوتی۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عمر زیادہ لمبی نہیں ہوتی مگر وہ اعمال الخیر اور خیر الاعمال سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔

17-1 اسے امام احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۶۴۶۰۔ مزید دیکھیے ہماری کتاب المنتقی من الترغیب و الترھیب، اور حدیث ۱۸۱۱ پر ہمارا حاشیہ۔

اسی حوالے سے ابن عطاء اللہ اپنی پر حکمت باتوں میں کہتے ہیں: بعض عمریں لمبی ہوتی ہیں مگر ان کے فوائد کم ہوتے ہیں اور بعض عمریں مختصر ہوتی ہیں مگر ان کے فوائد زیادہ ہوتے ہیں۔ جس کی عمر میں برکت ڈالی جاتی ہے وہ تھوڑے عرصے میں اللہ کی بہت سی نعمتیں حاصل کرتا ہے۔ اتنی زیادہ کہ جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا اور اشارات تو اس کی گرد پا تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔

اس سلسلے میں ہمارے لیے اتنی ہی مثال کافی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اللہ نے برکت ڈالی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کے عرصے میں، جو رسالت کی زندگی ہے، ایک عظیم ترین دین کی بنیاد ڈال دی اور ایک بہترین نسل تیار کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خیر امت کی تخلیق کی اور ایک عادلانہ نظام حکومت کی بنیاد رکھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافرانہ نظام بت پرستی اور حد سے بڑھتی ہوئی یہودیت پر غلبہ حاصل کیا اور اپنی امت کے لیے کتاب اللہ کے بعد ایک سنت ہادیہ اور سیرتِ جامعہ بھی میراث چھوڑی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ڈھائی سال میں جھوٹے مدعیانِ نبوت کا قلع قمع کیا، فتنہ ارتداد کا شکار ہونے والوں کو دوبارہ اسلام کے دائرے میں داخل کیا۔ جنھوں نے بعد میں فارس اور روم کی فتح میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ انھوں نے مانعینِ زکوٰۃ کو سبق سکھایا اور فقرا کے ان حقوق کی حفاظت کی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مال داروں کے مال میں مقرر کیے ہیں۔ اس طرح انھوں نے تاریخ میں یہ بات رقم کی کہ اسلامی حکومت وہ پہلی حکومت ہے جس نے غریبوں کے حقوق کی جنگ لڑی۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے دس سال کی عمر میں بیرونی فتوحات بھی حاصل کیں اور اندرونی طور پر عدل وانصاف اور شوریٰ کی بنیادیں بھی مستحکم کیں۔ آپ نے اپنے بعد والوں کے لیے بہت ہی شان دار طریقے وضع کیے جنھیں 'اوّلیاتِ عمرؓ' کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اجتماعی فقہ واجتہاد کی بنیاد رکھی، خصوصاً اس فقہ کی جس کا تعلق ریاست اور حکومت کے ساتھ ہے اور جس کا قیام مقاصد شرع اور مصالح کے مابین موازنہ اور باہمی تکافل پر ہے۔

آپ ﷺ نے لوگوں کو یہ جرأت بخشی کہ وہ حکمران کو نصیحت اور اس پر تنقید کریں۔ فرمایا:
لَا خَیْرَ فِیْکُمْ إِذَا لَمْ تَقُوْلُوْهَا، وَلَا خَیْرَ فِیْنَا إِذَا لَمْ نَسْمَعْهَا اگر تم بات نہ کہو تو تم کسی کام کے نہیں ہو اور اگر ہم نہ سنیں تو ہم کسی کام کے نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ انھیں دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان میں حق کی قوت موجود تھی اور وہ سارے لوگوں کے درمیان عدل اور مساوات قائم کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے مختلف صوبوں کے گورنروں اور اپنے بیٹوں تک کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا اور مظلوم کو انصاف دلایا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تیس ماہ کے عرصے میں، جو ان کی ساری مدتِ خلافت ہے، عدل اور ہدایت کی سنتوں کو دوبارہ زندہ کیا، ان کے ذریعے ظلم وجور اور گمراہی کی بدعتوں کو ختم کیا۔ انھوں نے لوگوں کی غصب شدہ جائدادیں دوبارہ ان کو لوٹائیں اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کی، یہ وہ اقدامات تھے جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اسلام کا اعتماد بحال ہوا۔ لوگوں کی جانیں محفوظ ہوگئیں، بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوا، مسلمان شہروں میں خوشحالی آئی اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ صاحب مال اس لیے پریشان ہوتا تھا کہ اپنی زکوٰۃ کس کو دے، کیوں کہ لوگ سارے مال دار تھے اور زکوٰۃ کا مستحق فقیر نہیں ملتا تھا۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے ۵۴ سال کی عمر پائی [۱۵۰-۲۰۴ھ] اور اپنے پیچھے علم وفکر کے یہ عظیم الشان بنیادی خزانے چھوڑے۔

امام غزالی رحمہ اللہ ۵۵ سال دنیا میں زندہ رہے [۴۵۰-۵۰۵ھ] اور امت کے لیے یہ عظیم اور بیش بہا علمی سرمایہ چھوڑا۔

امام نووی رحمہ اللہ کی عمر وفات کے وقت ۴۵ سال تھی [۶۳۱-۶۷۶ھ] مگر اس عرصے میں انھوں نے حدیث اور فقہ میں **أربعین** سے لے کر **شرح مسلم** تک اور **المنهاج فی الفقه** سے لے کر **روضة الطالبین** اور **المجموع** تک وہ سرمایہ دنیا کو پیش کیا جس سے اللہ تعالیٰ نے

پوری اُمت کو نفع پہنچایا۔ اس کے علاوہ ان کی کتابوں میں **تهذيب الأسماء واللغات** بھی ہے۔

ان کے علاوہ اور بہت سے ائمہ کرام جیسے: ابن العربی، سرخسی، ابن الجوزی، ابن قدامہ، قرافی، ابن تیمیہ، ابن قیم، شاطبی، ابن خلدون، ابن حجر، ابن الوزیر، ابن ہمام، سیوطی، دہلوی اور شوکانی وغیرہ نے زمین کو علم وفضل سے بھر دیا۔

بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جو موت سے پہلے ہی مرجاتے ہیں اور اس کی عمر ختم ہوجاتی ہے حالانکہ اس کا شمار زندوں میں ہوتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو موت کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ وہ اپنے پیچھے نیک اعمال، علمِ نافع، نیک اولاد اور اچھے شاگرد چھوڑ جاتے ہیں جو ان کی عمر میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اور ان کی عمر لمبی سے لمبی ہوتی جاتی ہے۔

❖❖❖

۴

علم وفکر میں ترجیحات

12/11/15

عمل پر علم کی ترجیح

شرعی طور پر اہم ترین ترجیحات میں سے ایک یہ ہے کہ علم عمل پر مقدم ہے۔ کیوں کہ علم پہلے ہوتا ہے اور عمل بعد میں۔ علم عمل کا رہنما اور مرشد ہوتا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ: اَلْعِلْمُ إِمَامٌ وَّالْعَمَلُ تَابِعُهُ۔[1] علم امام ہے اور عمل اس کا مقتدی۔

یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب العلم میں ایک باب کا عنوان رکھا ہے: بَابٌ اَلْعِلْمُ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ [علم قول اور عمل پر مقدم ہے]۔

بخاری کے شارحین کہتے ہیں کہ اس سے امام بخاری کا مطلب یہ ہے کہ قول اور عمل کی صحت کے لیے علم شرط ہے۔ یہ دونوں اس کے بغیر معتبر نہیں ہیں۔ اس لیے یہ ان پر مقدم ہے۔ یہاں تک کہ یہ اس نیت کی بھی تصحیح کرتا ہے جو عمل کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ شراح بخاری کہتے ہیں کہ امام بخاری نے اسی کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے تاکہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ عمل کے بغیر علم کا کوئی فائدہ نہیں ہے تو اس سے کسی کے ذہن میں یہ شبہہ پیدا نہ ہو کہ علم کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اور اس کی طلب کی کوئی ضرورت نہیں۔

امام بخاری نے اپنی بات کی دلیل کے طور پر وہ احادیث اور آیات ذکر کی ہیں جو ان کے مدعا پر دلالت کر رہی تھیں۔

۱- اس حدیث کو ابن عبدالبر وغیرہ نے مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح سے روایت کیا ہے۔ درست یہی ہے کہ یہ موقوف ہے۔ (مؤلف) علمائے حدیث کی اصطلاح میں مرفوع سے مراد وہ حدیث ہوتی ہے جس کی روایت صحابی نے نبی ﷺ تک پہنچائی ہو اور موقوف وہ جس میں اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت نہ کی ہو۔ (مترجم)

آیات میں سے ایک یہ ہے:

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ.

(محمد ۴۷:۱۹)

جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اپنے گناہوں کی بخشش مانگو اور مومنین اور مومنات کے گناہوں کی بھی۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو سب سے پہلے علم توحید کا حکم دیا ہے اور اس کے بعد استغفار کی تاکید کی ہے جو کہ ایک عمل ہے۔ اور یہاں خطاب اگرچہ نبی ﷺ سے ہے مگر ساری امت اس خطاب میں شامل ہے۔

دوسری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر ۳۵:۲۸)

یقیناً اللہ کے بندوں میں اس سے ڈرنے والے وہی ہیں جو علم رکھتے ہوں۔

وہ علم ہی ہے جو ایک انسان میں خشیت کی صفت کو پروان چڑھاتا ہے اور اس کی وجہ سے آدمی عمل پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

احادیث میں سے ایک یہ ہے کہ مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ[2] اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ سمجھے گا تو عمل کرے گا اور صحیح عمل کرے گا۔

● علم کی عمل پر ترجیح کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی وحی جو نازل ہوئی وہ اقرأ تھی [یعنی پڑھ]، اور قرأت علم کی کنجی ہے۔ عمل کے احکام اس کے بعد نازل ہوئے، جیسے:

يٰٓأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ (المدثر ۷۴:۱-۴)

اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! اٹھو اور خبردار کرو، اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو،

۲- دیکھیے: صحیح بخاری، مع فتح الباری، ج ۱/ ۱۵۹-۱۶۲۔ طبع: دار الفکر۔

اور اپنا دامن صاف رکھو۔

● علم ایک ترازو ہے

پھر علم اس وجہ سے بھی عمل پر مقدم ہے کہ یہ اعتقادات میں حق اور باطل کے درمیان، اقوال میں صحیح اور غلط کے درمیان، عبادات میں سنت اور بدعت کے درمیان، معاملات میں صحیح اور فاسد کے درمیان، افعال میں حلال وحرام کے درمیان، اخلاق میں اچھے اور برے کے درمیان، معیارات میں مقبول اور مردود کے درمیان اور اقوال واعمال میں راجح اور مرجوح کے درمیان تمیز کرتا ہے۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے علمائے سابقین میں اکثر مصنفین اپنی کتابوں کا آغاز کتاب العلم سے کرتے ہیں۔ جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی دو کتابوں إحياء علوم الدين اور منهاج العابدين میں کیا ہے۔ یہی طریقہ حافظ منذری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الترغيب والترهيب میں بھی اپنایا ہے۔ انھوں نے نیت، اخلاص اور اتباع کتاب وسنت کی احادیث ذکر کرنے کے آغاز کتاب العلم ہی سے کیا ہے۔

● علم کے بغیر عمل کے نقصانات

ترجیحات کا مسئلہ، جس کے بارے میں ہم گفت گو کر رہے ہیں اس کی اصل بنیاد بھی علم ہی پر ہے۔ اسی کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس کا حق مقدم ہے اور کس کو مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہمیں اس چیز کا علم نہ ہو تو پھر ہم اپنے موضوع کے بارے میں اندھیرے میں تیر چلائیں گے۔

خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے کیا ہی خوب صورت بات کہی ہے:

مَنْ عَمِلَ فِي غَيْرِ عِلْمٍ كَانَ مَا يُفْسِدُ أَكْثَرَ مِمَّا يُصْلِحُ.[3] جو شخص علم کے بغیر عمل

۳- دیکھیے: جامع بيان العلم وفضله، ابن عبد البر ۱: ۲۷، طبع: دار الكتب العلمية، بيروت۔

کرتا ہے وہ اصلاح سے زیادہ فساد کرے گا۔

● یہ بات ان بعض مسلمانوں کے طرزِ عمل سے واضح ہے جن میں تقویٰ، اخلاص اور شجاعت کی کمی نہیں تھی مگر ان میں شریعت کے مقاصد اور دین کے حقائق کے بارے میں علم وفہم کی کمی تھی۔ یہی صفات خوارج کے اندر پائی جاتی تھیں جنھوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت، غلبۂ دین میں ان کی خدمات اور رسول اللہ ﷺ سے نسب، رشتہ داری اور محبت میں ان کے قرب کے باوجود انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خون بہانا بھی جائز سمجھا اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے مسلمانوں کا بھی۔ اور وہ اس کے ذریعے اللہ کے قریب ہونا چاہتے تھے۔

● وہ ایسے ہی لوگوں کا تسلسل تھا جن میں سے ایک نے کسی موقع پر نبی ﷺ کی مالِ غنیمت کی تقسیم پر اعتراض کیا تھا۔ اس نے جہالت اور بے وقوفی کے ساتھ نبی ﷺ سے کہا تھا: اِعْدِلْ. [عدل سے کام لو]۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

وَيْلَكَ! وَمَنْ يَعْدِلُ إِذَا لَمْ أَعْدِلْ؟ قَدْ خِبْتَ إِذَنْ وَخَسِرْتَ إِنْ لَمْ أَكُنْ أَعْدِلُ.

ارے کم بخت! اگر میں عدل نہ کروں تو اور کون کرے گا؟ اگر میں نے عدل نہ کیا تو تُو یقیناً خائب وخاسر ہو جائے گا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ اس تندخو اور اجڈ آدمی نے آپ ﷺ سے کہا تھا: يَا رَسُولَ اللهِ! اِتَّقِ اللهَ. اے اللہ کے رسول! اللہ سے ڈرو۔

آپ ﷺ نے فرمایا: أَوَلَسْتُ أَحَقَّ أَهْلِ الْأَرْضِ أَنْ يَتَّقِيَ اللهَ؟ کیا اہل زمین میں کوئی ایسا بھی ہے جو مجھ سے زیادہ اللہ کا تقویٰ رکھتا ہو؟

اس نے اور اس طرح کے لوگوں کو تالیفِ قلوب کی پالیسی سمجھ نہیں آئی تھی جو اُمت کے لیے بہت بڑے مصالح لانے والی تھی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت اپنی کتاب میں دی ہے

اور اس مد میں زکوٰۃ وصدقات خرچ کرنا بھی جائز ٹھہرایا ہے، تو غنیمت اور فے میں اس پر اعتراض کا کسی کو کیا حق بنتا ہے۔

پھر جب بعض صحابہ کرام نے اس منہ زور آدمی کو قتل کرنے کی اجازت مانگی تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں روکا اور یہ پیشین گوئی فرمائی کہ اسی طرح کا ایک گروہ ظہور پذیر ہوگا جن کی صفات یہ ہوں گی: تم ان کی نمازوں کے مقابلے میں اپنی نمازیں، ان کے روزوں کے مقابلے میں اپنے روزے اور ان کے عمل کے مقابلے میں اپنے عمل کو حقیر جانو گے۔ وہ قرآن کو پڑھتے ہوں گے مگر قرآن ان کے گلے سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین سے ایسے نکلیں گے جیسا کہ تیر کمان سے نکلتا ہے۔

’قرآن ان کے گلے سے نیچے نہیں اترے گا‘ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے دلوں میں جگہ نہیں بنائے گا نہ ان کی عقل اس کے نور سے منور ہوگی۔ وہ اس کی تلاوت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کریں گے، اگرچہ یہ بہت نماز روزے ادا کرتے ہوں گے۔

ان کی صفات میں ایک یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ اہل اسلام کے خلاف جنگ کریں گے اور ان کو مشرک کہیں گے۔[۴]

ان لوگوں کے دلوں یا ان کی نیتوں میں فتور نہیں تھا بلکہ ان کی عقل وفہم میں کمی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری حدیث میں ان کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ حُدَثَاءُ الْأَسْنَانِ، سُفَهَاءُ الْأَحْلَامِ۔[۵] ان کے دانت نئے نئے نکلے ہیں اور ان کے خیالات بے وقوفوں جیسے ہیں۔

ان کا علم تھوڑا اور ان کی سمجھ کم تھی اس وجہ سے انھوں نے کتاب اللہ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا، باوجود اس کے کہ وہ اسے روانی سے پڑھتے تھے۔ مگر یہ سمجھ کے بغیر تلاوت تھی۔ یا پھر انھوں نے اسے غلط انداز میں سمجھا تھا۔ ان کی سمجھ اس مفہوم کے خلاف تھی جو اس کے نازل

۴- ان کی تفصیلی صفات اللؤلؤ والمرجان ۶۳۸-۶۴۴ میں حدیث جابر، ابوسعید، علی اور سہل بن حنیف میں دیکھیں۔

۵- دیکھیے حدیث علیؓ، حوالہ ایضاً۔

کرنے والے کے ہاں تھا۔

اسی وجہ سے امامِ جلیل حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت تک عبادت اور عمل میں غلو سے بچنے کی تاکید کی ہے جب تک کہ آدمی علم وفقہ کے قلعے میں بند نہ ہو۔ اس کے بارے میں انھوں نے اپنا انتہائی بلیغ کلام ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

اَلْعَامِلُ عَلٰی غَیْرِ عِلْمٍ کَالسَّائِرِ عَلٰی غَیْرِ طَرِیْقٍ، وَالْعَامِلُ عَلٰی غَیْرِ عِلْمٍ یُفْسِدُ اَکْثَرَ مِمَّا یُصْلِحُ، فَاطْلُبُوا الْعِلْمَ طَلَبًا لَا یَضُرُّ بِالْعِبَادَةِ، وَاطْلُبُوا الْعِبَادَةَ طَلَبًا لَا یَضُرُّ بِالْعِلْمِ. فَإِنَّ قَوْمًا طَلَبُوا الْعِبَادَةَ وَتَرَکُوا الْعِلْمَ، حَتّٰی خَرَجُوْا بِأَسْیَافِهِمْ عَلٰی أُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، وَلَوْ طَلَبُوا الْعِلْمَ لَمْ یَدُلَّهُمْ عَلٰی مَا فَعَلُوْا[6] علم کے بغیر عمل کرنے والا ایسا ہے جیسے غلط راستے پر چلنے والا۔ جو شخص علم کے بغیر عمل کرتا ہے وہ اصلاح سے زیادہ فساد کرتا ہے۔ علم کی طلب اتنی ہو جو عبادت کے لیے نقصان دہ نہ ہو اور عبادت ایسی ہو جو علم کے لیے مضر نہ ہو۔ ایک قوم نے عبادت کو اپنایا اور علم کو ترک کیا تو وہ تلوار لے کر امت محمد ﷺ کے خلاف بغاوت کر گئی۔ اگر انھوں نے علم حاصل کیا ہوتا تو وہ انھیں اس کام کا حکم نہ دیتا جو انھوں نے کیا۔

● قیادت اور علم

یہیں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہر قسم کی قیادت کے لیے علم شرط ہے، خواہ وہ سیاسی اور انتظامی قیادت ہو، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کی قیادت، کہ جب ان سے شاہِ مصر نے کہا:

إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ (یوسف ۱۲:۵۴)

اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور ہمیں آپ کی امانت پر پورا بھروسا ہے۔ تو انھوں نے کہا:

۶- یہ قول ابن قیمؒ نے مفتاح دار السعادہ ص ۸۲ میں نقل کیا ہے۔

اِجْعَلْنِي عَلٰى خَزَآئِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ (یوسف ۱۲:۵۵)

ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔

اس میں آپ علیہ السلام نے اپنی خاص اہلیتوں کے بارے میں بتایا جو آپ علیہ السلام کو اس عظیم کام کا اہل ثابت کر رہی تھیں، جس میں اس دور کے مطابق مالی اور اقتصادی امور، زراعت، منصوبہ بندی اور رسد کے انتظامات شامل تھے۔ ان اہلیتوں میں بنیادی حیثیت دو امور کی تھی۔ ایک حفاظت یعنی امانت، اور دوسرا علم۔ یہاں علم سے مراد تجربہ اور کافی معلومات ہیں۔

یہ دونوں صفات سورۂ قصص میں شیخ کبیر کی بیٹی کی زبان سے نکلی ہوئی صفات کے موافق ہیں جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملازم کے طور پر رکھنے کے لیے اپنے باپ کو بتائی تھیں۔ اس نے کہا تھا:

إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ (القصص ۲۸:۲۶)

بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھ لیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔

پھر یہی معاملہ فوجی قیادت کے بارے میں بھی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے طالوت کو بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر بادشاہ مقرر کیا تو اس کی وجہ یہ بتائی:

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرة ۲:۲۴۷)

اللہ نے تمھارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں۔

● کارِ قضا اور علم

یہی معاملہ عدالتی امور کا بھی ہے۔ حتیٰ کہ قاضی کے لیے بھی وہی شرط لگائی ہے جو خلیفہ کے لیے مقرر ہے، اور وہ یہ کہ وہ مجتہد ہو۔ یہاں اس بات پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ وہ محض دوسروں کا مقلد ایک عالم ہو۔ علم کی اصل حقیقت یہ ہے کہ آدمی حق کو دلیل کے ساتھ پہچانے، نہ کہ انسانوں میں سے کسی زید یا عمرو کے ساتھ موافقت کو اپنے اوپر لازم سمجھ کرے۔ جس نے کسی دلیل

کے بغیر یا کسی بھونڈی دلیل کے ساتھ اپنے جیسے ایک انسان کی پیروی کی تو یہ علم نہیں بلکہ جہالت ہے۔

مقلد کی قضا کو ضرورتاً قبول کیا گیا ہے جیسا کہ اس شخص کی ولایت کو ضرورتاً قبول کیا گیا ہے جو فقاہت نہ رکھتا ہو۔ اس کے باوجود علم کی ایک حد مقرر ہے کہ کم از کم اتنا علم اس میں ضرور ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ جہالت کے ساتھ فیصلے کرے گا اور آگ والوں میں سے بن جائے گا۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ: اِثْنَانِ فِي النَّارِ، وَوَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ. رَجُلٌ عَلِمَ الْحَقَّ فَقَضٰى بِهٖ فَهُوَ فِي الْجَنَّةِ، وَرَجُلٌ قَضٰى لِلنَّاسِ عَلٰى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ، وَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَجَارَ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ.[7] قاضی تین قسم کے ہیں: ان میں سے دو آگ میں جائیں گے اور ایک جنت میں۔ ایک وہ شخص جس نے حق کو پہچانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا تو وہ جنت میں ہوگا۔ دوسرا وہ شخص جو جہالت کے ساتھ لوگوں کے فیصلے کرتا ہے یہ آگ میں ہوگا اور تیسرا وہ ہے جو حق کو پہچانے لیکن ظلم کرتے ہوئے غلط فیصلہ دے تو یہ بھی آگ میں ہوگا۔

• مفتی کے لیے علم کی ضرورت

قضا کی طرح فتویٰ کا معاملہ بھی ہے۔ چنانچہ جائز نہیں ہے کہ ایک ایسے عالم کے علاوہ کوئی شخص لوگوں کو فتویٰ دے جسے اپنے علم پر قدرت ہو اور اسے دین کی سمجھ حاصل ہو۔ ورنہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرے گا، واجبات کو ساقط کرے گا یا لوگوں پر ایسی باتیں لازم کرے گا جو اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم نہیں کی ہیں۔ وہ بدعات کو درست قرار دے گا اور جائز امور کو بدعت

۷- اس حدیث کو اصحاب سنن میں سے چار اور حاکم نے بریدہؓ ہی سے روایت کیا ہے۔ طبرانی، ابویعلیٰ اور بیہقی نے اسے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۴۴۴۶، ۴۴۴۷

گردانے گا۔ وہ اہل ایمان کی تکفیر کرے گا اور کافروں کے کفر کو وجہ جواز فراہم کرے گا۔ یہ ساری چیزیں یا ان میں اکثر کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ آدمی میں علم وفقہ کی کمی ہو۔ خاص طور پر یہ بات کہ آدمی فتویٰ دینے پر جری ہوتا ہے یا اس کی حرمت کو پامال کرتا ہے یا ہر کس ناکس کو اس کی اجازت دیتا ہے تو اس کی وجہ علم ہی کی کمی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم اپنے دور میں دیکھ رہے ہیں، جس میں دین ایک بازیچہ اطفال بنا ہوا ہے کہ جو چاہے اس کے بارے میں رائے زنی کرے۔ جو کچھ نہ کچھ بول سکتا ہو یا کچھ لکھ سکتا ہو تو وہ دین کے بارے میں کہنا اور لکھنا شروع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن وسنت اور سلف صالحین نے اس کے بارے میں شدت کے ساتھ تاکید کی ہے کہ اس کی شروط اور اہلیتوں کے بغیر دین میں رائے زنی نہ کی جائے۔ اور وہ شروط بھی ایسی ہیں کہ انھیں اپنے اندر جمع کرنا اور ان کی پوری پوری قدرت حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

• علم کے بغیر فتویٰ

رسول اللہ ﷺ نے اس شخص پر شدت کے ساتھ نکیر فرمائی ہے جس نے آپ ﷺ کے دور میں فتویٰ دینے میں جلد بازی سے کام لیا تھا۔ اس نے ایک شخص کو جو زخمی تھا اور اسے جنابت لاحق ہوگئی تھی، فتویٰ دیا تھا کہ اس پر غسل کرنا لازم ہے۔ اس نے اس بات کا کوئی خیال نہیں رکھا تھا کہ اس کو زخم ہے۔ اس سے وہ آدمی فوت ہوگیا تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

قَتَلُوْهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ! أَلَا سَأَلُوْا إِذْ لَمْ يَعْلَمُوْا، فَإِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ، إِنَّمَا يَكْفِيهِ أَنْ يَتَيَمَّمَ......[8] اسے اپنے ساتھیوں نے ہلاک کیا ہے اللہ انھیں ہلاک کرے۔ جب انھیں علم نہیں تھا تو کسی سے پوچھا کیوں نہیں۔ مرض جہل کا علاج یہ ہے کہ پوچھا جائے۔ اس کے لیے تیمم ہی کافی تھا۔

۸- اس حدیث کو ابوداؤد نے حضرت جابرؓ سے اور احمد، ابوداؤد اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے: دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۴۳۶۲، ۴۳۶۳

دیکھیں کہ نبی ﷺ نے کس طرح ان کے فتویٰ کو اس شخص کے قتل کے مترادف ٹھہرایا اور انھیں ان الفاظ میں بددعا دی: قَتَلَهُمُ اللّٰهُ [اللہ انھیں ہلاک کرے]۔ معلوم ہوا کہ جہالت کا فتویٰ کبھی ہلاک کرے گا اور کبھی تخریب کا ذریعہ بنے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ابن قیمؒ وغیرہ نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ کوئی شخص علم کے بغیر دین میں فتویٰ دینے کا مجاز نہیں۔ اسے انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ضمن میں لیا ہے:

وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (الأعراف ۷: ۳۳)

اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمھیں علم نہ ہو۔

انھوں نے اس کے بارے میں احادیث، آثارِ صحابہ اور سلف کے اقوال بھی ذکر کیے ہیں جن سے نام نہاد مفتیوں، طفلانِ مکتب اور نیم ملاؤں کے لیے راستہ بند ہوگیا ہے۔

علامہ ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی جاہل مرے وہ اس سے بہتر ہے کہ وہ بے علمی کی حالت میں کوئی فتویٰ دے۔

ابو حصین اشعریؒ فرماتے ہیں کہ تم میں سے ایک شخص کسی مسئلے میں بے دھڑک فتویٰ دیتا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اگر یہ مسئلہ حضرت عمرؓ کو پیش آتا تو وہ اس کے لیے بدری صحابہ کو جمع کرتے۔

اگر اشعری بے چارے ہمارے دور کو دیکھتے تو پتہ نہیں ان کے دل پر کیا گزرتی۔

● فتویٰ کے بارے میں صحابہ کرامؓ کا رویہ

حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: جس نے ہر اس مسئلے میں فتوی دیا جو لوگوں نے اس سے پوچھا تو وہ دیوانہ ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں: اگر میں وہ بات کہوں جو مجھے معلوم نہ ہو تو کون سا آسمان ہوگا جو مجھ پر سایہ کرے اور کون سی زمین ہوگی جو مجھے پناہ دے گی۔

اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اس بات سے میرا سینہ ٹھنڈا ہوتا ہے — یہ بات انھوں نے تین بار دہرائی — کہ آدمی سے ایک مسئلہ پوچھا جائے اور وہ اسے معلوم ہو مگر وہ کہے کہ اَللّٰهُ أَعْلَمُ [اللہ بہتر جانتا ہے]۔

سید التابعین حضرت سعید بن مسیبؒ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جب کوئی فتویٰ دیتے تو یہ ضرور کہتے: اَللّٰهُمَّ سَلِّمْنِي، وَسَلِّمْ مِنِّي[9] اے اللہ! مجھے بھی محفوظ فرما اور مجھ سے بھی لوگوں کو محفوظ فرما۔

یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ فتویٰ دینا ایک حساس معاملہ ہے۔ اور اس کا اہل بننے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی علمِ راسخ کے اسلحے سے مسلح ہو، اس کا فکری افق وسیع ہو اور اس کے ساتھ اس میں وہ پرہیزگاری بھی ہو جو اسے اپنے نفس یا دوسرے لوگوں کی خواہشات کی پیروی سے بچا سکے۔

● بعض مغرور مفتی

اس مقام پر آ کر آدمی کو علمِ شریعت کے طالب علم ایسے نوجوانوں پر — جو اکثر اوقات اس میدان میں نووارد ہوتے ہیں — بجا طور پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ نازک سے نازک اور حساس سے حساس مسائل میں پوری تعلّی کے ساتھ بے دھڑک فتوے صادر کرتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے علما پر بھی دست درازی کرتے ہیں بلکہ ائمہ عظام اور صحابہ کرام پر بھی تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔ وہ بڑے غرور کے ساتھ نتھنے پھلا کر کہتے ہیں: هُمْ رِجَالٌ وَنَحْنُ رِجَالٌ! [وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں]۔

ایسے لوگوں کے لیے سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی حیثیت پہچانیں، پھر مقاصد شریعت میں فقاہت کا مقام حاصل کریں اور زمینی حقائق کو سمجھیں۔ لیکن ان کا غرور

۹- دیکھیے: إعلام الموقعين، ابن قیمؒ [۲/۱۶۵-۱۶۸]، طبع: السعادة، تحقیق: محیی الدین عبدالحمید۔

ان کے راستے کی ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ

• داعی اور معلم کے لیے علم کی ضرورت

جب قضا اور فتویٰ کے لیے علم ضروری ہے تو دعوت و تربیت کے لیے اس کی ضرورت بھی مسلم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ أَدْعُوْٓا إِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف ۱۰۸:۱۲)

تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔

پس ہر داعی الی اللہ جو رسول اللہ ﷺ کا پیروکار ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی دعوت بصیرت کے ساتھ ہو۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی دعوت سے پوری طرح آگاہ ہو۔ جس چیز کی طرف وہ دعوت دے رہا ہو اسے اس نے خوب سمجھا ہو۔ اسے معلوم ہو کہ وہ کس چیز کی طرف دعوت دے رہا ہے، کس کو دے رہا ہے، کیوں دے رہا ہے اور کیسے دے رہا ہے؟•

اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ربانی اس کو کہتے ہیں جو خود جانتا ہو، اس پر عمل کرتا ہو اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہو۔ اسی کی طرف اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں کہ:

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ. (آل عمران ۷۹:۳)

لیکن تم سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ربانی کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ وہ علما اور فقہا ہوں۔[10]

۱۰- اس قول کو امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب العلم میں تعلیقاً ذکر کیا ہے اور حافظ نے الفتح میں کہا ہے کہ اسے ابن ابی عاصم نے متصلاً ذکر کیا ہے اس کی سند حسن ہے اور خطیب نے اسے ایک اور سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور وہ بھی حسن ہے۔

• ان چاروں سوالوں کا تفصیلی جواب مترجم کی دوسری ترجمہ کردہ کتاب اصول دعوت از ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، مطبوعہ البدر پبلی کیشنز، لاہور میں موجود ہے۔ مؤلف کا یہ فقرہ اسی کتاب کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ (مترجم)

کہا جاتا ہے کہ ربانی وہ ہوتا ہے جو لوگوں کی تربیت کرتا ہے بڑے علم سے پہلے چھوٹے علم کے ساتھ۔ چھوٹے علم سے مراد واضح مسائل ہیں اور بڑے علم سے مراد دقیق مسائل ہیں۔

کسی نے یہ کہا ہے کہ ربانی سے مراد ہے: وہ شخص جو لوگوں کو کلیات سے پہلے جزئیات، یا اصولوں سے پہلے فروع، یا نتائج سے پہلے ان کے اسباب سکھاتا ہے۔[11]

اس سے مراد تعلیم میں تدریج، متعلمین کی حالت اور ان کی سطح استفادہ کا لحاظ اور ان کو ایک درجے سے دوسرے درجے کی طرف اٹھاتے چلے جانا ہے۔

دعوت اور تعلیم کے میدان میں علم کے ذریعے جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں ان میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ معلم لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرے، انھیں مشکل میں نہ ڈالے، انھیں خوش خبری سنائے، اور انھیں متنفر نہ کرے۔ جیسا کہ ایک متفق علیہ حدیث میں آیا ہے:

يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا، وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا.[12] آسانی پیدا کرو، مشکل میں نہ ڈالو، خوشخبری سناؤ متنفر نہ کرو۔

اس حدیث کی تشریح میں حافظ ابن حجر کہتے ہیں: اس سے مراد نو مسلموں کی تالیفِ قلب اور ابتدا میں اس کے بارے میں عدم تشدد ہے۔ اسی طرح اس سے مراد گناہوں سے روکنا بھی ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ کام تدریج کے ساتھ ہو۔ کیوں کہ ایک کام جب ابتدا میں آسان ہو تو پہلے داخل ہونے والے کے لیے اس میں دل چسپی ہوتی ہے، اور وہ اسے خوشی سے قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ اکثر اوقات یہ نکلتا ہے کہ اس کی دل چسپی مزید بڑھتی ہے۔ لیکن اگر اس کے برعکس معاملہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ بھی برعکس نکلتا ہے۔[13]

یہ تیسیر صرف نو مسلموں تک محدود نہیں ہے، جیسا کہ حافظ کی بات سے مفہوم ہوتا ہے بلکہ

۱۱- دیکھیے: فتح الباری ۱/۱۶۲

۱۲- اس حدیث کو شیخین نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ جیسا کہ اللؤلؤ والمرجان ۱۱۳۱ میں ہے۔

۱۳- دیکھیے: فتح الباری ۱/۱۶۳۔

یہ ایک عمومی اور دائمی امر ہے اور یہ ہر اس شخص کے لیے لازم ہے جو نومسلم ہو، جس نے ابھی ابھی گناہوں سے توبہ کی ہو، یا ہر وہ شخص جو تخفیف کا محتاج ہو جیسے مریض، یا عمر رسیدہ ہو یا کسی اور حاجت میں مبتلا ہو۔

علم کے تقاضوں میں سے ایک یہ ہے کہ داعی دینی معلومات کو گھونٹ گھونٹ کر آدمی کے گلے میں اتارے تاکہ اس کا عقلی معدہ اسے ہضم کرتا جائے۔ اور انھیں وہ باتیں نہ کہی جائیں جسے ان کی عقل برداشت نہ کر سکے۔ ورنہ یہ بات ان کے لیے یا ان کی طرح کے دوسرے لوگوں کے لیے فتنہ بن جائے گی۔

اسی کے بارے میں حضرت علی ؓ فرماتے ہیں:

حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ، وَدَعُوا مَا يُنْكِرُونَ، أَتُرِيدُونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ؟[14] لوگوں سے ایسی باتیں کرو جو ان کے لیے مانوس ہوں، جو باتیں نامانوس ہوں انھیں چھوڑ دو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے؟

حضرت ابن مسعود ؓ فرماتے ہیں:

مَا أَنْتَ بِمُحَدِّثٍ قَوْمًا حَدِيثًا لَا تَبْلُغُهُ عُقُولُهُمْ إِلَّا كَانَ لِبَعْضِهِمْ فِتْنَةً.[15] تم جب لوگوں سے کوئی ایسی بات کہتے ہو جس تک ان کا ذہن نہیں پہنچتا تو وہ ضرور ان میں سے بعض لوگوں کے لیے باعثِ فتنہ ہوگی۔

۱۴- اس قول کو امام بخاری نے کتاب العلم میں حضرت علی ؓ سے موقوفاً نقل کیا ہے۔ دیکھیے: فتح الباری ۱/ ۲۲۵۔

۱۵- اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمے میں نقل کیا ہے اور یہ ابن مسعودؓ پر موقوف ہے۔ حوالہ ایضاً

حفظ پر فہم کی ترجیح

اس مقام پر جب ہم عمل پر علم کی ترجیح کی بات کرتے ہیں تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور اہم بات کی طرف بھی توجہ دیں۔ یہ مسئلہ بھی ترجیحات میں داخل ہے۔ وہ یہ کہ علم الدرایت مقدم ہے علم الروایت پر، دوسرے الفاظ میں فہم اور سمجھ مقدم ہے محض حفظ و یادداشت پر۔ حقیقی علم وہی ہوتا ہے جو فہم اور ہضم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اسلام بھی ہم سے تفقہ فی الدین کا مطالبہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ. (التوبة ۹:۱۲۲)

ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔

اور حدیث صحیح میں ہے: مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ.[16] اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں فقاہت دے دیتا ہے۔

فقہ علم سے خاص ایک چیز ہے۔ یہ کسی چیز کا فہم ہے مگر فہمِ دقیق۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے کفار منافقین سے نفی کیا ہے اور ان کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (الأنفال ۸:۶۵،

۱۶- متفق علیہ بروایت معاویہؓ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۶۱۵۔

الحشر ۵۹:۱۳) ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔

مسلم سے روایت کردہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ، إِذَا فَقِهُوْا. انسان سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح ہیں۔ ان میں جو جاہلیّت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ثابت ہوتے ہیں، جب وہ سمجھ جائیں۔

اسی طرح صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ، كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ، أَصَابَ أَرْضًا، فَكَانَ مِنْهَا نَقِيَّةٌ قَبِلَتْ الْمَاءَ، فَأَنْبَتَتْ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ، وَكَانَ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ، فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاس، فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا، وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً أُخْرٰى، إِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ لَّا تُمْسِكُ مَاءً، وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً، فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِي دِيْنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ، فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْسًا، وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِيْ أُرْسِلْتُ بِهٖ.[۱۷] مجھے جو علم اور ہدایت دی گئی ہے اس کی مثال اس موسلا دھار بارش کی طرح ہے جو زمین پر برستی ہے۔ زمین کا کوئی ٹکڑا تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ بہت سا چارہ اور گھاس وغیرہ پیدا کرتا ہے۔ کوئی حصہ نشیبی ہوتا ہے وہ پانی کو روک لیتا ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے۔ لوگ اس سے خود بھی پانی پیتے ہیں، اپنے جانوروں کو بھی دیتے ہیں اور کھیتوں کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ کوئی ٹکڑا ایسا ہوتا ہے جو چٹیل میدان ہوتا ہے، وہ نہ پانی جمع کرتا ہے اور نہ سبزہ اگاتا ہے۔

یہی مثال ہے اس شخص کی جو اللہ کے دین اور مجھے جس ہدایت کے ساتھ بھیجا گیا ہے اس کو سمجھتا ہے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے، اور اس شخص کی جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی

۱۷- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ و المرجان ۱۴۷۱۔

نہیں دیکھتا اور نہ وہ اس ہدایت کو قبول کرتا ہے جس کے ساتھ مجھے بھیج دیا گیا ہے۔

یہ حدیث اس علم وہدایت کو، جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں، اس عمومی بارش کے ساتھ تشبیہ دے رہی ہے جو مردہ زمین کو سیراب کرتا ہے اسی طرح دینی علوم مردہ دلوں کو زندہ کرتے ہیں۔

پھر اس علم کو اخذ کرنے میں مختلف لوگوں کی تشبیہ مختلف قسم کی زمینوں کے ساتھ دی گئی ہے۔ ان میں سے اعلیٰ قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو علم میں فقاہت حاصل کرتے ہیں، اس سے خود بھی نفع حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی نفع پہنچاتے ہیں۔ ان کی مثال اس زمین کی طرح ہے جو پانی کو جذب کر لیتی ہے، خود بھی اس سے مستفید ہوتی ہے اور بہت سا سبزہ بھی اگا دیتی ہے۔ اس سے ادنیٰ قسم وہ ہے جو اچھا حافظہ رکھتے ہیں مگر انھیں فہم اور سمجھ کا ملکہ حاصل نہیں ہوتا اور نہ علم میں کافی رسوخ ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ معانی اور احکام کا استنباط کر سکیں، یہ لوگ اس علم کو محفوظ کر لیتے ہیں تاکہ علم کا پیاسا کوئی طالب علم آجائے اور ان سے وہ علم سیکھے جو ان کے پاس ہے اور وہ طالب علم اس بات کے اہل ہوتے ہیں کہ وہ خود بھی اس سے نفع حاصل کریں اور دوسروں کو بھی نفع پہنچائیں۔ ان لوگوں نے بھی اپنے علم سے ایک فائدہ تو کر لیا۔ ان لوگوں کی مثال اس نشیبی زمین کی ہے جس میں پانی ٹھہر جاتا ہے اور وہ اسے روک لیتی ہے، یہاں تک کہ پینے والا، پلانے والا اور کھیتوں کو سیراب کرنے والا آجاتا ہے اور اس سے مستفید ہوتا ہے۔

اسی بات کی طرف اس مشہور حدیث میں بھی اشارہ کیا گیا ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي فَوَعَاهَا، فَأَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا، فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرِ فَقِيْهٍ، وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ.[۱۸] اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے ہماری بات کو سنا اور اسے سمجھ کر اسی طرح آگے پہنچایا جیسا اس نے سنا تھا۔ کئی بار ایک حامل فقہ غیر فقیہ ہوتا ہے اور کئی بار ایک حامل فقہ اسے اپنے سے زیادہ فقیہ کو منتقل کر دیتا ہے۔

۱۸- یہ حدیث مختلف الفاظ میں حضرت ابن مسعودؓ، زیدؓ اور انسؓ سے مروی ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۶۷۶۳، ۶۷۶۶۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کو نہ فہم ہوتا ہے اور نہ حفظ، نہ علم اور نہ عمل۔ ان کی مثال اس شور زدہ زمین کی ہے جو نہ خود پانی جذب کرتی ہے اور نہ اسے دوسروں کے لیے جمع کرتی ہے۔[19]

اس حدیث نے یہ بات بتائی کہ اللہ اور اس کے نزدیک سب سے بلند درجے کے لوگ وہ ہیں جو فہم وفقہ والے ہوں۔ اس کے بعد وہ جو حفظ والے ہوں۔ یہاں سے پتہ چلا کہ درایت روایت سے افضل ہے اور اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ فقہا کو حفاظ پر فضیلت حاصل ہے۔

اُمت کے خیر القرون میں یعنی پہلے تین ادوار میں اصل مقام ومرتبہ فقہا کو حاصل تھا۔ مگر تنزل کے دور میں یہ مقام حفاظ کو حاصل ہوگیا۔

● حفظ کا فائدہ

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ حفظ کی مطلقاً کوئی قدر وقیمت ہی نہیں ہے یا یہ کہ انسان کے حافظے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ بات اگر کوئی کہے تو درست نہیں ہوگی۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حفظ صرف معلومات وحقائق کا ایک خزانہ ہوتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بعد میں فائدہ لینے والے اس سے استفادہ کریں۔ چنانچہ حفظ فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے بلکہ وہ ایک اور چیز کا ذریعہ ہے۔ مگر غلطی یہ ہے جس میں مسلمان مبتلا ہو چکے ہیں کہ انھوں نے حفظ کو زیادہ اہمیت دے رکھی ہے اور فہم کو پیچھے رکھ دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حفاظ قرآن کی بہت زیادہ تکریم کی جاتی ہے، اگرچہ اس کی اپنی جگہ ایک فضیلت ضرور ہے، یہاں تک کہ مختلف مقامات پر قراءت کے مقابلے ہوتے ہیں اور ان میں بڑے قیمتی انعامات دیے جاتے ہیں جن میں سے ایک ایک شخص کو ہزاروں اور لاکھوں کی رقم دی جاتی ہے۔ اس کی قدر کی جانی چاہیے، اور اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

لیکن اس طرح کے انعامات بلکہ ان کا آدھا یا ایک چوتھائی حصّہ بھی ان لوگوں کے حصے

۱۹- حدیث کی تشریح کے لیے دیکھیں: فتح الباری ۱/۱۷۷ اور شرح مسلم للنووی، نیز اللؤلؤ والمرجان، ص ۶۰۱۔

میں نہیں آ سکا جو مختلف شرعی علوم جیسے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، عقیدہ اور دعوت میں نابغہ روزگار ہوتے ہیں، حالانکہ اس وقت امت مسلمہ کو ان علوم کی زیادہ ضرورت ہے اور ان علوم کا نفع بھی زیادہ اور مفید تر ہے۔

ہمارے مسلمان ملکوں میں تعلیم پر جو اعتراضات ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کا سارا اعتماد حفظ اور رٹے پر ہوتا ہے نہ کہ فہم اور ہضم پر۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات آدمی جب امتحان دیتا ہے تو جو کچھ یاد کیا ہوتا ہے بھول جاتا ہے۔ اگر اس نے فہم اور سمجھ سے کام لیا ہوتا اور عمل کی نیت سے سیکھا ہوتا تو ذہن میں راسخ ہوتا اور اتنی جلدی اس پر زوال وادبار کا سایہ نہ پڑتا۔

ظاہری الفاظ پر مقاصد کی ترجیح

ہم جس فہم وفقہ کی بات کر رہے ہیں اس میں ایک چیز یہ بھی ہے کہ مقاصد شریعت میں غوطہ زن ہوا جائے اور ان کے اسرار اور علتوں کی معرفت حاصل کی جائے، ان کا آپس میں تعلّق معلوم کیا جائے اور شریعت کے اصول کو فروع کے ساتھ ملایا جائے، اس کے جزئیات کو کلیات کی طرف لوٹایا جائے اور صرف ظاہر پر اکتفانہ کیا جائے اور الفاظِ نصوص پر جمود اختیار نہ کیا جائے۔ یہ بات معلومات عامہ میں سے ہے اور اس پر کتاب وسنت کی بہت سی نصوص دلالت کرتی ہیں۔

اس کے ساتھ مختلف عبادات اور معاملات کے ابواب میں اور باقی خاندانی، معاشرتی، سیاسی اور بین الاقوامی مسائل کے جزئی احکام کی تحقیق واستقرا کرنے سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ شارع جب کسی کام کو امراً یا نہیاً یا اباحتاً قانون کا درجہ دیتا ہے تو اس کے پیش نظر کچھ اہداف ہوتے ہیں۔ اس نے کسی بھی امر کو تحکماً یا بغیر کسی وجہ کے مشروع نہیں کیا۔ بلکہ ہر کام کو کسی حکمت کے تحت مشروع کیا ہے جو اس کے کمال، اس کے علم، اس کی رحمت اور اپنی مخلوق پر اس کے احسان کے ساتھ مناسب ہے۔ اس کے ناموں میں سے ایک نام العلیم الحکیم ہے۔ چنانچہ وہ شریعت سازی میں بھی حکیم ہے، جیسا کہ تخلیق اور تقدیر میں ہے۔ اس کی حکمت عالم امر میں اسی طرح نمایاں ہے جیسا کہ عالم خلق میں نمایاں ہے۔

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (الأعراف ۷:۵۴)

اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔

جیسا کہ اس نے کسی چیز کو عبث پیدا نہیں کیا اسی طرح اس نے کسی قانون کو بلا وجہ قانون

درجہ نہیں دیا۔

جیسا کہ اولوالالباب اس کی تخلیق کے بارے میں کہتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ (آل عمران ۳:۱۹۱) [پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا، تو ہر عیب سے پاک ہے] اسی طرح ہم اس کی شریعت کے بارے میں کہتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا شَرَعْتَ هٰذَا إِلَّا لِحِكْمَةٍ! [اے پرودگار! تو نے یہ قانون بغیر کسی حکمت کے نہیں بنایا]۔

بہت سے دین کا علم سیکھنے والوں کی آفت یہ ہوتی ہے کہ وہ بحرِ علم کی سطح پر تیرتے رہتے ہیں اور اس کی گہرائیوں میں نہیں اترتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس میں تیراکی کرنے، اس کی تہہ میں غوطہ زن ہونے اور اس کے ہیرے برآمد کرنے کی اہلیت اپنے اندر پیدا نہیں کی ہوتی۔ اس وجہ سے وہ ظاہر میں مشغول ہوتے ہیں اور اسرار ومقاصد کی طرف انھیں توجہ نہیں ہوتی۔ وہ فروع کی جھنجھٹ میں پڑے رہتے ہیں اور اصول کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کے بندوں کے سامنے اللہ کا دین اور شریعت کے احکام ایسے منتشر فروعات کی صورت میں پیش کرتے ہیں جن کے درمیان میں کوئی اجتماعی صورت نہیں نکل سکتی اور ان کا اپنی علتوں کے ساتھ کوئی تعلّق نہیں ہوتا۔ ان کی زبانوں اور قلموں سے شریعت ایسی صورت میں سامنے آتی ہے گویا کہ وہ مخلوق کے مصالح اور مفادات کو حاصل کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔

مگر یہ قصور شریعت کا نہیں بلکہ ان لوگوں کے فہم کا ہے۔ جنھوں نے احکام کے درمیان آپس کے ربط وتعلّق کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ انھوں نے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ انھوں نے ایک ہی قسم کی دو چیزوں کو الگ الگ کیا ہے اور دو مختلف چیزوں کو آپس میں ملایا ہے۔ یہ ایسی بات ہے جو شریعت نے کبھی نہیں کی، جیسا کہ محققین اور راسخ فی العلم علما نے اسے بیان کیا ہے۔

اس ظاہر پرستی اور لکیر کا فقیر بننے کے نتیجے میں اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے دین میں جو وسعت رکھی ہے اس میں تنگی آ جاتی ہے اور جس چیز کو شریعت نے آسان بنایا ہے اس میں سختی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اس چیز میں جمود پیدا ہوتا ہے جس میں ترقی کا امکان موجود ہو اور بعض ایسی چیزوں کو کسی حد میں مقید کیا جاتا ہے جس میں وسعت اور آزادی پائی جاتی ہے۔

اجتہاد وتقلید میں ترجیحات

اس باب میں ایک بات یہ بھی ہے کہ اجتہاد اور تجدید کو تکرار اور تقلید پر ترجیح دی جائے۔ اس کا تعلق بھی فقہ المقاصد کے ساتھ ہے، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اور اس کا تعلق فہم اور حفظ کے مسئلے سے بھی ہے۔

علمائے امت میں سے سلف صالحین کے ہاں علم صرف احکام کی معرفت کا نام نہیں ہے، اگر چہ یہ معرفت دوسرے کی تقلید میں ہو اور اس کے اقوال کو بنیاد بنا کر کیا جاتا ہو، خواہ اس کی پشت پر کوئی قابل اطمینان دلیل نہ ہو۔ جو شخص اس طرح کرتا ہے وہ حق کو افراد سے جانتا ہے اور وہ افراد کی پیروی کرتا ہے نہ کہ دلائل اور حق کی۔

سلف کے نزدیک علم سے مراد علمِ استقلالی ہے، جس میں دلیل کی پیروی کی جاتی ہے اور اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی کہ وہ انسانوں میں سے زید اور عمرو کے موافق ہے یا نہیں۔ وہ دلیل کے پیچھے چلتے ہیں۔ جہاں دلیل ہوتی ہے وہاں یہ ہوتے ہیں اور جدھر حق مڑتا ہے ادھر یہ مڑتے ہیں۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے تقلید کی ممانعت اور اس کی مذمت پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ. (بنی اسرائیل ۱۷:۳۶)

کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔

وہ کہتے ہیں کہ اس بات پر اہل علم کا اتفاق ہے کہ تقلید علم نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب اِعلام الموقعین میں تقلید کے ابطال اور اس کے حامیوں کے شبہات کو دور کرنے کے لیے ۸۰ سے زیادہ وجوہات ذکر کی ہیں۔[۲۰]

چونکہ نصوص کے ظاہر پر جمود مذموم ہے، جیسا کہ قدیم وجدید اہل ظواہر کی حالت ہے، اس وجہ سے انھوں نے سابق علما کی بات پر جمود کو بھی اس مذمت میں داخل کیا ہے۔ انھوں نے اس میں ہمارے اور ان کے زمانے کے درمیان اور ہماری اور ان کی ضروریات کے درمیان اور ہمارے اور ان کے علوم ومعارف میں کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ ہمارے دور کو دیکھ لیتے اور ہمارے معاشرے میں رہتے اور ان کو اجتہاد کا وہ مقام حاصل ہوتا جو ان کا ہے تو وہ اپنے بہت سے فتاویٰ اور اجتہادات کو تبدیل کر دیتے۔ وہ ایسا کیوں نہ کرتے حالانکہ ان کے بعد ان کے بہت سے ساتھیوں نے وقت اور ضروریات کے اختلاف کی وجہ سے عملی طور پر ایسا کیا ہے جب کہ ان کے اور ان کے بعد والے لوگوں کے دور میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ بلکہ بہت سے علما نے اپنی زندگی میں بھی اپنے بہت سے اقوال سے رجوع کر لیا تھا کیوں کہ بعد میں عمر کے اثر سے یا پختگی کی بنا پر یا زمان ومکان کی تبدیلی کی وجہ سے ان کا اجتہاد بدل گیا تھا۔

یہاں تک کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مصر میں قیام سے پہلے ایک مذہب تھا جسے اب ان کے 'مذہب قدیم' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور پھر مصر میں قیام کے بعد ان کا ایک اور مذہب سامنے آیا جو اُن کا 'مذہب جدید' کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کوئی نہیں کہ انھوں نے یہاں آ کر جو کچھ دیکھا وہ اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا اور جو کچھ اب سنا وہ اس سے پہلے نہیں سنا تھا۔

امام احمد رحمہ اللہ سے ایک معاملے میں کئی مختلف روایات منقول ہیں۔ اس کی وجہ بھی اس کے سوا کوئی نہیں کہ ان کی رائے اور ان کا فتویٰ حالات وظروف کی تبدیلی کے ساتھ بدل جاتا ہے۔

۲۰- دیکھیے إعلام الموقعين، ۲/۱۶۸-۲۶۰ طبع: السعادة، مصر۔ تحقیق: محمد محیی الدین عبدالحمید۔

دنیا کے مطالعے اور منصوبہ بندی میں ترجیحات

اگر ہم نے یہ بات کی ہے کہ دینی امور میں عمل سے پہلے علم کی ضرورت ہے تو دوسری طرف ہم اس بات کی بھی تاکید کرتے ہیں کہ دنیوی معاملات میں اس کی شدید ضرورت ہے۔

ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جب ہر چیز کی بنیاد علم پر ہے۔ اب دنیا ایسی نہ رہی کہ دنیوی امور میں ہنگامیت اور غوغائیت کو قبول کرے۔ اس لیے ہر سنجیدہ کام کے لیے عمل سے پہلے اس کا گہرا مطالعہ کرنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور کسی کام کا آغاز کرنے سے پہلے اس کے انجام سے مطمئن ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لیے نفاذ سے پہلے منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح عمل کے لیے اقدام کرنے سے پہلے اس کے محتاط جائزے اور گہری جانچ پڑتال کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے اپنی دوسری کتابوں میں یہ بات ذکر کی ہے کہ کسی کام سے پہلے اس کا گہرا مطالعہ، جائزہ اور منصوبہ بندی اسلامی تعلیمات میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ وہ پہلے شخص تھے جس نے ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں کے لیے ایک منظم منصوبہ بندی کی۔ اس منصوبہ بندی اور جائزے کا اثر آپ ﷺ کی سیرت کے مختلف واقعات میں صاف نظر آتا ہے۔[21]

اپنے کل کے لیے منصوبہ بندی کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہے جو اسلامی تحریکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ معاملات کو اس طرح نہ چھوڑیں کہ وہ بغیر کسی نظم وضبط

۲۱- دیکھیے ہماری کتاب الرسول والعلم، طبع: مؤسسة الرسالة، بیروت۔ اور دار الصحوة، قاہرہ۔

کے ایسے ہی چلتے رہیں۔ ان کے لیے یہ طریقہ درست نہیں ہے کہ وہ نہ ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں، نہ حال کے واقعات کے لیے کوئی منصوبہ رکھیں اور نہ اپنے اجتہادات میں غلطی اور درستی کے جائزے کے لیے کوئی پیمانہ مقرر کریں، نہ ان کے پاس کل اور آج میں نفع ونقصان کو ناپنے کے لیے کوئی کسوٹی موجود ہو اور نہ یہ بات جاننے کے لیے کوئی معلومات ہوں کہ ہمارے اندر مادی ومعنوی، اور کھلی چھپی کیا صلاحیتیں اور قدرتیں پائی جاتی ہیں اور ہم انھیں استعمال میں لا رہے ہیں یا وہ ویسے ہی ضایع ہو رہی ہیں۔ ہمارے لیے قوت کہاں سے فراہم ہوسکتی ہے اور ہمارے اندر کہاں کہاں پائی جاتی ہے۔ ہمارے مدمقابل کون لوگ ہیں اور ان کی حقیقی حالت کیا ہے۔ کون ہمارے دائمی دشمن ہیں اور کون عارضی۔ کون ہیں جن کو دوست بنایا جاسکتا ہے اور کون ہیں جو ہمارے دوست نہیں بن سکتے۔ کن سے مفاہمت ہوسکتی ہے اور کن سے نہیں۔ دشمنوں کو ایک ہی صف میں نہیں قرار دیا جاسکتا ہے کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ باہم متفاوت ہیں۔

یہ ساری باتیں علم اور منظم منطقی مطالعے کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتیں۔ ایسا مطالعہ جو جذبات سے دور اور ممکن حد تک شخصی احوال وظروف اور ماحول اور وقت کے اثرات سے آزاد ہو۔ 'ممکن حد تک' ہم نے اس لیے کہا ہے کہ انسان کے لیے یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ وہ ان چیزوں سے مکمل طور پر آزاد ہوجائے۔

فقہی آرا میں ترجیحات

ہم نے حفظ پر فہم، ظاہری الفاظ پر اُن کے مقاصد اور تقلید پر اجتہاد کی ترجیح کے حوالے سے جو بات کی ہے اس کی ہمیں اس حوالے سے بھی بڑی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اجتہادی شرعی احکام اور فقہی آرا میں جب اختلاف پیدا ہو جائے تو ان میں سے کس کو کس پر ترجیح دی جائے اور کس کو کس پر مقدم کیا جائے۔

یہاں ترجیح کا عمل بغیر کسی وجہ اور دلیل کے یا محض اندازے سے نہیں ہوگا اور نہ اس میں خواہش کی پیروی کی جائے گی۔ بلکہ اس کے لیے کچھ معیارات کی ضرورت ہے جن کی طرف رجوع کیا جائے اور انھی کی بنیاد پر کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔

اصول فقہ کی کتابوں میں ایک اہم اور طویل باب اس حوالے سے ہوتا ہے کہ مختلف دلائل میں تقابل اور ترجیح کیسے کی جائے۔ اس موضوع کو التعارض والترجیح کا عنوان دیا جاتا ہے۔

اسی طرح سنت کے معاملے میں ائمہ حدیث بھی اس مسئلے کو چھیڑتے ہیں اور اس کے ذریعے مختلف احادیث کے درمیان ترجیح کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

میں یہاں چند متعین اشیا کی طرف توجہ دلاؤں گا جن کی ہماری موجودہ صورتِ حال میں خصوصی اہمیّت ہے، جبکہ مختلف افکار امت مسلمہ کو مضطرب کر رہے ہیں اور مختلف آرا انھیں تردد میں ڈال رہے ہیں، خواہ یہ اضطراب و تردد مسلمانوں اور ان کے مغربی اور سیکولر مخالفین کے درمیان ہو یا مختلف دینی مکاتبِ فکر اور تنظیموں کے درمیان آپس میں ہو، خاص طور پر ان لوگوں

کے درمیان جو میدانِ دعوت میں سرگرم عمل ہیں اور اسلام کے نفاذ کی کوشش کر رہے ہیں، جن کے اہداف الگ الگ اور جن کے طریقِ کار آپس میں مختلف ہیں۔

اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ کون سی آرا ہیں جو قطعاً اختلاف کو قبول نہیں کرتیں، جن میں کسی دوسری رائے کو قبول نہیں کیا جا سکتا اور جن میں نرمی کی گنجایش بالکل نہیں ہے؟

کون سی آرا ہیں جو، اگرچہ بہت کم ہی کیوں نہ ہو، نرمی کو قبول کرتی ہیں؟

اور کون سی آرا ہیں جن میں اختلاف اور تسامح کی بہت سی گنجایش موجود ہے؟

• قطعی اور ظنی دلائل میں ترجیحات

اہلِ علم کے ہاں یہ بات متعین ہے کہ جو چیز اجتہاد سے ثابت ہو اس کا وہ مقام نہیں ہے جو نص سے ثابت شدہ چیز کا ہے۔ اور جو چیز نص سے ثابت ہو اور اس کی تائید اجماع یقینی سے بھی ہو جائے وہ اس چیز سے مختلف ہے جو نص سے تو ثابت ہو مگر اس کے فہم میں اختلاف ہوا ہو۔ اس کے فہم میں اختلاف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اجتہادی معاملہ ہے۔ اجتہادی امور میں ایک عالم دوسرے پر نکیر نہیں کر سکتا۔ ہاں! وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے اس کے بارے میں ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو نص سے ثابت ہوتی ہیں مگر ان کے قطعی یا ظنی ہونے میں اختلاف ہوتا ہے۔

قطعیت اور ظنیت کا تعلق نص کے ثبوت اور اس کی دلالت کے ساتھ ہوتا ہے۔

بعض نصوص ایسی ہوتی ہیں جن کا ثبوت اور دلالت دونوں بیک وقت ظنی ہوتے ہیں۔

بعض ایسی ہوتی ہیں جن کا ثبوت ظنی اور دلالت قطعی ہوتی ہے۔

بعض ایسی ہوتی ہیں جن کا ثبوت قطعی اور دلالت ظنی ہوتی ہے۔

اور بعض ایسی ہوتی ہیں جن کا ثبوت اور دلالت دونوں قطعی ہوتے ہیں۔

● ظنی الثبوت نصوص

ظنی الثبوت نصوص احادیثِ غیر متواترہ کے ساتھ مخصوص ہیں اور متواتر اس حدیث کو کہتے ہیں جسے سند کی ابتدا سے لے کر اس کی انتہا تک ایک جماعت نے دوسری جماعت سے روایت کیا ہو اور وہ جماعت اتنی بڑی ہو جس کے افراد کا جھوٹ پر اتفاق ناممکن ہو۔ اور خبر واحد اس سے مختلف ایک چیز ہے۔

بعض علما کہتے ہیں کہ سنت میں متواتر کا وجود بہت مشکل بلکہ قریب قریب ناپید ہے۔ جبکہ بعض علما نے اس میں بڑی وسعت سے کام لیا ہے یہاں تک کہ بعض ضعیف احادیث کو، جنھیں شیخین نے چھوڑ دیا تھا، بھی متواتر کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ چنانچہ اس بات سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ کسی حدیث کو بغیر کسی دلیل کے متواتر ٹھہرایا جائے۔

بعض علما نے اُن احادیث کو متواتر میں شمار کیا ہے جن کے بارے میں بہت سے شواہد وقرائن پائے جاتے ہیں مثلاً یہ کہ اسے امت نے قبولیت کا شرف بخشا ہو۔ جیسے صحیحین کی احادیث جن پر معتبر علما میں سے کسی نے بھی جرح نہیں کی۔

● ظنی الدلالت نصوص

ظنی الدلالت نصوص قرآن وسنت دونوں پر مشتمل ہیں۔ قرآن وسنت کی زیادہ تر نصوص ایسی ہیں جن میں متعدد مفہومات اور تفسیروں کی گنجایش موجود ہوتی ہے۔ کیوں کہ کسی زبان کے الفاظ طبعی طور پر حقیقت ومجاز، صریح وکنایہ، خاص وعام اور مطلق ومقید پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور ان میں بھی دلالتِ مطابقی، دلالتِ تضمّنی اور دلالتِ التزامی کا احتمال موجود ہوتا ہے۔[۲۲]

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مختلف نصوص کا مفہوم لوگوں کی عقل، ان کے احوال اور ان کی

۲۲- دلالت مطابقی اس کو کہتے ہیں جس میں لفظ اپنے معنی کے تمام افراد پر دلالت کرے، دلالت تضمّنی کا مطلب یہ ہے کہ لفظ اپنے معنی کے بعض افراد پر دلالت کرے، اور دلالت التزامی یہ ہے کہ لفظ اپنے معنی کے افراد پر نہیں بلکہ اس کے لوازم پر دلالت کرے۔ (مترجم)

نفسیاتی اور عقلی حالت کے تابع ہوتا ہے۔ مثلاً ایک متشدد آدمی کسی نص سے ایک بات سمجھتا ہے تو نرم مزاج آدمی اسی نص سے کوئی اور مفہوم سمجھ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علمی ورثے میں اگر ایک طرف حضرت ابن عمرؓ کی سختیاں موجود ہیں تو دوسری طرح حضرت ابن عباسؓ کی رخصتیں بھی پائی جاتی ہیں۔

جس کا علمی افق وسیع ہو وہ کسی نص سے ایک مفہوم اخذ کرتا ہے تو جس کے آفاق محدود ہوں وہ اسی نص سے کوئی اور مفہوم لے لیتا ہے۔

جو شخص مقاصد پر نظر رکھتا ہے اور نص کے الفاظ کے پیچھے چھپی ہوئی روح کو تلاش کرتا ہے وہ کسی نص سے ایک طرح سے استدلال کرتا ہے اور جو شخص نص کے ظاہر پر عمل کرتا ہے اور ظاہر سے ذرہ برابر آگے پیچھے نہیں ہوتا وہ اس سے بالکل دوسرا استدلال کرتا ہے۔ اس کی سب سے واضح دلیل بنی قریظہ میں نمازِ عصر کی ادائیگی کا مسئلہ ہے۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک حکمت پوشیدہ ہے کہ اس نے نصوص کو اس انداز سے پیش کیا کہ وہ اس تعدد کو قبول کرتی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ ہر قسم اور ہر ذہن کے لوگوں کے لیے عام ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی کتابِ خالد کو ایسے انداز میں نازل فرمایا کہ

مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ. (آل عمران ۳:۷)

اس میں کچھ آیات محکم ہیں وہ کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور اس کے علاوہ کچھ متشابہات ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ لوگوں کو ایک فہم اور ایک ہی رائے پر جمع کرے تو اپنی پوری کتاب کو آیاتِ محکمات کی صورت میں نازل کرتا اور ساری نصوص کو قطعی بنا دیتا۔

● قطعی الثبوت وظنی الدلالت

ثبوت کے لحاظ سے قرآن سارا کا سارا بلا شک وشبہہ قطعی ہے۔ مگر اس کی اکثر آیات اپنی جزئیات کے اعتبار سے ظنی الدلالت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے ان سے

استنباط کرنے میں اختلاف کیا ہے۔

• قطعی الثبوت وقطعی الدلالت

لیکن بڑے مسائل جیسے الوہیت، رسالت، جزاوسزا، اصول عبادات، بنیادی اخلاقیات (فضائل ورذائل) بنیادی عائلی احکام، میراث، حدود وقصاص اور اس طرح کے دوسرے احکام آیاتِ محکمات میں بیان ہوئے ہیں جو ان مسائل میں نزاع کو ختم کر دیتے ہیں اور سارے لوگ ایک ہی کلمے پر جمع ہو جاتے ہیں۔

ان مسائل کی سنت نبوی نے بھی قولی، فعلی اور تقریری لحاظ سے تاکید کی ہے، علمائے امت کے یقینی اجماع نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اس کے علاوہ امت کا عمل بھی اس کے ساتھ شامل ہے۔

• نصوص میں ترجیحات کی ضرورت

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ مختلف نصوص کو جان بوجھ کر یا نا سمجھی میں ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دینا جائز نہیں ہے۔

یقیناً اس شخص کو معذور سمجھا جائے گا جو کسی ظنی الثبوت نص کو مسترد کرتا ہے، بشرطیکہ اس کے پاس کوئی دلیل موجود ہو جس کی رو سے وہ اس کے نزدیک غیر ثابت ہو۔

اسی طرح اس شخص کو بھی معذور سمجھا جائے گا جو کسی ظنی الدلالت نص پر مشتمل رائے کو مسترد کرتا ہے یا اس کی کوئی نئی تفسیر کرتا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہ کی ہو، مگر اس کا احتمال موجود ہو۔

بعض اوقات اِسے یا اُسے کسی ظنی نص کو رد کر دینے میں بھی معذور نہیں سمجھا جائے گا، جبکہ اِس کا یا اُس کا مقصد صاف طور پر مکر وفریب ہو۔ مگر اُس کے اِس عمل سے نہ اسے کافر کہا جائے گا اور نہ ملت سے خارج کیا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ اسے بدعتی قرار دیا جائے اور اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ اہل سنت کے عمومی راستے سے ہٹ گیا۔ باقی

اس کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار بھی ہر کس وناکس کو حاصل نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری محققین اور معتمد اہلِ علم پر عائد ہوتی ہے۔

• یقینی گمراہی

جو بات یقینی طور پر رد کرنے کے قابل ہے اور جس کے قائل کو پرے پھینکنا چاہیے وہ یہ ہے کہ آدمی ایسی نصوص کو مسترد کرے جو بیک وقت قطعی الدلالت بھی ہوں اور قطعی الثبوت بھی۔ یہ نصوص اگرچہ بہت کم ہیں مگر یہ دین میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ کیوں کہ یہی امت مسلمہ کے عقائدی، فکری، شعوری اور علمی وحدت کو وجود بخشتی ہیں، یہی ہیں جن کو نزاع کے وقت فیصلہ کن بنایا جاتا ہے اور یہی ہیں جن کی طرف اختلاف کے وقت رجوع کیا جاتا ہے۔ اگر یہی محلِ نزاع واختلاف بن جائیں تو لوگ رجوع کس کی طرف کریں گے۔

اسی وجہ سے ہم نے اپنی کتابوں میں اس فکری سازش سے لوگوں کو متنبہ کیا ہے جو قطعیات کو ظنیات میں اور محکمات کو متشابہات میں تبدیل کرنے کے لیے کی جا رہی ہے۔ مثلاً کچھ لوگ حرمت شراب والی آیت کے بارے میں نزاع کر رہے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ. (المائدہ ۵:۹۰)

یہ شراب اور جوا، اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی۔

وہ لفظ فَاجْتَنِبُوْهُ کی دلالت میں تشکیک پیدا کرتے ہیں۔

اسی طرح وہ لوگ جو سود کی حرمت، سور کے گوشت، عورت کی میراث، مرد کی قوامیت، حجاب (بمعنی سکارف اور ساتر لباس) [۲۳] اور اس طرح کے دوسرے امور کے بارے میں نزاع پیدا

۲۳- حجاب کے بارے میں یہ وضاحت مؤلف کی ہے۔ وہ اس مقام پر اباحیت پسندوں کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ بہت سے علما کے نزدیک چہرے کا پردہ واجب ہے۔ یوں مؤلف نے دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ اپنائی ہے۔ (مترجم)

کر رہے ہیں جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت نصوص سے ثابت ہیں، ان کے بارے میں اجماع بھی ہو چکا ہے اور امت مسلمہ چودہ سو سال سے فکری ونظریاتی اور عملی طور پر ان کے اوپر ثابت قدم ہے۔

یہ دین کے وہ واضح اور بیّن معاملات ہیں جن کے لیے علما مَاعُلِمَ مِنَ الدِّیْنِ بِالضَّرُوْرَۃِ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

مطلب یہ کہ ان کو ہر خاص وعام مسلمان جانتا ہے، ان پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، کیوں کہ ان کے دلائل بہت معروف، بہت زیادہ اور امت کے وجدان میں راسخ ہوتے ہیں۔

یہ وہ بات ہے جس کا انکار کرنے والے پر کفر کا حکم لگایا جاسکتا ہے۔ مگر یہ حکم لگانے سے پہلے اس قول کے قائل سے شبہہ دفع کیا جائے گا، اس پر اتمام حجت کیا جائے گا اور اس کے عذر کو ختم کیا جائے گا۔ اس کے بعد اسے امت کے جسم سے الگ کر دیا جائے گا۔

● اُمت کو درپیش اصل معرکہ

ہمیں چاہیے کہ اپنی توجہ اجماعی قطعیات پر مرکوز کریں اور مختلف فیہ ظنیات سے بچیں۔ امت کو جس چیز نے مشکلات سے دوچار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے قطعیات کو چھوڑ دیا ہے اور اس وقت دنیا کے کونے کونے میں داعیانِ اسلام اور داعیانِ سیکولرزم کے درمیان جو معرکہ برپا ہے وہ انھی قطعیات کے بارے میں ہے، عقیدے کے قطعیات، قانون کے قطعیات، فکر کے قطعیات اور کردار کے قطعیات۔

یہ قطعیات ہی ہیں جن کے لیے ضروری ہے کہ یہ تفہیم وتلقین، دعوت وارشاد، تعلیم وتربیت اور پوری اسلامی زندگی کے وجود کی بنیاد بنیں۔

اسلامی دعوت اور دینی کام کے لیے یہ بات سب سے زیادہ خطرناک ہے کہ لوگوں کو ان

امور کی طرف دعوت دی جائے جن میں اختلافات ختم ہونے کی کوئی امید نہیں ہے، ان کے گرد جنگ وجدل کا بازار گرم رکھا جائے، لوگوں کو مسلکوں کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے اور اسی کی بنیاد پر کسی کے ساتھ تعلق قائم کریں اور کسی سے قطع تعلق کریں۔

ہم نے اپنی کتاب الصَّحوةُ الإسلامية بينَ الاختلافِ المشروعِ والتفرُّقِ المنمومِ میں اس بات کی اچھی طرح وضاحت کی ہے کہ اس طرح کے اختلافات امت کی ضرورت، اللہ کی رحمت اور دین میں وسعت کا ذریعہ ہیں۔ ان کا ازالہ نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔

● اختلافی مسائل کے بارے میں درست طرزِ عمل

ہماری بات کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم کسی اختلافی مسئلے میں زبان تک نہ کھولیں۔ یا ہم عقیدے، فقہ، یا کردار کے حوالے سے کسی رائے کو کسی پر ترجیح بھی نہ دیں۔ یہ تو ناممکن ہے۔ اگر یہ بات ہو کہ علما کسی رائے کو صحیح اور کسی کو کمزور نہ کہیں اور کسی کو راجح اور کسی کو مرجوح نہ کریں تو پھر ان کا کام اور کیا ہوگا۔

میں تو اس بات پر نکیر کر رہا ہوں کہ لوگ اس چیز کو اپنے لیے ایک دائمی مشغلہ بنائیں اور متفق علیہ مسائل سے زیادہ توجہ اختلافی مسائل کی طرف دیں، نیز یہ کہ وہ ظنیات کی فکر میں پڑے رہیں درآنحالیکہ لوگوں نے قطعیات سے بھی منہ موڑ لیا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی اضطراب اور خطرے کی ہے کہ ہم لوگوں کے سامنے ایسے مسائل پیش کریں جن میں بہت سارا اختلاف ہو چکا ہو اور ہم ان کو ایسے انداز میں پیش کریں جیسے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ درست نہیں ہوگا کہ اس میں ہم دوسروں کی آرا سے جہالت برتیں جن کا اپنا نقطہ نظر اور اپنے دلائل ہوتے ہیں، خواہ ان دلائل کے بارے میں ہماری رائے کچھ بھی ہو اور ہم انھیں معتبر سمجھتے ہوں یا نہیں۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوسری رائے جمہور علمائے امت کی بڑی تعداد کی رائے ہوتی ہے

اور ـــــ وہ اگر چہ غلطی سے مبرا نہیں ہوتی، کیوں کہ اس پر یقینی اجماع نہیں ہوتا مگر پھر بھی ـــــ اس کی شان کو ہلکا نہیں کیا جا سکتا۔

اس کی مثال وہ لوگ ہیں جو چہرے کا پردہ کرنے اور نقاب اوڑھنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ انھی کی رائے درست ہے اور اس میں خطا کا احتمال نہیں ہے، وہ اپنے مخالفین پر سخت نکیر کرتے ہیں حالانکہ وہ ائمہ وفقہا کی ایک بڑی تعداد کی مخالفت کر رہے ہوتے ہیں، اور یہی نہیں بلکہ وہ کتاب وسنت اور عملِ صحابہ کے روشن دلائل کی بھی مخالفت کر رہے ہوتے ہیں۔

مجھے اس بات پر بہت رنج ہوا کہ ایک داعی نے اپنے ریکارڈ شدہ تقریر میں کہا کہ عورت کا چہرہ کھلا رکھنا ایسا ہی ہے جیسے شرمگاہ کو کھلا رکھنا۔ یہ بہت زیادہ غلو ہے۔ اس کی توقع کسی صاحبِ فقہ وبصیرت سے نہیں کی جا سکتی۔

میں یہاں پر اس بات کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ بعض معتبر ترین علما کی آرا بھی بعض اوقات کسی خاص ماحول اور خاص دور میں شاذ بن جاتی ہیں۔ کیوں کہ وہ زمانے میں قدیم ہوتی ہیں اور پھر کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بعد میں کوئی زمانہ ایسا آیا ہو جس میں کسی نے ان کی تائید کی ہو اور ان آرا یا ان کی تائید نے شہرت حاصل کر لی ہو یہاں تک کہ انھیں فتویٰ کی بنیاد بنایا گیا ہو۔ یہی معاملہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی آرا کے ساتھ ہوا۔

❖❖❖

۵

فتویٰ اور دعوت میں ترجیحات

عُسر پر یُسر کی ترجیح

یُسر کی ترجیح کے دلائل

یہاں مطلوب ترجیحات میں سے، خصوصاً دعوت وافتا کے میدان میں، ایک یہ ہے کہ تخفیف اور تیسیر کوتشدید اور تعسیر پر مقدم رکھا جائے۔ کتاب وسنت کی نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تیسیر اور تخفیف اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کو محبوب ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرة ۲:۱۸۵)

اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے، اور وہ تم پر سختی نہیں چاہتا۔

يُرِيْدُ اللهُ أَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيْفاً. (النساء ۴:۲۸)

للہ تعالیٰ تم پر تخفیف کرنا چاہتا ہے اور انسان کوضعیف پیدا کیا گیا ہے۔

مَا يُرِيْدُ اللهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ. (المائدة ۵:۶)

اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تمھیں حرج میں مبتلا کردے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں: خَيْرُ دِيْنِكُمْ أَيْسَرُهُ[1] [تمھارا بہترین دین وہ ہے جس میں آسانی ہو]، اور أَحَبُّ الْأَدْيَانِ إِلَى اللهِ الْحَنِيْفِيَّةُ السَّمْحَةُ.[2] اللہ کے ہاں بہترین

۱-اس حدیث کو احمد نے مسند میں، بخاری نے الأدب المفرد میں اور طبرانی نے الأوسط میں محجنؓ بن الادرع سے نقل کیا ہے۔ طبرانی نے اسے عمران بن حصینؓ سے بھی نقل کیا ہے۔ ابن عدی اور ضیاء نے اسے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ دیکھیے: صحيح الجامع الصغير ۳۳۰۹۔

۲-اسے بخاری نے الأدب المفرد میں احمد نے مسند میں اور طبرانی نے الأوسط میں ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ حوالہ ایضاً ۱۶۰۔

دین جس میں حنفیت ہو اور آسانی ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ کو جب بھی دو امور کے بارے میں اختیار دیا جاتا تھا تو آپ ﷺ ان میں سے آسان پہلو کو چن لیتے تھے، سوائے اس کے کہ وہ کوئی گناہ کا معاملہ ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ ﷺ سب سے زیادہ اس سے دور رہتے تھے۔[3]

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتٰى رُخَصُهُ، كَمَا يَكْرَهُ أَنْ تُؤْتٰى مَعْصِيَتُهُ.[4] اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی دی گئی رخصتوں پر عمل کیا جائے جیسا کہ وہ یہ بات ناپسند کرتا ہے کہ اس کی معصیت کی جائے۔

پھر رخصت اور تیسیر کو اختیار کرنا اس وقت زیادہ ضروری ہو جاتا ہے جب بیماری یا بڑھاپے یا زیادہ مشقت یا اس طرح کی کسی اور وجہ سے اس کی حاجت محسوس کی جائے۔

● یُسر کی ترجیح کی مثالیں

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تھے۔ آپ ﷺ نے کسی جگہ ہجوم دیکھا، لوگ ایک آدمی پر جھکے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: اسے کیا ہوا؟

لوگوں نے کہا تھا: اس نے روزہ رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ.[5] سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے۔

مراد اس طرح کی پرمشقت سفر ہے۔ لیکن اگر سفر میں اس طرح کی مشقت نہ ہو تو روزہ رکھنا جائز ہے۔ اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے پوچھا: کیا میں سفر میں روزہ رکھ سکتا ہوں؟ یہ اکثر اوقات روزے رکھا کرتے تھے۔ نبی ﷺ

۳۔ متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۱۵۰۲۔

۴۔ اس حدیث کو احمد، ابن حبان اور بیہقی نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۱۸۸۶۔

۵۔ متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۵۸۱۔

نے اس سے فرمایا:

إِنْ شِئْتَ فَصُمْ، وَإِنْ شِئْتَ فَأَفْطِرْ.[6] چاہو روزہ رکھو، چاہو نہ رکھو۔

خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مسافر کے لیے روزے یا افطار اور اس کے متعلق فقہا کے اختلاف کے بارے میں، کہ رکھنا افضل ہے یا نہ رکھنا، کہا کرتے تھے: ان میں سے جو اس کے لیے آسان ہو وہی افضل ہے۔

یہ ایک مقبول قول ہے۔ اس لیے کہ بعض لوگوں کے لیے دوسروں کے ساتھ مل کر روزہ رکھنا آسان ہوتا ہے، بہ نسبت اس کے کہ بعد میں اس کی قضا اس وقت کرے، جبکہ دوسرے لوگ کھاتے پیتے ہوں۔ اور کسی کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ چنانچہ جس کے لیے جو آسان ہو اس کے حق میں وہی افضل ہے۔

آپ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ افطاری میں جلدی کی جائے اور سحری میں تاخیر کی جائے۔ اس کا مقصد بھی روزہ دار کے لیے آسانی پیدا کرنا ہی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر فقہا بعض اختلافی احکام میں اُسی رائے کو ترجیح دیتے ہیں جو لوگوں کے لیے آسان ہو، خاص طور پر معاملات کے باب میں۔ اس طرح کے مواقع میں فقہا کا یہ مقولہ بہت مشہور ہے کہ هٰذَا الْقَوْلُ أَرْفَقُ بِالنَّاسِ [یعنی اس قول میں لوگوں کا زیادہ فائدہ ہے]۔

میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے فتویٰ میں تیسیر اور دعوت میں تبشیر [پرامیدی] کا طریقہ اپنایا ہوا ہے۔ میں اس سلسلے میں نبوی طریق کار کی پیروی کر رہا ہوں۔ نبی ﷺ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیج رہے تھے تو انھیں نصیحت فرمائی:

يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا، وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا، وَتَطَاوَعَا.[7] آسانی پیدا کرو، تنگی نہ لاؤ، اور لوگوں کو خوشی کی بات کہو، انھیں متنفر نہ کرو۔ لوگوں کو خوشی سے اپنی پیروی کرنے پر آمادہ کرو۔

۶۔ متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۶۸۴۔

۷۔ متفق علیہ، بروایت ابو بردہؓ۔ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۱۱۳۰۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا، وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا[8] آسانی پیدا کرو تنگی نہ لاؤ، اور لوگوں کو خوش خبری سناؤ انھیں متنفر نہ کرو۔

● ایسر اور احوط میں ترجیح

میں نے اپنے کسی خطاب کے بعد ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: میں جب اپنے سامنے دو برابر کے یا ایک دوسرے کے قریب قریب اقوال دیکھتا ہوں اور ان میں سے ایک اَحوَط [یعنی احتیاط پر مبنی ہو] جبکہ دوسرا ایسر [یعنی آسان] ہو تو میں عام طور پر لوگوں کو ایسر کے بارے میں فتویٰ دے دیتا ہوں اور اسے اَحوَط پر ترجیح دیتا ہوں۔

وہاں موجود بھائیوں میں سے ایک نے کہا: آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ اَحوَط کو ایسر پر ترجیح دیتے ہیں؟

میں نے کہا: میری دلیل رسول اللہ ﷺ کی ہدایت ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ ﷺ کو جب بھی دو چیزوں میں انتخاب کا اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ ان میں سے آسان تر کو پسند فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے مسجد کے اماموں کو حکم دیا تھا کہ وہ مقتدیوں کے لیے آسانی پیدا کریں، کیوں کہ ان میں کمزور بھی ہوتے ہیں، بزرگ بھی اور اصحابِ حاجت بھی۔

بعض اوقات ایک عالم ایسے لوگوں کو اَحوَط پر بھی فتویٰ دے سکتا ہے جو اہلِ عزیمت، متقی اور دین دار ہوں۔ لیکن عام لوگوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ انھیں آسان تر کے بارے میں فتویٰ دیا جائے۔

ہمارا دور کسی بھی دوسرے دور سے زیادہ اس بات کا محتاج ہے کہ اس میں لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کی جائیں، نہ کہ ان پر سختی کی جائے، اور ان کو امید دلائی جائے نہ کہ انھیں متنفر کیا جائے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے بارے میں جو نئے نئے مسلمان ہوئے ہوں یا انھوں نے ابھی ابھی توبہ کی ہو۔

۸- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۱۱۳۱۔

● یُسر کے بارے میں نبی ﷺ کا طرزِ عمل

یہ سب کچھ نبی ﷺ کی سنت سے پوری طرح واضح ہے۔ آپ ﷺ جب کسی نومسلم کو اسلامی تعلیمات سکھاتے تھے تو آپ اس پر بیک وقت ساری چیزیں لازم نہیں کرتے تھے نہ انھیں حد سے زیادہ اوامر ونواہی سے گراں بار کرتے تھے۔ آپ ﷺ سے جب کوئی نومسلم پوچھتا کہ اسلام کے اس سے کیا مطالبات ہیں؟ تو آپ ﷺ اسی پر اکتفا کرتے تھے کہ اسے بنیادی فرائض کا حکم دیا جائے۔ آپ ﷺ اس کو نوافل کے سمندر میں نہیں ڈبوتے تھے۔

جب کوئی آدمی کہتا کہ میں اس میں کوئی اضافہ اور کمی نہیں کروں گا تو آپ ﷺ فرماتے: اگر اس نے سچ بولا ہو تو یہ کامیاب ہے۔ یا یہ فرماتے تھے: اگر اس نے سچ کہا ہے تو یہ جنت میں چلا جائے گا۔

● عُسر کی ناپسندیدگی

بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ اس شخص پر سخت نکیر فرماتے ہیں جو لوگوں کو سختی میں ڈالتا ہے اور ان کے مختلف حالات کا لحاظ نہیں کرتا۔ جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ وہ لوگوں کو نماز کی امامت کراتے تھے اور اس میں لمبی قرأت کرتے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو اس قدر مشکل میں ڈالا کہ انھوں نے آخر کار نبی ﷺ کو شکایت کی۔ آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے یہ بات ناپسند فرمائی اور ان سے کہا:

أَفَتَّانٌ أَنْتَ يَا مُعَاذُ، أَفَتَّانٌ أَنْتَ يَا مُعَاذُ، أَفَتَّانٌ أَنْتَ يَا مُعَاذُ![9] اے معاذ تو لوگوں کو فتنے میں ڈالتا ہے!، اے معاذ تو لوگوں کو فتنے میں ڈالتا ہے!، اے معاذ تو لوگوں کو فتنے میں ڈالتا ہے!

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا: یارسول اللہ! میں فلاں کی وجہ سے نمازِ فجر سے مؤخر ہو جاتا ہوں کیوں کہ وہ نماز بہت لمبی کر دیتا ہے۔ میں نے

۹- اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

دیکھا کہ اس دن رسول اللہ ﷺ اپنے وعظ میں جتنے جلال میں تھے، میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ مِنكُم مُّنَفِّرِينَ، فَأَيُّكُم مَا صَلَّى بِالنَّاسِ، فَلْيَتَجَوَّزْ (يُخَفِّفْ) فَإِنَّ فِيهِمُ الضَّعِيفَ، وَالْكَبِيرَ، وَذَا الْحَاجَةِ.[10] تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو دوسروں کو متنفر کررہے ہیں۔ تم میں سے جو بھی لوگوں کو نماز پڑھائے تو وہ اس میں تخفیف کرے۔ ان میں کمزور بھی ہوتے ہیں، بوڑھے بھی اور اصحاب حاجت بھی۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ شخص جس نے لوگوں پر نمازوں کے معاملے میں سختی پیدا کی تھی، حضرت اُبی بن کعب ؓ تھے۔ ان کا علم وفضل کے لحاظ سے جو مقام ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جنھوں نے قرآن کو جمع کیا تھا، مگر اس کے باوجود نبی ﷺ ان پر نکیر فرمائی، جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ ؓ پر نکیر فرمائی تھی، باوجودیکہ آپ ﷺ اس سے بہت محبت بھی کرتے تھے اور ان کی بہت تعریف بھی کیا کرتے تھے۔

آپ ﷺ کے خادم اور ساتھی حضرت انس ؓ فرماتے ہیں: میں نے کسی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جو نبی ﷺ سے زیادہ ہلکی اور اس سے زیادہ کامل نماز پڑھاتا ہو۔ آپ ﷺ اگر [نماز کے دوران] بچے کے رونے کی آواز سنتے تو نماز مختصر کردیتے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی ماں پریشان ہوجائے۔[11]

حضرت انس ؓ ہی سے ایک اور روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنِّي لَأَدْخُلُ فِي الصَّلَاةِ، وَأَنَا أُرِيدُ إِطَالَتَهَا، فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ، فَأَتَجَوَّزُ فِي صَلَاتِي، مِمَّا أَعْلَمُ مِنْ شِدَّةِ وَجْدِ أُمِّهِ مِنْ بُكَائِهِ.[12] میں جب نماز شروع کرتا ہوں تو میں اسے لمبا کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو

۱۰- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۲۶۷۔

۱۱- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۲۷۰۔

۱۲- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۱۶۷، ۲۷۱۔

اپنی نماز مختصر کردیتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ اس کے رونے سے اس کی ماں بہت زیادہ پریشان ہوجاتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ ؓ نبی ﷺ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ، فَإِنَّ فِيهِمُ السَّقِيمَ، وَالضَّعِيفَ وَالْكَبِيرَ، وَإِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ لِنَفْسِهِ فَلْيُطَوِّلْ مَاشَاءَ.[13] تم میں سے کوئی شخص جب لوگوں کو نماز پڑھا رہا ہو تو ہلکی پڑھائے، کیوں کہ ان میں بیمار بھی ہوتے ہیں کمزور بھی اور بوڑھے بھی۔ اور جب تم انفرادی نماز پڑھو تو جتنی چاہے لمبی کرے۔

● عُسر کے بُرے اثرات

نبی ﷺ کسی معاملے میں تشدد کا راستہ اختیار کرنے پر سختی کے ساتھ نکیر فرماتے تھے جب کہ وہ کوئی ذاتی اور وقتی جذبہ نہ ہوتا بلکہ اس کے ایک سنت جاریہ بننے کا خدشہ ہوتا تھا اور کوئی جماعت اس کی پیروی شروع کرتی تھی۔ اس کی مثال ہمیں ان تین افراد کے معاملے میں ملتی ہے جنھوں نے نبی ﷺ کے طریقے کے خلاف اپنا ایک طریقہ اپنا لیا تھا۔ اگرچہ ان کا ارادہ بھلائی اور تقرب الی اللہ کے سوا کوئی نہیں تھا مگر آپ ﷺ نے انھیں اس طریقے سے منع فرمایا۔

حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ تین آدمی نبی ﷺ کے ازواجِ مطہرات کے حجروں کے پاس آئے اور انھوں نے نبی ﷺ کی عبادت کے بارے میں دریافت کیا۔ جب ان کو بتایا گیا تو گویا ان کو آپ ﷺ کی عبادت کم معلوم ہوئی۔ وہ کہنے لگے: ہمارا تو نبی ﷺ سے کوئی موازنہ نہیں ہوسکتا۔ آپ ﷺ کے تو اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کردیے گئے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ میں تو ساری ساری رات نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔ تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے دور رہوں گا اور شادی نہیں کروں گا۔

رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آئے اور فرمایا:

۱۳- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۲۷۱۔

أَنتُمُ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَا وَاللهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لَكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ، وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي.[14] وہ تم لوگ ہو جنھوں نے یہ یہ باتیں کہی ہیں؟ خبردار! میں تم میں ہر ایک سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور زیادہ متقی ہوں، مگر میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں، اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔ جس نے میرے طریقے سے منہ موڑا وہ میرے ساتھ نہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ[15] [متشدد اور انتہا پسند ہلاک ہوگئے] یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ دہرائی۔ مُتَنَطِّعُونَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی مسئلے میں بے محل اور بلاضرورت تشدد کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ فَسَدِّدُوا، وَقَارِبُوا، وَأَبْشِرُوا، وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ.[16] دین آسان ہے۔ دین سے جو بھی الجھا ہے اس پر دین غالب آیا ہے۔ پس تم درست رویہ اختیار کرو، قربت حاصل کرو، پر امید رہو۔ اور صبح، شام اور کسی حد تک اندھیرے سے مدد لو۔

بخاری کی ایک اور روایت میں ہے:

سَدِّدُوا وَقَارِبُوا، وَاغْدُوا وَرُوحُوا، وَشَيْءٌ مِنَ الدُّلْجَةِ، اَلْقَصْدَ الْقَصْدَ، تَبْلُغُوا درست رویہ اپناؤ، صبح نکلو، شام کو نکلو اور کسی حد تک اندھیرے میں۔ اعتدال، اعتدال۔ تم اپنے مقصد پر پہنچو گے۔

إِلَّا غَلَبَهُ کا مطلب یہ ہے کہ دین اس پر غالب ہو جائے گا اور یہ مقابلہ کرنے والا دین

۱۴- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۸۸۵۔

۱۵- اس حدیث کو امام مسلم [۲۶۷۰] اور ابوداؤد [۴۶۰۸] نے روایت کیا ہے۔

۱۶- اسے امام بخاری اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۱۶۱۱۔

کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ کیوں کہ دین کے طریقے بہت زیادہ ہیں۔

غَدْوَةٌ صبح کے وقت چلنے کو کہتے ہیں، رَوْحَةٌ شام کے وقت چلنے کے معنی میں ہے اور دُلْجَةٌ رات کے آخری حصے میں چلنے کو کہتے ہیں۔ یہ ایک استعارہ اور تمثیل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی اطاعت کے بارے میں دلچسپی اور فراغت کے اوقات کو کام میں لاؤ، تاکہ تمھیں نہ تھکاوٹ محسوس ہو اور نہ اکتاہٹ، اور اپنے مقصد کو بھی حاصل کرو۔ جیسا کہ تجربہ کار مسافر ان اوقات میں چلتا ہے۔ اس طرح وہ بھی آرام سے چلتا ہے اور اس کی سواری پر بھی آسانی ہوتی ہے۔ نتیجتاً وہ بغیر کسی تھکاوٹ کے اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ واللہ اعلم

● عُسر کا ایک عملی نمونہ

مجھے اس بات سے بہت دکھ ہوا کہ مملکت سعودیہ کے محکمۂ حج نے دو سو ستر حجاج کے جاں بحق ہونے کی تصدیق کی ہے۔ یہ لوگ شیطانوں کو کنکریاں مارتے ہوئے بھیڑ میں گر کر دوسروں کے پاؤں کے نیچے کچلے گئے۔ اور یہ بھیڑ اس وجہ سے بن گئی تھی کہ وہ زوال کے بعد ہی کنکریاں مارنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مگر بڑی تعداد میں ہلاکتوں کے باوجود بعض علما اب تک یہی فتویٰ دیتے ہیں کہ زوال سے پہلے کنکریاں مارنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ حالانکہ نبی ﷺ نے حج کے معاملے میں بڑی آسانیاں رکھی ہیں۔ حج کے معاملے میں جب بھی آپ سے کوئی سوال پوچھتا کہ اس نے فلاں کام مقدم یا مؤخر کیا ہے تو آپ ﷺ یہی فرماتے تھے کہ اِفْعَلْ وَلَا حَرَجَ [کرو کوئی بات نہیں] فقہا نے بھی کنکریاں مارنے میں بڑی آسانی فرمائی ہے اور اس حد تک جواز فراہم کیا ہے کہ حاجی آخری دن کے لیے بھی مؤخر کر سکتا ہے۔ اور عذر کی وجہ سے اس میں انابت بھی جائز رکھی ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو احرام سے فارغ ہونے کے آخر میں بھی انجام دیا جا سکتا ہے۔

زوال سے پہلے رمی کو تین بڑے بڑے ائمہ نے جائز قرار دیا ہے۔ ایک فقیہ المناسک [یعنی مسائلِ حج کے ماہر] حضرت عطاء، دوسرے یمن کے فقیہ حضرت طاؤس، یہ دونوں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں، اور تیسرے فقیہ اہلِ بیت ابوجعفر الباقر محمد بن علی بن الحسین۔

اگر اس کے جواز کا قول کسی فقیہ نے بھی نہ کیا ہوتا تب بھی ضرورت کی بنا پر ہمارے اوپر لازم تھا کہ اس میں اللہ کے بندوں کے لیے آسانی کردیتے اور چوبیس گھنٹوں میں کسی بھی وقت کنکریاں مارنے کو جائز قرار دیتے تاکہ مسلمان ہلاکت سے بچتے۔

اللہ تعالیٰ شیخ عبداللہ بن زید المحمود کو جزائے خیر عطا فرمائے جنھوں نے تین سو سال سے زیادہ عرصہ پہلے اپنے رسالے یسر الاسلام میں زوال سے پہلے کنکریاں مارنے کا فتویٰ دیا تھا۔

● ہنگامی ضروریات کا اعتراف

یہاں پر مطلوبہ تیسیر میں یہ بات بھی داخل ہے کہ آدمی ان ضروریات کا اعتراف کرلے جو انسانی زندگی میں ہنگامی طور پر پیش آسکتی ہیں۔ خواہ انفرادی ضروریات ہوں یا اجتماعی۔ شریعت نے ان ضروریات کے لیے اپنے خاص احکام مقرر کیے ہیں۔ اس کی بنا پر شریعت نے کھانے، پینے، پہننے، اور لین دین کے حوالے سے بعض ایسی چیزوں کو بھی حلال قرار دیا ہے جو حالتِ اختیار میں ممنوع تھے۔ اور اس سے زیادہ یہ کہ بعض حالات میں اس نے حاجت کو بھی ضرورت کا قائم مقام بنادیا ہے، خواہ خاص حاجت ہو یا عام۔ اس کا مقصد بھی امت کے لیے آسانی اور اس سے دفع حرج ہی تھا۔

اس کی اصل بنیاد قرآن کریم کا وہ حکم ہے جو چار مقامات پر حرام اشیاء کا ذکر کرنے کے بعد مذکور ہے۔ اس حکم میں ان لوگوں کو گناہ سے بری قرار دیا گیا ہے جو مضطر ہوکر بغاوت اور تجاوز سے بچتے ہوئے ان میں سے کچھ کھالیتے ہیں:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (البقرہ ۲:۱۷۳)

جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے، بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے۔

اور حدیث میں مردوں کے لیے ریشم پہننے کی حرمت بیان کرنے کے بعد مذکور ہے کہ

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اپنے جسم میں خارش کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے انھیں اس حاجت کی بنا پر اس کے پہننے کی اجازت دے دی۔

● زمان ومکان کی تبدیلی سے فتویٰ میں تبدیلی

اس تیسیر میں یہ بات بھی شامل ہے کہ لوگوں پر طاری ہونے والی تبدیلیوں کا اعتراف کیا جائے، اس تبدیلی کا سبب خواہ فساد زمانہ ہو ــــ جیسا کہ فقہائے کرام فرماتے ہیں ــــ یا اس کی وجہ معاشرے کا ارتقا ہو، یا پھر اس کی وجہ ان پر ضروریات پیش آنا ہو۔ اسی وجہ سے فقہائے شریعت نے زمان ومکان کی تبدیلی کے ساتھ اور عرف وعادت کے تبدیل ہونے کے ساتھ اپنی رائے بدل دینے کو جائز قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا استدلال صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل سے ہے، جن کے بارے میں نبی ﷺ نے حکم دیا ہے کہ ان کی سنت کی پیروی کی جائے اور اسے مضبوطی سے تھامے رکھا جائے۔ بلکہ اس پر تو خود سنتِ رسول بھی دلالت کررہی ہے اور اس سے بھی پہلے قرآن پاک نے اس کی تائید کی ہے۔ جیسا کہ ہم نے انھیں اپنے رسالے عواملُ السَّعةِ والمُرُونَةِ فِي الشَّريعةِ الإسلاميةِ میں بیان کیا ہے۔

یہ چیز ہم پر یہ بات لازم کرتی ہے کہ ہم پہلے ادوار کی کہی ہوئی باتوں اور سابقہ ادوار میں اختیار کی گئی آرا کے بارے میں نظر ثانی کریں۔ ممکن ہے کہ یہ اُس دور کے مطابق ہوں لیکن ہمارے دور کے لیے مناسب نہ ہوں۔ کیوں کہ اس دور میں بہت سی نئی نئی چیزیں پیدا ہوئی ہیں جن کا پہلے والے لوگ تصور بھی نہ کرسکتے تھے۔ پھر اتنے نمایاں فرق کے باوجود انھی اقوال کو آج کے دور میں استعمال کرنا اسلام اور امت مسلمہ کے لیے اچھا نہیں ہے۔ اس سے اسلامی دعوت کی صورت بگڑتی ہے۔ مثلاً دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب میں بانٹنا [اور تیسری صورت کو سرے سے مسترد کرنا]، یہ قرار دینا کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے تعلق صرف جنگ کا ہے، اور یہ کہ جہاد امت مسلمہ پر فرض کفایہ ہے● ...... یہ اور اس طرح کے دوسرے اقوال۔

● اس فقرے میں مؤلف کا اشارہ بعض فقہا کی اس رائے کی طرف ہے کہ حالت امن میں بھی جہاد امت کے کسی نہ کسی گروہ

حقیقت یہ ہے کہ یہ اقوال ہمارے دور میں درست نہیں رہے۔ اور اسلام میں ایسی کوئی محکم نص نہیں ملتی جو ان کی تائید کرتی ہو۔ بلکہ بہت سی نصوص ان اقوال کے خلاف ہیں۔

اسلام اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ تمام انسانوں کے درمیان تعارف کا رشتہ قائم ہے:

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا. (الحجرات ۴۹:۱۳)

ہم نے تمھاری قومیں اور برادریاں بنادیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

وہ جنگ سے اجتناب اور امن کو ایک نعمت گردانتا ہے۔ غزوۂ خندق کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ. (الأحزاب ۳۳:۲۵)

اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا، وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یوں ہی پلٹ گئے، اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہوگیا۔

وہ صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرار دیتا ہے اور اس کے ذریعے رسول اللہ ﷺ پر احسان جتاتا ہے۔ اسی بارے میں سورۂ فتح نازل ہوئی:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا. (الفتح ۴۸:۱)

ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی۔

اس سورت میں نبی ﷺ اور مسلمانوں پر اس بات کا احسان بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں گروہوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے روک لیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ (الفتح ۴۸:۲۴)

وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک

بقیہ: پر فرض ہے اور سال میں کم از کم ایک بار دشمن پر حملہ ضروری ہوگا ورنہ پوری امت گناہ گار ہوگی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مؤلف کی کتاب فقہ الجہاد، ۱/۸۹-۹۰۔ (مترجم)

دیے، جبکہ اللہ تمھیں ان پر غالب کر چکا تھا۔

رسول اللہ ﷺ لفظ حرب [جنگ] سے سخت نفرت کرتے تھے۔ آپ فرماتے تھے:

أَصْدَقُ الْأَسْمَاءِ حَارِثٌ وَهَمَّامٌ، وَأَقْبَحُ الْأَسْمَاءِ حَرْبٌ وَمُرَّةُ سب سے سچّا [اور اچھا] نام حارث اور ہمام ہے اور سب سے برا نام حرب اور مُرّہ ہے۔

وہ جہاد جسے اسلام نے سابقہ زمانوں میں لازم کر دیا تھا، وہ تھا جس کا ایک واضح ہدف تھا اور وہ یہ کہ اسلام کی دعوت کے راستے سے مادی مشکلات کو ختم کیا جائے۔ مگر اُس وقت آمر اور شہنشاہ اس بات میں رکاوٹ تھے کہ ان کے عوام تک اسلام کی دعوت پہنچائی جائے۔ اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے پاس خطوط بھیجے اور انھیں اسلام کی دعوت دی۔ ان سے کہا کہ اگر تم ایمان نہیں لاتے تو اپنے اور اپنی قوم کے ایمان نہ لانے کا گناہ تمھارے سر ہوگا۔ کیوں کہ تم نے اپنی قوموں کو کسی خارجی آواز کے سننے سے معذور کر رکھا ہے۔ تمھیں یہ خوف ہے کہ یہ آواز انھیں نیند سے بیدار کر دے گی اور انھیں اپنی ذات کا شعور دلائے گی۔ اس طرح لوگ خواب غفلت سے بیدار ہوں گے اور اپنے طاغوتوں کے خلاف چڑھ دوڑیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ ان بادشاہوں نے مسلمان داعیوں کو قتل کیا یا مسلمانوں سے جنگ کی یا اس کے لیے تیاری کی اور انھیں اپنے گھر میں بھی جنگ پر مجبور کرنے کی دھمکی دی۔●

رہا آج کا معاملہ تو آج دعوت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، خاص طور پر ان ممالک میں جن میں اظہار رائے کی آزادی ہے اور وہاں مختلف رنگ ونسل کے لوگوں کو اپنی آواز بلند کرنے کے لیے راستے کھلے ہیں۔ ایسے ممالک میں مسلمان تقریر وتحریر کے ذریعے اور اپنے عمل کے ذریعے اپنی دعوت لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ ان کے لیے ممکن ہے کہ میڈیا کے ذریعے اسلام کی دعوت پوری دنیا میں مختلف قوموں تک پہنچا دیں، اور ہر قوم سے اسی کی زبان میں بات کریں تا کہ ان تک اپنی بات درست طریقے سے پہنچا سکیں۔

● مؤلف نے یہاں جہاد کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ مجمل ہونے کی وجہ سے کھٹکتے ہیں۔ جہاد کے بارے میں ان کے مؤقف کو تفصیل سے جاننے کے لیے ان کی نئی کتاب فقہ الجہاد کو دیکھنا چاہیے۔ (مترجم)

مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اس معاملے میں بہت زیادہ کوتاہی کر رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے وہ اس بات کے لیے جواب دہ ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے زمین میں رہنے والی قومیں اسلام سے کیوں بے خبر رہیں۔

● تدریج کا لحاظ

ہم جس تیسیر کی بات کر رہے تھے اس کے حوالے سے ایک بات یہ ہے کہ تدریج کی سنت کو ملحوظ رکھا جائے جو اللہ کی طرف سے عالمِ تخلیق میں بھی جاری ہے اور عالمِ تشریع میں بھی۔ اللہ تعالیٰ کے نظام تشریع [قانون سازی] میں یہ سنت نماز اور روزے فرائض کے وجوب میں بھی جاری ہے اور محرمات کی تحریم میں بھی۔

اس میں سب سے نمایاں اور معروف مثال شراب کی ہے جسے کئی مراحل میں حرام کیا گیا۔ اس کی یہ قانونی تاریخ اتنی مشہور ہے کہ دین کا کوئی طالب علم اس سے بے خبر نہیں ہے۔

اور شاید یہ تدریج کی سنت ہی تھی جس نے اسلام کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ نظامِ غلامی کو جاری رکھے، جو ظہور اسلام کے وقت پوری دنیا میں رائج تھا اور اس کو بیک قلم مسترد کرنا پوری معاشرتی اور معاشی زندگی میں ایک زلزلہ برپا کرنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ حکمت یہی تھی کہ اس کے راستوں کو زیادہ سے زیادہ تنگ کیا جائے اور جب ممکن ہو تو اس پر مکمل پابندی لگائی جائے۔ پھر غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کے لیے بہت سے راستے پیدا کیے اور ان کے مصارف کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی تاکہ اس طرح تدریج کے ساتھ اس نظام کو ختم کرنے کا راستہ نکل آئے گا۔

اگر ہم ایک حقیقی اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہم یہ خیال تک ذہن میں نہیں لاسکتے کہ ایک فرمان سے یہ کام خود بخود ہو جائے گا یا کوئی بادشاہ، کوئی لیڈر، یا کوئی پارلیمنٹ ایک فیصلہ صادر کرے گی اور اسے سارے لوگ مان لیں گے۔ یہ سب کچھ ایک تدریج کے ساتھ ممکن ہوگا۔

میرا مطلب ہے کہ اس کے لیے فکری، اخلاقی اور معاشرتی سطح پر بڑی تیاری کی ضرورت ہوگی اور ان غلط نظاموں کا شرعی متبادل فراہم کرنا ہوگا جن پر باطل کا نظام ایک عرصہ سے رائج ہے۔

تدریج سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ ہم محض بات کو ٹالتے جائیں اور نفاذ اسلام میں بے جا تاخیر کریں، اور تدریج کا بہانہ بنا کر عوام کا اپنے ممالک میں اللہ کا حکم نافذ کرنے اور اس کی شریعت کو عملی جامہ پہنانے کا مطالبہ ٹھنڈا کریں۔ بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہدف کا تعین کیا جائے، اس کی منصوبہ بندی کی جائے اور پوری سمجھ داری سے اس کے لیے مراحل طے کرنا ہے، تاکہ ایک مرحلہ دوسرے مرحلے کے لیے سہارا بن سکے۔ اور یہ تب ممکن ہوگا کہ ہم پھونک پھونک کر قدم رکھیں، نظم وضبط کے ساتھ آگے بڑھیں اور سارے مراحل میں پختگی کا خاص خیال رکھیں۔ تاکہ یہ سفر اپنے آخری اور فطری انجام کو پہنچے جس میں اسلام کا عملی قیام ہوگا، مگر پورے کے پورے اسلام کا نہ کہ اس کے بعض پہلوؤں کا۔

یہ وہی طریق کار ہے۔ جس پر نبی ﷺ جاہلی زندگی کو اسلامی زندگی میں تبدیل کرنے کے لیے عمل پیرا رہے۔ جیسا کہ ہم نے اسے پچھلی فصل میں بیان کیا ہے۔

اس سلسلے میں یہ موقف اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے جسے مؤرخین نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، جسے مسلمان علما پانچواں خلیفہ راشد شمار کرتے ہیں اور ثانی العمرین کے نام سے مشہور ہیں، کیوں کہ وہ اپنے نانا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نہج پر چل رہے تھے، ایک دن ان کے بیٹے نے ـــ جو ایک تقویٰ دار اور جرأت مند نوجوان تھا ـــ ان سے کہا: ابا جان! آپ شریعت کا نفاذ کیوں نہیں کرتے؟ خدا کی قسم! مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ مجھے اور آپ کو حق کی خاطر کھولتی ہوئی دیگ میں پھینک دیا جائے!!

یہ متقی اور غیور نوجوان اپنے باپ سے، جس کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے امور کا نگران بنایا تھا، یہ چاہتا تھا کہ وہ مظالم کا قلع قمع کر دیں اور فساد وانحراف کو بیک قلم منسوخ کریں، اور اس میں کسی تاخیر اور سستی کا مظاہرہ نہ کریں۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہو سو ہو۔

مگر اللہ کے نور سے دیکھنے والے باپ نے اپنے بیٹے سے کہا: بیٹا! جلدی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ قرآن میں شراب کی مذمت بیان کی اور تیسری بار جا کر اسے حرام کر دیا۔ مجھے خوف ہے کہ اگر میں نے لوگوں پر حق کو یکبارگی لازم کر دیا تو وہ اسے یکبارگی چھوڑ دیں گے۔ اور یہ ایک بڑا فتنہ ہوگا۔[17]

خلیفہ راشد کا ارادہ یہ تھا کہ معاملات کو حکمت کے ساتھ حل کریں اور اس میں تدریج سے کام لیں۔ انھوں نے اس سنت الٰہی کی پیروی کی جو حرمت شراب کے بارے میں اپنائی گئی تھی۔ وہ لوگوں کو گھونٹ گھونٹ کر حق پلانا چاہتے تھے۔ اور وہ انھیں ایک ایک قدم اٹھا کر اپنی منزل کی طرف لے جا رہے تھے۔ یہی صحیح فقاہت ہے۔[18]

● مسلمانوں کی صحیح تربیت

موجودہ دور میں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کی اہمیت سے تو کسی کو انکار نہیں ہے مگر اس حوالے سے آج کے دور میں یہ جاننا انتہائی اہم اور لازم ہے کہ کون سی چیز کو مقدم کیا جائے اور کون سی مؤخر، اور وہ کون سی چیز ہے جو مسلمانوں کی تربیت سے نکال دینے کی ہے۔

دینی معاہد اور اسلامی کلیات وجامعات میں بعض ایسی اشیاء پڑھائی جاتی ہیں جو طلبہ کی ساری صلاحیتوں، اوقات اور ماحصل پر حاوی ہو جاتی ہیں، اگر وہ اس کا نصف یا چوتھائی حصہ بھی ان اشیاء میں لگاتے جو ان کے دین ودنیا کے لیے زیادہ مفید تھیں تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

مثلاً ہم جب کلیہ اصول دین میں تھے اس وقت ہم الایجی کی کتاب المواقف اور اس کی شرح الجرجانی پڑھتے تھے۔ اس کتاب میں ہم مقدمہ اور طبیعیات کے چند ہی فقرے پڑھ پاتے تھے۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ہم اس کی کسی ایک فصل کو بھی پورا پڑھتے ہوں۔ اور ہم اس کو سمجھنے اور ہضم کرنے میں بہت مشقت اٹھاتے تھے۔ ہمارے شیوخ بھی اس کی تشریح کرنے اور اس

۱۷- دیکھیے: الموافقات للشاطبی ۲:۹۴۔

۱۸- مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب: مدخلٌ لِدراسۃِ الشّریعۃِ الإسلامیۃ، فصل: الواقعیۃ ص ۱۲۰-۱۲۱۔

کے بند دریچوں کو کھولنے اور اس کے معانی کو واضح کرنے میں بڑی مشقت اٹھاتے تھے۔

اگر ہم یہ وقت اور یہ محنت دور حاضر کے فلسفوں کا تعاقب کرنے اور ان کا علمی وفنی ابطال کرنے میں صرف کرتے یا اسلام کے بنیادی مآخذ میں لگ جاتے اور ائمہ کبار کی شروح کا احاطہ کرتے، یا اس محنت کو اسلام کے تجدیدی مکاتبِ فکر کے بنیادی افکار اور مفاہیم سے پردہ اٹھانے میں صرف کر دیتے تو اس سے ہمیں بہت فائدہ پہنچتا۔

ان مدارس اور جامعات میں اب تک یہ کوتاہی برتی جاتی ہے۔ ان میں بعض مواد حد سے زیادہ طویل ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں بعض اہم چیزوں کا صحیح حق ادا نہیں ہوتا۔

علمِ کلام کو اب تک اسی قدیم طریقے سے پڑھایا جاتا ہے حالانکہ اس میں تغیر وتبدل اور تجدید کی سخت ضرورت ہے تاکہ وہ فلسفہ یونان کے اسلوب میں نہیں بلکہ قرآن کی زبان سے بات کرے جو فطرت کو خطاب کرتا ہے اور عقل اور دل کو ایک ساتھ اپیل کرتا ہے۔ اس سلسلے میں امام ابن الوزیر کی کتاب ترجیحُ أسالیبِ القرآنِ علی أسالیبِ الیونانِ ایک قابل قدر کتاب ہے۔

اسی طرح ہمارا نوجوان اب اس بات کا سخت محتاج ہے کہ وہ جدید سائنس اور عصر حاضر کے علوم وفنون سے مسلح ہو اس کے ذریعے وہ ان دلائل وبراہین سے بھی آگاہی حاصل کرے گا جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں، جو ایمان کی تائید کرتی ہیں اور کفر والحاد کی جڑ کاٹتی ہیں۔ جیسا کہ اس کے متعلق مشہور کتابوں میں مذکور ہے۔ مثلاً: العلمُ یدعو إلی الإیمانِ، اللہ یتجلّی في عصرِ العلمِ، مع اللہِ فی السماءِ اور اللہُ والعلمُ الحدیثُ وغیرہ۔

علم فقہ بھی اس بات کی شدید ضرورت محسوس کر رہی ہے کہ اس میں لوگوں کے لیے آسانی پیدا کی جائے اور اسے جدید انداز میں پیش کیا جائے۔ اس میں ان چیزوں کا بھی اہتمام کیا جائے جن کی اس دور میں لوگوں کو ضرورت ہے۔ جیسے کمپنیوں کا مسئلہ، مالی معاملات، بنک کے مسائل، بیع وشرا کی جدید قسمیں، جدید بین الاقوامی تعلقات وغیرہ۔ اسی طرح یہ کہ پرانے

اوزان اور پیمانوں کو جدید زبان میں پیش کیا جائے۔

اس کے پہلو بہ پہلو عام مسلمانوں کو بھی علم کی دولت سے آراستہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے مختلف قسموں میں تقسیم کر کے اسلام کے رنگ میں رنگنا چاہیے۔ ان علوم میں سے بعض وہ ہیں جو تعلیم یافتہ لوگوں کو مختلف تمدنی مہارتوں کے حوالے سے دینے کی ضرورت ہے اور بعض وہ ہیں جن کی عوام، ملازمت پیشہ افراد، کاشت کاروں اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کو ضرورت پیش آتی ہے۔ اکثر اوقات واعظین، مدرسین اور بڑی بڑی کتابیں تصنیف کرنے والے مؤلفین لوگوں کے دماغ کو ان دینی افکار و معلومات سے بھرتے ہیں جو انھوں نے رٹے ہوئے ہوتے ہیں اور انھی کو دہراتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہوتی، نہ محکمات شریعت میں ان پر کوئی دلیل قائم کی گئی ہو۔ اکثر اوقات ان کا مصدر تفسیروں کی اسرائیلی روایات ہوتی ہیں، یا وہ موضوع اور واہیات احادیث جن کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ جیسے: 'حقیقت اور شریعت'، 'حقیقت محمدیہ'، 'نبی سب سے پہلی مخلوق خدا ہے' اور اسی طرح عالم الاولیا اور ان کی کرامات کے بارے میں طویل و عریض بحثیں، جن پر کتاب و سنت سے کوئی دلیل موجود ہے، نہ اس کے بارے میں کوئی سائنسی دلیل ہے اور نہ کوئی منطق اس کی تائید کرتی ہیں۔

اسی طرح بعض لوگ مذاہب کے مابین اختلافی مسائل کو ہوا دینے میں مشغول رہتے ہیں، کچھ لوگ تصوف اور صوفیوں کے خلاف میدان جنگ میں اتر آئے ہیں، حالانکہ ان میں سنت کے پیروکار بھی ہوتے ہیں اور بدعات پر عمل پیرا بھی، سیدھے راستے پر قائم بھی اور اس سے ہٹنے والے بھی۔ ہمارا فرض ہے کہ ان کے درمیان فرق کریں اور سب کے بارے میں ایک ہی حکم نہ لگائیں۔

● غلطی سے بالاتر معیار

ان معیارات میں سے، جن کی طرف کسی مسئلے میں راجح و مرجوح اور مقدم اور مؤخر معلوم کرنے کے لیے رجوع کیا جاسکتا ہے، ایک یہ ہے کہ ہر چیز کا اسی قدر اہتمام کیا جائے جس قدر

قرآن نے اس کا اہتمام کیا ہوتا ہے۔

جس چیز کی طرف قرآن کریم نے پوری توجہ دی ہو اور اسے اپنی آیات اور سورتوں میں کثرت سے ذکر کیا ہو اور اسے اپنے امر و نہی میں مؤکد کر دیا ہو اور اس کے بارے میں وعد و وعید آئی ہو تو ہمارے لیے بھی ضروری ہوگا کہ اس کو زیادہ اہمیت دیں اور وہ ہماری سوچ اور عمل میں اور ہماری منصوبہ بندی اور ترجیحات میں زیادہ اہمیت کا مقام حاصل کر لے۔ مثلاً:

اصول عقائد جیسے: اللہ پر ایمان، اس کے پیغمبروں اور رسولوں پر ایمان، آخرت پر ایمان اور ان کے بدلے میں مقرر کردہ جزا و سزا، جنت اور جہنم وغیرہ پر ایمان۔

اصول عبادات و شعائر جیسے: نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، اللہ کا ذکر، تسبیح، تحمید، استغفار، توبہ، توکل، اللہ کی رحمت کی امید اور اس کے عذاب سے خشیت، اس کی نعمتوں پر شکر اور اس کی آزمایشوں پر صبر، اور اس کے علاوہ بہت سی قلبی اور باطنی عبادتیں اور اعلیٰ ربانی مقامات وغیرہ۔

اصول فضائل، مکارم اخلاق، صفات حسنہ جیسے: سچائی، امانت، میانہ روی، عفاف، حیا، تواضع، نیک کاموں میں خرچ، مومنوں کے لیے جھکے رہنا، کافروں کے لیے سخت ہونا، کمزوروں پر رحم، والدین کے ساتھ حسن سلوک، صلہ رحمی، پڑوسی کی عزت، مسکین، یتیم اور مسافر کی نگہداشت۔

اس کے بعد جو مسائل ایسے ہیں جن کا قرآن نے کم اہتمام کیا ہے، ہم بھی ان کو اتنی ہی اہمیت دیں اور اس میں مبالغے سے کام نہ لیں۔ جیسے: معراج کا مسئلہ، جسے قرآن نے صرف ایک آیت میں بیان کر دیا ہے اور اسے اتنی اہمیت بھی نہیں دی گئی جتنی کہ غزوات کو نصیب ہوئی ہے کیوں کہ ان کے بارے میں تو پوری پوری سورتیں نازل ہوئی ہیں۔

پھر ولادت نبوی کا معاملہ ہے تو اس کی طرف قرآن نے کوئی التفات نہیں کیا۔ اس سے خود بخود یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ اسلامی زندگی میں کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کا نہ کسی معجزے سے تعلق ہے جیسا کہ میلادِ مسیح علیہ السلام کا معاملہ ہے اور نہ اس پر کسی عمل یا کسی عبادت کی بنیاد قائم ہے جس کا مسلمانوں سے وجوبی یا استحبابی طور پر مطالبہ کیا جاتا ہو۔

یہ وہ معیار ہے جس میں غلطی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ قرآن ملت اسلامیہ کا خلاصہ، دین کی بنیاد اور اسلام کا سرچشمہ ہے اور سنت اس کی تشریح اور بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ أَقْوَمُ (بنی اسرائیل ۱۷:۹)

حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔

اور قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ. يَهْدِيْ بِهِ اللهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ بِإِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۝ (المائدۃ ۵:۱۵-۱۶)

تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں، سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

مزید فرمایا:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (النحل ۱۶:۸۹)

اور ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کردی ہے جو ہر چیز کی صاف صاف وضاحت کرنے والی ہے اور ہدایت و رحمت اور بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے سرِ تسلیم خم کردیا ہے۔

ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ان اصولوں کا بیان ہے جو ضروری ہیں تاکہ دین ایک مضبوط بنیاد پر قائم ہو جائے۔ کوئی بھی ایسا اصول نہیں ہے جس کی ضرورت اسلامی زندگی کو ہوسکتی تھی مگر وہ قرآن سے برآمد ہوتی ہے، یا براہ راست اور یا پھر استنباط کے ذریعے سے۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ بات منقول ہے کہ انھوں نے کہا: اگر مجھ سے اونٹ کی مہار بھی گم ہو جائے تو میں اسے کتاب اللہ سے برآمد کرلوں گا۔

❖❖❖

۶

عمل میں ترجیحات

دائمی عمل کی عارضی عمل پر ترجیح

قرآنِ کریم نے بھی یہ بات بیان کی ہے اور سنت نے بھی اس کی وضاحت کی ہے کہ اللہ کے ہاں اعمال کے مختلف مراتب ہیں۔ ان میں بعض اعمال اللہ تعالیٰ کے نزدیک دوسروں سے زیادہ افضل اور پسندیدہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۘ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۘ (التوبة ۹:۱۹-۲۰)

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھیرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخر پر اور جس نے جاں فشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ اللہ کے نزدیک تو انھی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا، وہی کامیاب ہیں۔

اور صحیح احادیث میں بھی یہ بات بیان ہوئی ہے:

اَلْإِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً؛ أَعْلَاهَا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ[1] ایمان کے ۷۰ کے لگ بھگ شعبے ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ شعبہ لا الٰہ

۱- یہ حدیث ایک بڑی جماعت نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ بخاری میں اس کے الفاظ ہیں: بِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ،

الا اللہ ہے اور ادنیٰ یہ کہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹایا جائے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شعبے قدر و قیمت اور درجے کے لحاظ سے آپس میں مختلف ہیں اور یہ تفاوت بلا وجہ نہیں ہے بلکہ یہ کچھ معیارات اور بنیادوں پر مبنی ہے جن کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ ہم یہاں اسی معاملے سے بحث کریں گے۔

ان معیارات میں سے ایک یہ ہے کہ عمل دائمی ہو۔ اور دائمی کا مطلب یہ ہے کہ اس کا فاعل اس پر ہمیشہ قائم رہے اور اس کی پابندی کرے۔ برخلاف اس عمل کے جسے آدمی کبھی کرے اور کبھی نہ کرے۔

اسی کے بارے میں وہ حدیث آئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ **أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ**[2] اللہ کے ہاں محبوب ترین عمل وہ ہوتا ہے جسے ہمیشہ کیا جائے، خواہ وہ کم ہی ہو۔

اور شیخین نے مسروق سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا: رسول اللہ ﷺ کو کون سا عمل سب سے زیادہ محبوب تھا؟ وہ کہنے لگی: وہ جس میں دوام ہو۔[3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی روایت ہے کہ نبی ﷺ اس کے ہاں تشریف لائے۔ اس کے ہاں ایک عورت بیٹھی تھی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ یہ فلاں عورت ہے۔ اور پھر اس کی نمازوں کا ذکر کیا، مطلب یہ کہ یہ عورت بہت زیادہ نمازیں پڑھتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

مَهْ! عَلَيْكُمْ بِمَا تُطِيقُونَ، فَوَاللّٰهِ، لَا يَمَلُّ اللّٰهُ حَتّٰى تَمَلُّوا ۔ایسا نہ کرو۔ تم لوگ اتنی ہی عبادت کرو جتنی کر سکتے ہو۔ خدا کی قسم! اللہ کو کوئی اکتاہٹ نہیں ہوتی، مگر تم اکتا جاؤ گے۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: کہ نبی ﷺ کے ہاں محبوب ترین دین داری

بقیہ ا: مسلم میں: بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ ،اور ایک روایت میں بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ ہے، ترمذی اور نسائی میں بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ ان سب نے اس حدیث کو کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے، البتہ ابوداؤد نے کتاب السنۃ میں اور ابن ماجہ نے مقدمہ میں۔

۲- متفق علیہ، بروایت حضرت عائشہؓ، دیکھیے :صحیح الجامع الصغیر ۱۶۳۔

۳- متفق علیہ، بحوالہ اللؤلؤ والمرجان ۴۲۹۔

وہ تھی جس پر آدمی دوام اختیار کرے۔[4]

مَهْ کا لفظ ڈانٹنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور یہاں اس بات پر ڈانٹا گیا آپ کو عبادت کے لیے شدید مشقت میں ڈال دے اور اپنے نفس کو اس کی طاقت [illegible] زیادہ پر مجبور کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تھوڑی عبادت پر دوام اختیار کیا جائے تو طاعت کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس کی برکت میں اضافہ ہوتا ہے، برعکس اس کے کہ زیادہ اور پرمشقت عبادت کی جائے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ تھوڑی عبادت پر جب دوام اختیار کیا جائے تو اس میں ترقی ہوتی جاتی ہے اور یہ اس عبادت سے کئی گنا بڑھ جاتی ہے جس کی مقدار تو زیادہ ہو مگر اس میں دوام نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معاملے میں لوگوں کی فطرت میں یہ بات رچ بس گئی ہے کہ 'تھوڑا دائمی' بہتر ہے اس 'زیادہ' سے جو 'عارضی' ہو۔

یہی بات تھی جس کی وجہ سے نبی ﷺ دین میں غلو اور تشدد سے روکا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کو خوف تھا کہ ایک دن آئے گا جب یہ لوگ اس سے اکتا جائیں گے یا بشری کمزوری کی وجہ سے ان کی قوت جواب دے جائے گی۔ اس لیے وہ راستے کے درمیان میں پڑے رہ جائیں گے، پھر وہ نہ آگے جا سکیں گے اور نہ پیچھے ہٹ سکیں گے۔

اسی وجہ سے نبی ﷺ فرماتے ہیں:

عَلَيْكُمْ مِنَ الْأَعْمَالِ بِمَا تُطِيقُونَ، فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوا۔[5] تم اتنے ہی اعمال کرو جتنے کی تمھارے اندر طاقت ہو۔ اللہ کو کوئی اکتاہٹ نہیں ہوتی، مگر تم اکتا جاؤ گے۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

عَلَيْكُمْ هَدْيًا قَاصِدًا (أَيْ مُتَوَسِّطًا) فَإِنَّهُ مَنْ يُّشَادَّ هٰذَا الدِّيْنَ يَغْلِبْهُ.[6] تم لوگ

۴- متفق علیہ، بحوالہ اللؤلؤ والمرجان ۴۴۹۔

۵- متفق علیہ، بروایت حضرت عائشہؓ، دیکھیے :صحیح الجامع الصغیر ۴۰۸۵۔

۶- اس حدیث کو احمد، حاکم اور بیہقی نے حضرت بریدہؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے :صحیح الجامع الصغیر ۴۰۸۶۔

درمیانے راستے پر چلو، اس دین سے جو بھی الجھا ہے مغلوب ہو کر رہا ہے۔

اس حدیث کی وجہ بھی حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے ذکر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں اپنے کسی کام سے نکلا۔ میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی راستے پر مجھ سے آگے آگے جا رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا تو میرا ہاتھ پکڑا۔ ہم ساتھ ساتھ جاتے رہے۔ اس دوران ہم نے راستے میں ایک آدمی دیکھا جو کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہا تھا۔ وہ نماز میں بہت زیادہ رکوع اور سجدے کیے جا رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: أَتَـرَاهُ يُـرَائِـيْ؟! دیکھتے ہو کہ یہ دکھاوا کر رہا ہے؟ میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر اپنے ہاتھ جوڑ کر ان کو سیدھا کیا اور انھیں اوپر اٹھا کر وہ حدیث ارشاد فرمائی جو اوپر مذکور ہے۔[7]

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَاتَشُدُّوْا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ، فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِتَشْدِيْدِهِمْ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ، وَسَتَجِدُوْنَ بَقَايَاهُمْ فِي الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارَاتِ[8] اپنے آپ پر سختی نہ کرو، تم سے پہلے جو لوگ ہلاکت سے دوچار ہوئے ہیں، وہ اسی وجہ سے کہ وہ اپنے آپ پر سختی کرتے تھے۔ تم ان کے گرجوں اور معبدوں میں ان کی نشانیاں دیکھ سکتے ہو۔

۷- اس روایت کو ہیثمی نے مجمع الزوائد ۱/۶۲ میں ذکر کیا ہے اور احمد کہتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔

۸- ہیثمی کہتے ہیں کہ اس حدیث کو طبرانی نے الأوسط اور الکبیر میں نقل کیا ہے اور اس میں عبداللہ بن صالح آیا ہے جو لیث کے کاتب تھے۔ ان کو ایک بڑی جماعت نے ثقہ قرار دیا ہے۔ جبکہ کچھ لوگوں نے اسے ضعیف بھی کہا ہے۔ دیکھیے: مجمع الزوائد ۱/۶۲۔

زیادہ نفع بخش کام کی ترجیح

عمل کی ترجیحات میں سے ایک یہ ہے کہ آپ جو کام کرنا چاہتے ہیں وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نفع بخش ہو۔ پھر وہ جس قدر دوسروں کے لیے مفید ہو گا اس قدر اللہ کے ہاں اس کا مقام و مرتبہ بھی بڑا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد کے جنس سے جو اعمال ہیں وہ ان اعمال سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں جن کا تعلق محض عبادات اور خصوصاً حج سے ہوتا ہے۔ کیوں کہ حج وغیرہ عبادات کا نفع صرف اس شخص کے لیے ہوتا ہے اور جہاد کا نفع پوری امت کے لیے ہوتا ہے۔ اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد ہے جو ہم نے اس سے پہلے بھی نقل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ٥ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ لا اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَاللّٰهِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ٥ (التوبة۹:۱۹-۲۰)

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھیرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخر پر اور جس نے جاں فشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ اللہ کے نزدیک تو انھی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا، وہی کامیاب ہیں۔

اللہ کے ہاں جہاد فی سبیل اللہ کا ثواب اس سے کئی گنا بڑھ کر ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دنیا سے کاٹ کر عبادت کے لیے خالص کر دے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اصحاب رسول میں ایک آدمی کسی وادی سے گزر رہا تھا جس میں میٹھے پانی ایک چھوٹا سا چشمہ تھا۔ وہ اسے بہت پسند آیا اور کہنے لگا: کاش کہ لوگ یہاں سے ہٹ جائیں تو میں یہاں اس وادی میں اقامت پذیر ہو جاؤں۔ (اس کا مطلب یہ تھا کہ میں یہاں عبادت کرتا رہوں) لیکن میں یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر ہرگز نہیں کروں گا۔ پھر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ارادے کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَفْعَلْ، فَإِنَّ مَقَامَ أَحَدِكُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ أَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِهٖ فِي بَيْتِهٖ سَبْعِينَ عَامًا، أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللهُ لَكُمْ وَيُدْخِلَكُمُ الْجَنَّةَ، أُغْزُوا فِي سَبِيلِ اللهِ، مَنْ قَاتَلَ فِي سَبِيلِ اللهِ فَوَاقَ نَاقَةٍ، وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ[9] یہ کام نہ کرو۔ اس لیے کہ تم میں سے ایک شخص اللہ کی راہ میں ایک لمحے کھڑا رہے یہ اس کے لیے اس سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے کہ وہ اپنے گھر میں ستر (۷۰) سال تک نمازیں پڑھتا رہے۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمھاری مغفرت کرے اور تمھیں جنت میں داخل کرے؟ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ جو شخص اونٹنی کے 'فواق' کے برابر اللہ کی راہ میں کھڑا ہوا، اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔

'فواق' کے معنی اونٹنی دوہنے کے دو اوقات کے درمیان کا وقفہ، دوہنے کا دورانیہ اور دوہنے والے کے جانور کے تھن سے ہاتھ ہٹا کر دوسری دفعہ ہاتھ لگانے کے درمیان کا وقفہ ہے۔

اسی وجہ سے کئی احادیث میں عبادت پر علم کی فضیلت آئی ہے۔ کیوں کہ عبادت کا فائدہ صرف عابد کے لیے ہوتا ہے اور علم کا فائدہ لوگوں کے لیے۔ ان احادیث میں سے چند یہ ہیں:

فَضْلُ الْعِلْمِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ فَضْلِ الْعِبَادَةِ، وَخَيْرُ دِيْنِكُمُ الْوَرَعُ[10] عبادت کی فضیلت

۹-اس حدیث کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے [۱۶۵۰]۔ حاکم نے بھی اسے نقل کیا ہے اور اسے مسلم کی شرطوں کے مطابق صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی نے بھی ان کی تائید کی ہے [۲/۶۸]۔

۱۰-اس حدیث کو بزار اور طبرانی نے الأوسط میں اور حاکم نے حضرت حذیفہؓ سے نقل کیا ہے۔ حاکم نے اسے سعد سے بھی نقل

مجھے عبادت کی فضیلت سے زیادہ محبوب ہے۔ اور تمھاری بہترین دین داری پرہیزگاری ہے۔

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ[11]

عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت باقی تاروں پر۔

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلٰى أَدْنَاكُمْ[12] عالم کی فضیلت عابد پر اس طرح ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ایک ادنیٰ مسلمان پر۔

پھر اس وقت علم کی فضیلت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے جب عالم اسے دوسروں کو بھی سکھائے۔ گزشتہ حدیث کا آخری حصہ یہ ہے:

إِنَّ اللهَ وَمَلَائِكَتَهٗ وَأَهْلَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِي جُحْرِهَا وَحَتَّى الْحُوْتَ لَيُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ[13] یقیناً اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے، اور آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات، یہاں تک کہ بلوں میں چیونٹیاں اور [پانی میں] مچھلیاں لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دینے والوں کے لیے دعائیں کرتی ہیں۔

اور ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ[14] تم میں سب سے بہترین وہ ہے جو قرآن کو سیکھے اور اسے دوسروں کو سکھائے۔

اسی بنا پر فقہا کا یہ فیصلہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو عبادت کے لیے ہمہ وقت فارغ کر دیتا ہے وہ زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہے، مگر علم کے لیے ایسا کرے تو وہ زکوٰۃ کا مستحق ہے۔ کیوں کہ اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عبادت گزار کا یہ تفرُّغ اپنی خاطر ہے

بقیہ ۱۰: کیا ہے اور اسے صحیح علی شرط شیخین قرار دیا ہے۔ ذہبی نے ان سے اتفاق کیا ہے [۹۲/۱]۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۴۲۱۴۔

۱۱-اسے ابونعیم نے الحلیة میں حضرت معاذؓ سے نقل کیا ہے۔ یہ فضیلت علم کے بارے میں ابوالدرداء کی ایک لمبی حدیث کا حصہ ہے۔ اسے احمد اور اصحاب السنن اور ابن حبان نے بھی نقل کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۴۲۱۲، ۶۲۹۷۔

۱۲-یہ بھی ایک حدیث کا حصہ ہے جسے امام ترمذی نے حضرت ابواُمامہؓ سے روایت کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ حسن صحیح غریب ہے [۲۶۸۶]۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۴۲۱۳۔

۱۳-حوالہ سابقہ

۱۴-اسے بخاری نے حضرت عثمانؓ سے روایت کیا ہے۔

اور طالب علم کا امت کے فائدے کے لیے۔

پھر جس قدر ثواب اس کے علم سے مستفید ہونے والے کے لیے ہوگا اسی قدر اجر و ثواب خود اس شخص کے لیے بھی ہے جس نے علم سکھایا ہے۔

نبی ﷺ فرماتے ہیں:

مَنْ دَعَا إِلَى هُدًى، كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُورِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يُنْقِصُ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْءٌ.[15] جس نے کسی راستے کی طرف لوگوں کو بلایا اس کے لیے ان لوگوں کے برابر اجر ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے۔ اور ان کے اجر سے کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

اسی قدر عمل کی فضیلت میں بھی اضافہ ہوگا جتنا اس کا نفع زیادہ ہوگا۔ حدیث میں آیا ہے:

أَحَبُّ النَّاسِ إِلَى اللهِ أَنْفَعُهُمْ، وَأَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ سُرُورٌ تُدْخِلُهُ عَلَى مُسْلِمٍ، أَوْ تَكْشِفُ عَنْهُ كُرْبَةً، أَوْ تَقْضِي عَنْهُ دَيْنًا، أَوْ تَطْرُدُ عَنْهُ جُوعًا، وَلَأَنْ أَمْشِيَ مَعَ أَخِي الْمُسْلِمِ فِي حَاجَةٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَعْتَكِفَ فِي الْمَسْجِدِ شَهْرًا.[16] لوگوں میں اللہ کو سب سے محبوب وہ لوگ ہیں جو ان کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہوں۔ اللہ کے نزدیک سب سے بہتر عمل یہ ہے کہ تم ایک مسلمان کو خوش کرو، یا اس سے کوئی مصیبت دفع کرو، یا اس کا قرض ادا کرو، یا اس سے بھوک کو بھگاؤ۔ اگر میں اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ اس کی حاجت میں چند قدم چلوں یہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں ایک مہینے تک مسجد میں اعتکاف کروں۔

یہی معاملہ ہر اس عمل کا ہے جس کا تعلق معاشرے کی اصلاح اور اس کے فائدے کے ساتھ ہو۔ وہ اس عمل کے مقابلے میں زیادہ فضیلت والا ہے جس کا نفع اس کے کرنے والے تک محدود ہو۔ اسی کے بارے میں نبی ﷺ فرماتے ہیں:

أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصَّلَاةِ وَالصِّيَامِ وَالصَّدَقَةِ؟ إِصْلَاحُ ذَاتِ

۱۵-۱ اسے امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

۱۶-۱ اسے ابن ابی الدنیا اور طبرانی نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے اور صحیح الجامع الصغیر ۱۸۶ میں اسے صحیح قرار دیا گیا ہے۔

الْبَيْنِ، فَإِنَّ فَسَادَ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ.[17] میں تمھیں ایک ایسی چیز نہ بتاؤں جو درجے میں روزے، نماز اور صدقے سے بڑھ کر ہو؟ وہ باہمی اصلاح ہے۔ اس لیے کہ باہمی فساد تو ہلاکت خیز ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ لَا أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ، وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ سر کو گنجا کرتا ہے بلکہ دین کو گنجا کر دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک عادل حکمران کا ایک عمل دوسرے لوگوں کی دس سال کی عبادت سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ کیوں کہ وہ ایک دن میں بعض اوقات ایسے فیصلے کر جاتا ہے جس سے ہزاروں لاکھوں مظلوموں کو انصاف فراہم ہو جاتا ہے۔ وہ حق کو حق دار کے حوالے کرتا ہے۔ وہ ان کے ہونٹوں میں وہ مسکراہٹ لوٹا دیتا ہے جو ان سے چھین لی گئی تھی۔ بعض اوقات وہ ایسی سزائیں نافذ کر دیتا ہے جس سے مجرموں کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ یا تو اسلامی معاشرہ اس ناسور سے پاک ہو جاتا ہے یا ان کے لیے ہدایت اور توبہ کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

کبھی وہ لوگوں کے لیے ایسے اسباب فراہم کرتا ہے اور ان کے لیے ایسے دروازے کھولتا ہے جن سے وہ سرکشوں کو اللہ کی طرف لوٹا کر لے آتا ہے اور گم راہوں کو سیدھے راستے پر لے آتا ہے، جو لوگ منحرف ہونے والے تھے ان کو استقامت نصیب ہو جاتی ہے۔

اور کبھی وہ ایسے منصوبوں کا آغاز کر دیتا ہے جو تعمیری اور نفع بخش ہوتے ہیں اور جن سے ہر بے روزگار کو روزگار، ہر بھوکے کو کھانا، ہر مریض کو دوائی، ہر بے گھر کو گھر اور ہر محتاج کو اس کی ضرورت مہیا ہو جاتی ہے۔

یہی بات ہے جس نے بہت سے علما کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ اگر ہم مستجاب الدعوات ہوتے تو ہم سلطان کے لیے دعا مانگتے۔ کیوں کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنی بہت سی مخلوقات کو درست کرتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

۱۷-۱ اسے امام احمد، ابو داود، ترمذی اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۲۵۹۵۔

يَوْمٌ مِّنْ إِمَامٍ عَادِلٍ أَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةٍ۔[18] عادل حکمران کی زندگی کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

إِنَّ أَحَبَّ النَّاسِ إِلَى اللهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَدْنَاهُمْ مِّنْهُ مَجْلِسًا: إِمَامٌ عَادِلٌ[20] قیامت کے دن اللہ کے سب سے زیادہ محبوب اور مجلس میں اس کے سب سے زیادہ قریب عادل حکمران ہوگا۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے جسے احمد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے، اسی طرح ابن خزیمہ اور ابن حبان نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ وہ یہ کہ:

ثَلَاثَةٌ لَاتُرَدُّ دَعْوَتُهُمْ: اَلصَّائِمُ حَتّٰى يُفْطِرَ، وَالْإِمَامُ الْعَادِلُ، وَدَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ[21] تین افراد ایسے ہیں جن کی دعا رد نہیں ہوتی۔ ایک روزہ دار، یہاں تک کہ افطار کرے، دوسرا عادل بادشاہ اور تیسرا مظلوم۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت جو صحیحین میں آئی ہے:

سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ: إِمَامٌ عَادِلٌ ...... الحديث. سات آدمی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اس دن اپنا سایہ کرے گا جب اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ ان میں سے ایک امام عادل ہوگا۔

۱۸- منذری الترغیب میں کہتے ہیں کہ اسے طبرانی نے الکبیر اور الأوسط میں نقل کیا ہے اور الکبیر کی سند حسن ہے۔ ہیثمی نے اس میں ان کی مخالفت کی ہے۔ مگر اس کی تائید ترمذی کی حدیث سے ہوتی ہے۔ دیکھیے مجمع الزوائد [۵/ ۱۹۷، ۶/ ۲۶۳]۔

۲۰- ترمذی، کتاب الأحکام ۱۳۲۹۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

۲۱- اس حدیث کو حافظ ابن حجر نے بھی حسن کہا ہے اور شیخ شاکر نے تخریج المسند ۸۰۳۰ میں اس کی تصحیح کی ہے۔ اس نے اس کی تخریج میں بہت طوالت سے کام لیا ہے۔ اس کا اشہاد دوسری احادیث سے ہو رہا ہے جو اس کے افراد ثلاثہ میں ثابت ہیں۔ دیکھیے ہماری کتاب: المنتقی من الترغیب و الترهیب، حدیث ۱۳۵، طبع: دار الوفاء۔

دور رس اثرات والے عمل کی ترجیح

چونکہ اللہ اور اس کے رسول کے ہاں کسی چیز کا زیادہ دیر تک نفع بخش ہونا اور اس کے نفع کا دائرہ وسیع ہونا ایک رُتبہ ہے اور یہ رُتبہ مطلوب اور فضیلت والا بھی ہے اس بنا پر کسی کام کا امتداد اور اس کا ایک عرصے تک رہنا بھی مطلوب اور محمود ہے۔ پھر جس قدر کسی چیز کا نفع زیادہ عرصے کے لیے ہوگا اسی قدر وہ عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں افضل اور محبوب ہوگا۔

اسی وجہ سے ایسی چیز کا صدقہ کرنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے جس کا نفع زیادہ ہو۔ مثلاً بکری یا حاملہ اونٹنی جس کے بارے میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ اس سے اس شخص کو اور اس کے اہل وعیال کو بڑے عرصے تک دودھ ملے گا جس پر صدقہ کیا گیا ہے۔

ایک چینی ضرب المثل ہے۔ جس میں کہتے ہیں کہ تم ایک فقیر کو مچھلی کا ایک لقمہ دے دو اس سے بہتر ہے کہ تم اسے ایک جال دے دو۔ جس سے وہ مچھلیوں کا شکار کرے۔

اور حدیث میں آیا ہے:

أَفْضَلُ الصَّدَقَاتِ ظِلُّ فُسْطَاطٍ (أَيْ خَيْمَةٍ) فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، أَوْ مَنِيْحَةُ خَادِمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَوْ طَرُوْقَةُ فَحْلٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.[22] سب سے بہتر صدقہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں ایک خیمہ صدقہ کر دے، یا ایک خادم اللہ کی راہ میں خیرات کرے،

۲۲- اس حدیث کو احمد اور ترمذی نے ابو اُمامہؓ سے اور ایک روایت میں ترمذی نے عدی بن حاتمؓ سے نقل کیا ہے۔ صحیح الجامع الصغیر میں اسے صحیح قرار دیا گیا ہے۔

یا ایک حاملہ اونٹنی اللہ کے راستے میں دے دے۔

أَرْبَعُونَ خَصْلَةً، أَعْلَاهُنَّ مِنْحَةُ الْعَنْزِ، لَا يَعْمَلُ عَبْدٌ بِخَصْلَةٍ مِنْهَا، رَجَاءَ ثَوَابِهَا، وَتَصْدِيقَ مَوْعُودِهَا، إِلَّا أَدْخَلَهُ اللهُ تَعَالٰى بِهَا الْجَنَّةَ.[۲۳] چالیس خصلتیں ہیں جن میں سب سے اونچی یہ ہے کہ آدمی بکری کا صدقہ کرے۔ کوئی بندہ ثواب کی نیت سے یا اپنے وعدے کو پورا کرنے کے لیے ان میں سے جس خصلت پر بھی عمل کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اسے جنت میں داخل کرے گا۔

یہیں سے صدقہ جاریہ کی فضیلت بھی معلوم ہوئی جس کا نفع مسلسل ہوتا ہے اور اس کا اثر صدقہ کرنے والے کی وفات کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ مثلاً لوگوں کی بھلائی کے لیے اوقاف کھولنا، جس سے مسلمان دورِ نبوی سے واقف ہیں اور ان کی وسعت، ان کی کثرت اور اس کی بے شمار قسموں کے حوالے اسلامی تہذیب ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے ہاں یہ شعبہ نیکی کے تمام پہلوؤں اور بھلائی کی تمام قسموں پر محیط ہوگیا، اور پھر ہر بنی نوع انسان کی حاجتوں کے لیے کافی ہوگیا، بلکہ اس کا سلسلہ جانوروں کی نگہداشت تک پھیل گیا۔

اور حدیث صحیح میں آیا ہے:

إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ.[۲۴] جب انسان فوت ہوتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ رک جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے: ایک صدقہ جاریہ، دوسری وہ علم جس سے لوگ فائدہ حاصل کریں اور تیسری نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔

ایک اور حدیث نے اس صدقہ جاریہ کی کچھ اور مثالیں اور نمونے بھی پیش کیے ہیں اور ان میں سے سات کی گنتی پوری کی ہے۔ فرمایا:

۲۳- اس حدیث کو امام بخاری اور ابوداؤد نے عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۷۹۱۔

۲۴- اسے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ صحیح الجامع الصغیر ۷۹۳۔

إِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ: عِلْمًا عَلِمَهُ وَنَشَرَهُ، وَوَلَدًا صَالِحًا تَرَكَهُ، أَوْ مُصْحَفًا وَرَّثَهُ، أَوْ مَسْجِدًا بَنَاهُ، أَوْ بَيْتًا لِابْنِ السَّبِيلِ بَنَاهُ، أَوْ نَهْرًا أَجْرَاهُ، أَوْ صَدَقَةً أَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِي صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ، تَلْحَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ.[۲۵] ایک مومن کو جن اعمال اور بھلائیوں کا ثواب اس کی موت کے بعد بھی پہنچتا ہے ان میں سے چند اعمال یہ ہیں: لوگوں کو علم سکھانا اور اسے پھیلانا، اپنے پیچھے نیک اولاد چھوڑنا، مصحف قرآن میراث میں چھوڑنا، مسجد تعمیر کرنا، مسافر خانہ تعمیر کرنا، نہر نکالنا، زندگی میں اور صحت کی حالت میں اپنے مال میں سے صدقہ نکالنا۔ یہ چیزیں اس کی موت کے بعد بھی اسے پہنچتی رہتی ہیں۔

چونکہ انسان کی عمر بہت مختصر اور محدود ہوتی ہے اس لیے یہ انسان پر اللہ کا فضل ہے کہ اس نے اسے یہ موقع عطا فرمایا کہ وہ ایسے اعمال کے ساتھ اپنی عمر کو لمبا کرے جن کی حد دنیا کی حدود میں محدود نہیں ہے بلکہ اس کے اثرات جاری رہتے ہیں اور وہ موت کے بعد بھی زندہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے نیک اعمال کی وجہ سے باقی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اس کے جسم میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا مگر اس کے عمل کے سوتے جاری رہتے ہیں۔ شوقی نے کیا خوب کہا ہے:

دَقَّاتُ قَلْبِ الْمَرْءِ قَائِلَةٌ لَهُ ... إِنَّ الْحَيَاةَ دَقَائِقٌ وَثَوَانٍ !!

فَارْفَعْ لِنَفْسِكَ بَعْدَ مَوْتِكَ ذِكْرَهَا ... فَالذِّكْرُ لِلْإِنْسَانِ عُمْرٌ ثَانٍ

آدمی کے دل کی دھڑکنیں اسے کہہ رہی ہیں کہ زندگی منٹوں اور سیکنڈوں کا نام ہے۔ اپنے لیے ابھی سے کچھ کرو کہ لوگ موت کے بعد بھی تجھے یاد کریں۔ کسی کو یاد کرنا اس کے لیے دوسری زندگی ہوتی ہے۔

۲۵- حافظ منذری کہتے ہیں کہ اسے ابن ماجہ ۲۴۲ نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ بیہقی نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اس طرح کی حدیث نقل کی ہے۔ دیکھیے ہماری کتاب: المنتقی من الترغیب والترھیب ۷۵، طبع: دارالوفاء۔

دورِ فتن میں عمل کی ترجیح

عمل کے سلسلے میں جو ترجیحات مطلوب ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایسے فتنوں، مشکلات اور سختیوں کے دور میں عمل ہی کو اپنے لیے ذریعہ نجات بنایا جائے جو امت کے وجود کے لیے خطرناک ہوں۔ ایسے مواقع پر عملِ صالح دین میں مضبوطی، اس پر جماؤ اور حق پر ثابت قدمی کی دلیل بن جاتا ہے۔ اس دور میں عملِ صالح کی ضرورت دوسرے ادوار سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

حدیث صحیح میں آیا ہے:

اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَّأَحَبُّ إِلَى اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ. [26] طاقت ور مسلمان اللہ کے ہاں کم زور مسلمان سے بہتر اور محبوب ہے۔

اس کی مزید تائید آپ ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ. [27] بہترین جہاد یہ ہے کہ ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہا جائے۔

نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

سَيِّدُ الشُّهَدَاءِ حَمْزَةُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَرَجُلٌ قَامَ إِلَى إِمَامٍ جَائِرٍ، فَأَمَرَهُ وَنَهَاهُ فَقَتَلَهُ. شہیدوں کا سردار ایک تو حضرت حمزہ ہیں اور دوسرا وہ شخص جو کسی ظالم

۲۶- اسے احمد اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۶۶۵۰۔

۲۷- اسے ابن ماجہ نے حضرت ابوسعیدؓ سے، احمد، ابن ماجہ، طبرانی اور بیہقی نے [شعب میں] حضرت ابوامامہؓ سے اور احمد، نسائی اور بیہقی نے طارق بن شہابؓ سے روایت کیا ہے۔ صحیح الجامع الصغیر ۱۱۰۰۔

حکمران کے سامنے کھڑا ہو جائے اور اس کو امر و نہی کرے، اور وہ اسے قتل کر دے۔

أَفْضَلُ الشُّهَدَاءِ: الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِي الصَّفِّ الْأَوَّلِ، فَلَا يُلْفِتُوْنَ وُجُوْهَهُمْ حَتّٰى يُقْتَلُوْا، أُولٰئِكَ يَتَلَبَّطُوْنَ (أَيْ يَتَمَرَّغُوْنَ) فِي الْغُرَفِ الْعُلٰى مِنَ الْجَنَّةِ، يَضْحَكُ إِلَيْهِمْ رَبُّكَ، فَإِذَا ضَحِكَ رَبُّكَ إِلٰى عَبْدٍ فِيْ مَوْطِنٍ فَلَا حِسَابَ عَلَيْهِ. [28]

سب سے افضل شہید وہ لوگ ہیں جو پہلی صف میں لڑتے ہیں اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے، یہاں تک کہ شہید ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ جنت کے اونچے اونچے بنگلوں میں اٹھکیلیاں کریں گے۔ تیرا رب انھیں دیکھ کر مسکرائے گا۔ اور تیرا رب کسی مقام پر کسی پر مسکرائے تو اس پر کوئی حساب نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اس شخص کی بڑی فضیلت ہے جو فتنے اور مشکلات کے دور میں اپنے دین پر ثابت قدم رہے۔ یہاں تک کہ بعض احادیث نے تو ایسے شخص کو پچاس صحابہ کے ثواب کا مستحق ٹھہرایا ہے۔

ابوداود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ابواُمیہ شعبانی رحمہ اللہ سے روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ، لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا (المائدة ۵:۱۰۵) اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گم راہی سے تمھارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہِ راست پر ہو، اللہ کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔

توانھوں نے کہا: بہت اچھا!! تم نے ایسے شخص سے سوال کیا جو اس کے بارے میں جانتا ہے۔ یہی بات میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھی تھی۔ آپ ﷺ نے مجھے فرمایا تھا:

اِئْتَمِرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ، وَانْتَهُوْا عَنِ الْمُنْكَرِ، حَتّٰى إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا،

۲۸- احمد، ابویعلیٰ، طبرانی نے اسے نعیم بن ہمارؓ سے روایت کیا ہے۔ صحیح الجامع الصغیر ۱۱۰۷۔

وَّهَوًى مُتَّبَعًا، وَّدُنْيَا مُؤْثَرَةً، وَإِعْجَابَ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ.[29] فَعَلَيْكَ بِنَفْسِكَ، وَدَعْ عَنْكَ الْعَوَامَّ، فَإِنَّ مِنْ وَّرَائِكُمْ أَيَّامًا، اَلصَّبْرُ فِيهِنَّ مِثْلَ الْقَبْضِ عَلَى الْجَمْرِ، لِلْعَامِلِ فِيهِنَّ مِثْلَ أَجْرِ خَمْسِينَ رَجُلًا يَّعْمَلُونَ مِثْلَ عَمَلِهِ.

معروف پر عمل کرو اور منکر سے رُکو۔ یہاں تک کہ تم ایسی حرص دیکھو جس کے پیچھے لوگ چلتے ہیں، اور ایسی خواہشات جن کی پیروی کی جائے اور ایسی دنیاداری جسے [دین پر] ترجیح دی جائے اور ہر شخص اپنی بات پر اڑا رہے۔ تو ان حالات میں اپنی فکر کرو اور دوسروں کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد ایسا دور بھی آنے والا ہے جس میں صبر کرنا ایسا مشکل ہو جائے گا جیسے انگارے کو ہاتھ میں پکڑنا۔ اس دور میں عمل کرنے والے کے لیے [عام حالات میں] اس جیسے پچاس آدمیوں کے برابر اجر ہوگا۔

اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ بعض روایات میں یہ اضافہ بھی کیا گیا ہے کہ کسی نے پوچھا: یا رسول اللہ! پچاس آدمیوں کا اجر ہم میں سے یا اُن میں سے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے پچاس آدمیوں کے برابر۔[30]

حدیث کا خطاب مہاجرین وانصار کے سابقین اولین، اہل بدر، بیعتِ رضوان کے شرکا اور اس قسم کے صحابہ کو شامل نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کے بعد کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان کے درجے تک پہنچے۔ اصل میں یہ حدیث موجودہ پرفتن دور میں اسلام کے لیے کام کرنے والوں کے حوصلوں کو مہمیز دے رہی ہے کہ ان کے ساتھ ان کے رب نے اپنے رسول کی زبان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ان کے لیے کئی گنا بڑھ کر اجر وثواب ہوگا۔ یہاں تک کہ ان کا ثواب ایسے

۲۹-اس مقام پر ابن ماجہ میں یہ اضافہ ہے: وَرَأَيْتَ أَمْرًا لَّا يَدَانُ لَكَ بِهِ، یعنی جب تم ایسا فساد دیکھو جس کے مقابلے میں تم بے بس ہو جاؤ اور تم میں اس کو ختم کرنے کی قدرت نہ رہے۔ یہ حدیث میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو نہیں چھوڑتا سوائے اس کے کہ تبدیلی کا کام اس کی طاقت سے باہر ہو جائے۔

۳۰-اسے ابوداؤد نے ملاحم [۴۳۴۱]، ترمذی نے تفسیر [۳۰۶۰] اور ابن ماجہ نے فتن [۴۰۱۴] میں ذکر کیا ہے۔

لوگوں میں سے پچاس افراد کے برابر ہوگا جو اسلام کی فتح ونصرت اور عروج کے دور میں رہے ہوں۔ وہ وقت آ گیا ہے جس کی رسول کریم ﷺ نے خبر دی تھی۔ آج جو شخص اپنے دین پر عمل کرتا ہے اور اس پر صبر کرتا ہے وہ ایسا ہے جیسے اس نے ہاتھ میں انگارے پکڑ رکھے ہوں۔ وہ اندر سے بھی دباؤ میں ہے اور باہر سے بھی برسرِ جنگ ہے۔ کفر کی ساری طاقتیں اس کے خلاف دشمنی اور سازشوں پر اکٹھی ہوئی ہیں، اگرچہ وہ حقیقت میں وہ ایک نہیں ہیں۔ اللہ ان کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ دوسری طرف حکمرانوں کے کارندے اور دشمن کے آلہ کار طبقے اسلام کی خاطر کام کرنے والوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ وہ بھی ان کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں اور ان کے خلاف دشمنی میں مصروف ہیں۔ وہ اپنی حد تک ان کو خوب پریشان کر رہے ہیں۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عِبَادَةٌ فِي الْهَرْجِ كَهِجْرَةٍ إِلَيَّ.[31] ہرج کی حالت میں عبادت کرنا ایسا ہے جیسے میری طرف ہجرت کرنا۔

ھرج سے مراد اختلاف اور فتنہ ہے۔ بعض احادیث میں اس کی تفسیر قتل سے کی گئی ہے۔ کیوں کہ فتنہ اور اختلاف قتل کا سبب بنتے ہیں۔ چنانچہ وہاں مسبب کو سبب کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے۔

۳۱-اسے احمد، مسلم، ترمذی، اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۳۹۷۴۔

عمل پر عقیدہ کی ترجیح

دین کی میزان میں عمل کی ترجیحات میں سے ایک یہ ہے کہ باطنی اور قلبی اعمال [عقیدہ] کو ظاہری اور جسمانی اعمال پر مقدم کیا جائے۔

● اولاً: اس وجہ سے کہ ظاہری اعمال فی نفسہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہوتے، جب تک کہ ان کے ساتھ باطنی عمل موجود نہ ہو جو قبولیت کی بنیاد ہے، اور وہ ہے نیت۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ –أَوْ– بِالنِّيَّاتِ [32] یقیناً اعمال کا دارومدار نیت [یا] نیتوں پر ہے۔

یہاں نیت سے مراد وہ نیت ہے جو ہر قسم کی ذاتی اور دنیوی رغبتوں سے خالی ہو اور اللہ کے لیے خالص ہو۔ اللہ تعالیٰ کسی عمل کو قبول نہیں کرتا جب تک کہ وہ اللہ کے لیے خالص نہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ أُمِرُوٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَآءَ (البینۃ ۹۸:۵)

اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر۔

اور رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا كَانَ خَالِصًا، وَابْتُغِيَ بِهِ وَجْهُهُ. [33] اللہ تعالیٰ

۳۲- متفق علیہ، بروایت حضرت عمرؓ، اللؤلؤ والمرجان ۱۲۴۵۔ یہ صحیح بخاری کی پہلی حدیث ہے۔

۳۳- اس حدیث کو نسائی نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت کیا ہے اور صحیح الجامع الصغیر میں اسے حسن قرار دیا گیا ہے ۱۸۵۶۔

کسی عمل کو قبول نہیں کرتا جب تک وہ خالص نہ ہو اور اس کا مقصد اللہ کی رضا نہ ہو۔

اور حدیث قدسی میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشَرِيكَهُ –وَفِي لَفْظٍ– فَهُوَ لِلَّذِي أَشْرَكَ وَأَنَا مِنْهُ بَرِيءٌ. [34] میں شریکوں سے بالکل بے نیاز ہوں۔ جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ کسی کو شریک بنایا تو میں اسے اس کے شرک کے سپرد کر دیتا ہوں۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ اسی کا ہو جسے اس نے میرے ساتھ شریک کیا اور میں اس سے بیزار ہوں۔

● ثانیاً: اس وجہ سے کہ قلب و ذہن انسان کی حقیقت ہے۔ انسان کی اصلاح و فساد کا دارومدار قلب و ذہن پر ہے۔ صحیحین میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ. [35] خبردار! جسم میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہوتا ہے اور جب وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ خبردار! وہ ٹکڑا دل ہے۔

نبی ﷺ نے یہ بات بھی بیان فرمائی ہے کہ قلب ہی اللہ کی نظر کا مرکز ہے اور اسی کا عمل معتبر ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَامِكُمْ وَصُوَرِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ. [36]

[اللہ تمھارے جسموں اور تمھاری شکلوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمھارے دلوں کو دیکھتا ہے]۔

۳۴- اس حدیث کو پہلے والے الفاظ کے ساتھ مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اور دوسرے الفاظ کے ساتھ ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

۳۵- متفق علیہ بروایت نعمان بن بشیرؓ، یہ اس حدیث کا حصہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ۔ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۱۰۲۸۔

۳۶- اسے امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ [۲۵۶۴] یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے۔

دیکھنے سے مراد قبولیت اور رحم کا دیکھنا ہے۔

قرآن کریم نے بھی یہ بات بیان کی ہے کہ آخرت میں نجات اور جنت کا حصول اسی شخص کے لیے ممکن ہے جس کا دل شرک، نفاق اور اس طرح کی دوسری مہلک بیماریوں سے محفوظ ہو اور وہ اللہ کی طرف مائل ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے فرماتا ہے:

وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ○ يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُونَ ○ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (الشعراء ۲۶: ۸۷-۸۹)

اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔

اور ارشاد ہے:

وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ○ هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ○ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ. (ق ۵۰: ۳۱-۳۳)

اور جنت متقین کے قریب لے آئی جائے گی، وہ کچھ بھی دور نہ ہوگی۔ ارشاد ہوگا: یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا، جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا، اور دلِ گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے۔

معلوم ہوا کہ قیامت کے دن نجات اسی کا مقدر ہوگی جو اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر آیا ہو اور جنت اسی کو ملے گی جو دلِ گرویدہ لے کر اپنے رب کے پاس آیا ہو۔

اللہ کا تقویٰ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولین اور آخرین سب انسانوں کے لیے ایک وصیت [یعنی تاکیدی حکم] ہے اور وہ فضائل اور بھلائیوں اور دنیا و آخرت کی کمائی کی بنیاد ہے، وہ حقیقت میں ایک ذہنی امر ہے۔ اس وجہ سے نبی ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں فرمایا:

اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا [تقویٰ یہاں ہے] اس دوران آپ ﷺ نے تین مرتبہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی آپ ﷺ نے اس کلمے کو بھی تین بار دہرایا اور ہاتھ سے بھی اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا تا کہ یہ بات لوگوں کی عقل اور ان کے دلوں میں اچھی طرح بیٹھ جائے۔

قرآن کریم نے بھی تقویٰ کو دلوں کی طرف منسوب کر کے اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ. (الحج ۲۲: ۳۲)

یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو) اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

تمام اخلاقیات، فضائل اور مقاماتِ ربانیہ جن کو اہلِ سلوک وتصوف اور روحانی تربیت کے داعیوں نے بہت اہمیت دی ہے۔ وہ تمام ایسے امور ہیں جن کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ خواہ وہ دنیا سے بے رغبتی ہو یا آخرت کی ترجیح، اللہ کے لیے اخلاص ہو یا اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت، توکل علی اللہ ہو یا اس کی رحمت کی امید، اس کے عذاب سے ڈرنا ہو یا اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا، اس کی آزمائشوں پر صبر ہو یا اس کی قضا پر راضی ہونا اور اسی طرح وہ اس کی طرف پوری توجہ ہو یا محاسبہ نفس۔ یہ اور اس طرح کی اور چیزیں، یہ سب کچھ دین کا جوہر اور اس کی روح ہیں، جس نے ان میں سے کوئی حصہ حاصل نہیں کیا اس نے اپنے آپ کو اور اپنے دین کو بڑا نقصان پہنچایا:

عَلٰى نَفْسِهٖ فَلْيَبْكِ مَنْ ضَاعَ عُمْرُهٗ   وَلَيْسَ لَهٗ مِنْهَا نَصِيْبٌ وَّلَا سَهْمُ!

اس شخص کو اپنے آپ پر رونا چاہیے جس نے اپنی عمر اس طرح ضایع کی کہ اسے ان چیزوں میں سے کوئی حصہ نصیب نہیں ہو سکا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ:

ثَلاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلاوَةَ الْإِيمَانِ: أَنْ يَكُونَ اللهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلهِ، وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ، كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ.[37] تین چیزیں ہیں جو اگر کسی میں پائی گئیں تو اس نے ایمان کا مزہ چکھ لیا: ایک یہ کہ اللہ اور رسول اس کو ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں، دوسری یہ کہ وہ کسی شخص سے محبت کرے اور صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لیے کرے، تیسری یہ کہ وہ کفر میں لوٹنا اس قدر ناپسند کرے جتنا کہ آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ.[38] تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ میں اسے محبوب نہ بن جاؤں اپنے بچے سے، اپنے باپ سے اور تمام لوگوں سے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! قیامت کب ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وَمَا أَعْدَدْتَ لَهَا؟ تم یہ بتاؤ کہ تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ آدمی نے کہا: میں نے اس کے لیے نمازیں پڑھ کر، روزے رکھ کر یا صدقے دے کر کوئی زیادہ تیاری تو نہیں کی، البتہ یہ ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

فَأَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ.[39] چلو پھر تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے تمھیں محبت ہے۔

اس کی مزید تائید حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے۔ اس میں ہے کہ کسی نے نبی ﷺ سے پوچھا: ایک شخص کچھ لوگوں سے محبت کرتا ہے اور ابھی تک ان سے ملا

۳۷- متفق علیہ، بروایت حضرت انسؓ۔ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۲۶۔

۳۸- متفق علیہ، بروایت حضرت انسؓ۔ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۲۷۔

۳۹- متفق علیہ، بروایت حضرت انسؓ۔ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۱۶۹۳

نہیں ہے [اس کے بارے میں کیا خیال ہے]؟ آپ نے فرمایا:

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ.[40] ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اسے محبت ہوگی۔

یہ احادیث دلالت کررہی ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول اور نیک لوگوں کی محبت کے ساتھ زیادہ نماز، روزے اور صدقات نہ ہوں، تب بھی یہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس کی وجہ بھی اس کے سوا کوئی نہیں کہ یہ محبت جو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہے، انھی اعمال میں سے ہے جن کا تعلق دل سے ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا مقام ہے۔

اسی مفہوم کے اعتبار سے بعض اکابر کہا کرتے تھے:

أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ   عَسَانِي أَنْ أَنَالَ بِهِمْ شَفَاعَة
وَأَكْرَهُ مَنْ بِضَاعَتُهُ الْمَعَاصِي   وَإِنْ كُنَّا سَوَاءً فِي الْبِضَاعَة

میں صالحین سے محبت کرتا ہوں، امید ہے کہ ان کے ذریعے میری شفاعت ہو جائے۔
میں ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہوں جن کی متاعِ حیات گناہ ہیں، اگرچہ اس متاع میں ہم سب برابر ہیں۔

چنانچہ اللہ کے لیے محبت اور اللہ کی خاطر نفرت ایمان کی تکمیل ہے، اور یہ دونوں بھی قلبی و ذہنی افعال ہیں۔ حدیث میں ہے:

مَنْ أَحَبَّ لِلهِ، وَأَبْغَضَ لِلهِ، وَأَعْطَى لِلهِ، وَمَنَعَ لِلهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ.[41]

جس نے اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے نفرت کی، اللہ کے لیے عطا اور اللہ کے لیے منع کیا تو اس نے ایمان کی تکمیل کرلی۔

اسی طرح کا ایک اور ارشاد ہے:

أَوْثَقُ عُرَى الْإِيمَانِ: اَلْمُوَالَاةُ فِي اللهِ، وَالْمُعَادَاةُ فِي اللهِ، وَالْحُبُّ فِي اللهِ،

۴۰- متفق علیہ، بروایت ابوموسیٰ، اللؤلؤ والمرجان: ۱۶۹۴۔

۴۱- اسے ابوداؤد نے کتاب السنۃ میں حضرت ابوامامہؓ سے روایت کیا ہے [۴۶۸۱] دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۵۹۶۵۔

وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ.[42] ایمان کی مضبوط ترین کڑی اللہ کی خاطر موالات، اسی کی خاطر دشمنی، اسی کے لیے محبت اور اسی کے لیے بغض ہے۔

اس بنا پر ہمیں بعض دین داروں پر عموماً، اور داعیوں پر خصوصاً، بہت تعجب ہوتا ہے کہ وہ اپنی توجہ بعض ایسے اعمال اور آداب پر مرکوز کرتے ہیں جن کا تعلق باطن کی نسبت ظاہر سے اور اصل جوہر کی نسبت شکل وصورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے شلوار کا ٹخنوں کے اوپر ہونا، مونچھیں منڈوانا یا کم کرنا اور داڑھیوں کو بڑھانا، عورت کے لیے چہرے کا پردہ، منبر کی سیڑھیوں کی تعداد، نماز میں ہاتھ یا پاؤں رکھنے کا انداز اور اس طرح کے دوسرے امور جن کا تعلق ظاہری شکل وصورت سے زیادہ اور اصل جوہر سے کم ہوتا ہے۔ یہ چیزیں خواہ کسی بھی وضع میں ہوں، دین میں کوئی ترجیح نہیں رکھتیں۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جو اِن امور میں تو بہت دقت سے کام لیتے ہیں مگر وہ ان امور میں یہ دقت اور باریک بینی نہیں دکھاتے جو ان سے زیادہ اہم اور ان سے زیادہ گہرے اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ جیسے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، صلہ رحمی، امانتوں کی ادائیگی، حقوق کی حفاظت، کام میں تن دہی، حق دار کو اس کا حق پہنچانا، مخلوقِ خدا پر اور خصوصاً کمزوروں پر ترس کھانا، یقینی حرام اشیاء سے بچنا اور اس طرح کے دوسرے امور جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مومنوں کی صفت کے طور پر بیان کیے ہیں۔ مثلاً سورۂ انفال اور المؤمنون کے اوائل میں اور سورۂ فرقان کے اواخر میں وغیرہ۔

۴۲-اسے طیالسی، حاکم اور طبرانی نے [المعجم الکبیر اور الأوسط میں] ابن مسعودؓ سے اور احمد اور ابن ابی شیبہ نے حضرت براءؓ سے اور ایک روایت میں طبرانی نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے دیکھیے :صحیح الجامع الصغیر ۲۵۳۹۔

زمان ومکان کا اختلاف اور افضل الاعمال

یہاں ایک اہم نکتہ ہے جس کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ بہت سے امور میں اولویت اور افضلیت زمان ومکان اور اشخاص واحوال لحاظ سے ہوتی ہے اگر چہ ان کے درمیان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

بلکہ غالب یہی ہے کہ اس میں زمانی، ماحولیاتی اور شخصی اختلافات کے ساتھ اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں ہیں۔

● افضل دنیوی عمل

ہمارے علما کے درمیان اس بات میں اختلاف ہے کہ زراعت، صنعت اور تجارت میں سے کون سا عمل افضل اور اللہ کے ہاں زیادہ ثواب کا ذریعہ ہے۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر فن کی فضیلت میں مختلف احادیث آئی ہیں۔

زراعت کی فضیلت میں یہ حدیث ہے:

مَا مَنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَأْكُلُ مِنْهُ طَيْرٌ أَوْ إِنْسَانٌ أَوْ بَهِيمَةٌ إِلَّا كَانَ لَهُ بِهِ صَدَقَةٌ.[43] کوئی مسلمان جب کوئی پودا لگاتا ہے یا کوئی فصل اُگاتا ہے اور پرندے، انسان یا جانور اس میں سے کھاتے ہیں تو یہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔

صنعت کی فضیلت میں یہ حدیث ہے:

مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ، وَإِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدَ

۴۳-متفق علیہ بروایت انسؓ، دیکھیے : اللؤلؤ والمرجان ۱۰۰۱۔

عَلَیْهِ السَّلَامُ کَانَ یَأْکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدِهٖ.[44] کسی مسلمان نے کوئی کھانا نہیں کھایا ہوگا جو اس سے بہتر ہو کہ آدمی اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائے۔ اللہ کے نبی حضرت داوٗد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔

تجارت کی فضیلت میں یہ حدیث آئی ہے:

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ یُحْشَرُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَاءِ.[45] وہ تاجر جو اپنی تجارت میں سچ بولتا ہے، قیامت کے دن انبیا، صدیقین اور شہدا کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

ان اور ان کی طرح دوسری احادیث کی بنا پر بعض علما نے ان میں سے ایک عمل کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ لیکن محققین علما نے کہا ہے کہ ہم ان میں کسی کو بھی مطلقاً فضیلت نہیں دے سکتے بلکہ ان کی فضیلت اس بات پر منحصر ہوگی کہ معاشرے کو کس چیز کی زیادہ ضرورت ہے۔

جس مقام پر غلے کم ہوں اور معاشرہ اس بات کا محتاج ہو کہ اس کو روزمرہ کی غذائی اجناس میسر آئیں جس کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں ہوتا وہاں قوم کو بھوک سے بچانے اور ان کے لیے غذائی ضروریات فراہم کرنے کی خاطر زراعت کا عمل دوسروں سے افضل ہوگا۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ زراعت میں بہت محنت و مشقت ہوتی ہے۔ اس صورتِ حال میں اس مشقت پر صبر کرنا افضل ترین عمل ہوگا۔

جس مقام پر غذائی اجناس زیادہ ہوں، زراعت کا دائرہ وسیع ہو اور لوگوں کو اس بات کی ضرورت ہو کہ مختلف قسم کی صنعتیں زیادہ ہوں جس سے ایک طرف غیر مسلم حکومتوں سے درآمدات سے چھٹکارا ملے، دوسری طرف بے روزگاروں کو روزگار فراہم ہو، تیسری طرف، اگر ان صنعتوں کا تعلق جنگی ساز و سامان تیار کرنے سے ہو تو یہ اُمت کی حرمتوں اور ان کے حدود کی

۴۴-اسے بخاری اور احمد نے مقدامؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۵۵۴۶۔

۴۵-اسے ترمذی نے کتاب البیوع [۱۲۰۹] میں حضرت ابوسعیدؓ سے نقل کیا ہے اور بعض نسخوں میں اسے حسن کہا ہے۔ ابن ماجہ نے اسے کتاب التجارات ۲۱۳۹ میں ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک ضعیف راوی آیا ہے۔

حفاظت کا ذریعہ بنے اور چوتھی طرف اس سے امت کی برآمدی صلاحیت میں اضافہ ہو تو اس صورت میں صنعت کی فضیلت زیادہ ہوگی۔

جب زراعت اور صنعت دونوں زیادہ ہوں اور لوگ اس بات کے محتاج ہوں کہ کوئی ہو جو ان کی تیار کردہ مصنوعات کو دوسرے ملکوں میں منتقل کرے تو یہ صنعت کار اور صارف کے مابین ایک اچھا وسیلہ ہوگا۔ اسی طرح جب مارکیٹ پر ایسے تاجروں کا قبضہ ہو جو لالچی اور ذخیرہ اندوز ہوں، وہ لوگوں کی مجبوریوں سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوں اور چیزوں کی قیمتوں کے ساتھ کھیلتے ہوں تو اس صورتِ حال میں تجارت افضل ہوگی۔ خصوصاً جب وہ ایسے لوگوں میں سے ہوں جنھیں تجارت یا خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے، نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرسکتی۔

آج کے دور میں امت مسلمہ سب سے زیادہ جدید ٹیکنالوجی کی محتاج ہے تاکہ امت جدید دور میں اس انداز سے قدم رکھ سکے کہ وہ جدید سائنس کے اسلحے سے مسلح ہو۔ وہ نہ اس میدان سے غائب ہو اور نہ کسی سے پیچھے ہو۔ اس کے بغیر امت اس پیغام کو اجاگر نہیں کرسکتی جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کی ذمہ داری لگائی ہے اور جس کے ذریعے اس پر اپنی نعمت تمام کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اگر اُمت اسی طرح ضروریاتِ زمانہ اور جدید اسلحے میں دوسروں کی محتاج ہوگی تو اپنی دعوت دنیا تک نہیں پہنچا سکے گی۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نصابات اور نظام تعلیم میں روز بروز ترقی ہو، تاکہ وہ اس مقصد کو حاصل کرسکے۔ یہی طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ اپنا عالمی مقام حاصل کرسکتی ہے جس میں اس کی اپنی ایک ممتاز تہذیب و تمدن ہو، جس کی جڑیں گہری اور شاخیں گھنی ہوں۔ اسی طرح وہ مستقبل میں جھانک سکتی ہے اور اس کی طرف ان نظروں سے دیکھ سکتی ہے جس کا اسلام ان سے تقاضا کر رہا ہے۔ اس کے ذریعے وہ اس عقیدے، اس نظام اور اس تہذیب سے لوگوں کو آگاہ کرسکتی ہے جس کی مسلمانوں کو تلاش ہے، بلکہ جس کے لیے پوری دنیا سرگرداں ہے۔

اس ٹیکنالوجی کا حصول اور اس میں دوسروں پر فوقیت حاصل کرنا اور ان علوم کا حصول جو

ہمیں اس مقصد تک پہنچاتے ہیں، ایک فریضہ اور ایک ضرورت بن گیا ہے۔ ایسا فریضہ جو دین نے ہمارے اوپر لازم کیا ہے اور جسے وقت اور حالات نے حتمی قرار دیا ہے۔ یہ فریضہ آج امت کی ترجیحات میں سب سے مقدم ہے۔

● افضل عبادت

یہی بات اس حوالے سے بھی کہی جاسکتی ہے کہ فرد کے لیے افضل عبادت کون سی ہے۔

اس میں علما کے درمیان بہت اختلاف ہوا ہے۔ اس میں ان کے اقوال بہت زیادہ اور ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں۔

میرے نزدیک اس میں راجح قول امام ابن قیم کا ہے کہ یہ افضلیت افراد، اوقات، جگہ اور حالات کے اعتبار سے ہے اور اسی اعتبار سے اس میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ مدارج السالکین [۱/۸۵-۹۰] میں فرماتے ہیں:

اہل اسلام کے درمیان اس مسئلے میں چار طریقے ہیں کہ عبادات میں سب سے افضل، انفع اور سب سے مقدم کرنے کا مستحق کون سا ہے۔ اس بنا پر ان کی چار اصناف ہیں:

● پہلی صنف: ان کے نزدیک سب سے افضل اور انفع عبادت وہ ہے جو نفس پر زیادہ شاق اور مشکل ہو۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ اس میں انسان کی ذاتی خواہش کا دخل نہیں ہوتا اور یہی عبادت گزاری کی حقیقت ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس طرح کسی عمل کا ثواب اتنا ہی زیادہ ہوگا جتنی اس میں مشقت ہوگی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک حدیث سے استدلال کیا ہے مگر اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ وہ یہ کہ أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ أَحْمَزُهَا (أَيْ أَصْعَبُهَا وَأَشَقُّهَا)[۴۶] سب سے افضل عمل وہ ہے جو مشکل اور شاق ہو۔

۴۶-الدرر میں زرکشی کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ یہ معروف نہیں ہے۔ مزی کہتے ہیں کہ یہ احادیث غرائب میں سے ہے۔ کتب ستہ میں تو اس کی طرف اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ ملا علی قاری الموضوعات الکبریٰ میں کہتے ہیں: اس کا مفہوم صحیح ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث جو صحیح میں مروی ہے، اس کی شاہد ہے: إِنَّمَا أَجْرُكَ عَلٰى قَدْرِ نَصَبِكَ. تجھے اپنی مشقت کے بقدر ثواب ملے گا۔ دیکھیے: کشف الخفاء ۱/۱۵۵۔

یہ ان لوگوں کی صنف ہے جو ریاضت اور مجاہدہ کرکے اپنے 'نفس' کو مارتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے نفس درست ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کی فطرت میں سستی اور کاہلی ہوتی ہے۔ وہ بیٹھے رہنے کو پسند کرتا ہے۔ اس کی درستی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اسے تکلیف اور مشقت میں ڈال دیا جائے۔

● دوسری صنف: یہ لوگ کہتے ہیں کہ افضل عبادت یکسوئی، دنیا سے بے نیازی اور ممکن حد تک اس سے کم تعلق، اس کی فکر میں نہ لگنا اور ان ساری چیزوں سے لاتعلق ہو جانا جن کا دنیا سے تعلق ہو۔

پھر ان کی دو قسمیں ہیں:

ایک عوام، جنھوں نے سمجھا ہے کہ یہی اصل مقصد ہے۔ انھوں نے اپنی پوری توجہ اسی کی طرف کر دی ہے اور وہ اسی کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ اسی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ علم اور عبادت سے بھی اونچے درجے کا عمل ہے۔ انھوں نے دنیا سے بے نیازی کو ہر عبادت کا مقصد اور اصل سرا سمجھا ہے۔

دوسرے خواص، ان کا خیال یہ ہے کہ یہ چیز خود مقصود نہیں ہے بلکہ ایک اور چیز کی وجہ سے ضروری ہے۔ اس کا اصل مقصد دل کو اللہ کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ عزائم کو اسی کے لیے اکٹھا کرنا اور دل کو اسی کی محبت کے لیے خالص کرنا ہے۔ اسی کی طرف انابت ہے، اسی پر توکل، اسی کی رضا کے لیے مصروفیت اس کا مقصود ہے۔ ان کے خیال میں افضل ترین عبادت اللہ کی طرف جمعیت خاطر اور دل وزبان سے ہمیشہ اس کا ذکر اور اسی کے ساتھ مراقبے میں مشغول ہونا اور ہر اس چیز کو چھوڑنا جس سے دل جمعی میں فرق آئے یا اس کی توجہ منتشر ہو جائے۔

ان کی بھی آپس میں دو قسمیں ہیں: ایک عارفین اور اطاعت گزار، جن کے سامنے اگر شرعی امر ونہی آجائے تو اسی کو اپنا لیتے ہیں خواہ اس سے توجہ خراب ہو جائے یا کچھ ہو جائے۔ اور دوسرے منحرفین، جو کہتے ہیں کہ عبادت کا مقصد اللہ کی طرف دل جمعی ہے لہٰذا ایسا حکم جس

سے توجہ میں خلل پیدا ہوا گر اللہ کی طرف سے ہو تب بھی اس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔ یہ لوگ بعض اوقات کہتے ہیں:

یُطَالَبُ بِالْأَوْرَادِ مَنْ كَانَ غَافِلًا فَكَيْفَ بِقَلْبٍ كُلُّ أَوْقَاتِهِ وِرْدٌ؟

ذکر واذکار کا مطالبہ اس شخص سے ہوتا ہے جو غافل ہو۔ اس شخص سے ذکر کا کیا مطالبہ کیا جائے جس کا سارا وقت ورد میں گزرتا ہے۔

پھر ان کی بھی دو قسمیں ہیں: بعض ایسے ہیں جو جمعیتِ خاطر کے لیے فرائض وواجبات تک کو ترک کر دیتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو واجبات کو ادا کرتے ہیں مگر سنتیں اور نوافل اور علم نافع کو جمعیتِ خاطر کے لیے ترک کر دیتے ہیں۔

اس قسم کے لوگوں میں کسی نے اپنے شیخ سے جو عارف تھا، پوچھا: اگر میں اپنے مراقبے میں ہوں اور اذان ہو، اس وقت اگر میں اٹھ کر نماز کے لیے چلوں تو میرا مراقبہ خراب ہو جاتا ہے اور اگر بیٹھا رہوں تو میری جمعیتِ خاطر باقی رہتی ہے۔ ان میں سے کون سا عمل میرے لیے افضل ہے؟ شیخ نے جواب دیا: جب مؤذن اذان دے اس وقت اگر تم عرش کے نیچے ہو تب بھی اٹھو اور اللہ کے داعی کی پکار پر لبیک کہو۔ نماز کے بعد پھر آ کر اپنا کام جاری رکھو۔ کیوں کہ اللہ کی طرف جمعیتِ خاطر روح اور قلب کا حق ہے اور اذان کا جواب دینا رب کا حق ہے، اور جس نے اپنی روح کے حق کو اللہ کے حق پر مقدم کیا وہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ والے گروہ میں شامل نہیں ہے۔

● تیسری صنف: یہ کہتے ہیں کہ افضل اور انفع عبادت وہ ہے جس کا دوسروں کو بھی فائدہ ہو۔ اسے وہ اس عمل سے افضل کہتے ہیں جس کا فائدہ محدود ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ فقرا کی خدمت، لوگوں کی بھلائی، ان کی ضروریات پورا کرنے اور مال ودولت اور اثر ورسوخ کے ذریعے ان کی مدد میں مشغول رہنا افضل ہے۔ انھوں نے اسی کے لیے اپنے آپ کو فارغ کیا اور اسی کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان کی دلیل نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عِيَالُ اللهِ، وَأَحَبُّهُمْ إِلَيْهِ أَنْفَعُهُمْ لِعِيَالِهِ.[47] مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے ہاں سب سے زیادہ محبوب

وہ ہے جو اس کے کنبے کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔ اسے ابویعلیٰ نے روایت کیا ہے۔

انھوں نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ عابد کی عبادت اس کے نفس تک محدود رہتی ہے۔ اور نفع پہنچانے والے کا عمل دوسروں کے لیے بھی مفید ہوتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان برابری کیسے ہو سکتی ہے؟

وہ کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چاند کی فضیلت دوسرے تاروں پر۔[48]

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

لَأَنْ يَهْدِيَ اللهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ.[49] اگر اللہ تیری وجہ سے ایک آدمی کو ہدایت دے یہ تمھارے لیے اس سے زیادہ بہتر ہے کہ تجھے بڑی تعداد میں سرخ اونٹ مل جائیں۔

یہ فضیلت اسی وجہ سے ہے کہ اس کا نفع محدود نہیں بلکہ متعدی ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ دَعَا إِلَى هُدًى، كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلَ أُجُورِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يُنْقَصُ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْءٌ.[50] جس نے کسی راستے کی طرف لوگوں کو بلایا اس کے لیے ان لوگوں کے برابر اجر ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے، بغیر اس کے کہ ان کے اجر سے کوئی کمی کی جائے۔

۴۷- اسے طبرانی نے الکبیر اور الأوسط میں ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔ ابویعلیٰ اور بزار نے اسے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ ان دونوں کی سند میں ایک راوی متروک ہے، جیسا کہ ہیثمی نے کہا ہے [۸/۱۹۱]، طبرانی نے اسے اپنی تینوں کتابوں میں ابن عمرؓ سے بھی نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: أَحَبُّ النَّاسِ إِلَى اللهِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ...... صحیح الجامع الصغیر میں اسے صحیح قرار دیا گیا ہے [۱۷۶]۔

۴۸- جیسا کہ ابوالدرداء کی حدیث میں ہے، اسے احمد، اصحاب السنن اور ابن حبان نے نقل کیا ہے۔ صحیح الجامع الصغیر ۶۲۹۷

۴۹- اسے بخاری نے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے۔

۵۰- اسے احمد، مسلم، اصحاب السنن اور ابن حبان نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۶۲۹۷

وہ اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ ...... لَيُصَلُّونَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ.[51] یقیناً اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے ...... لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دینے والوں کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔

اور اس حدیث سے بھی کہ إِنَّ الْعَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ، حَتَّى الْحِيتَانُ فِي الْبَحْرِ، وَالنَّمْلَةُ فِي جُحْرِهَا.[52] عالم کے لیے زمین و آسمان کی تمام مخلوقات دعائیں کرتی ہیں یہاں تک کہ سمندر میں مچھلیاں اور بلوں میں چیونٹیاں بھی۔

وہ اس بات سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ انبیا علیہم السلام اسی لیے مبعوث کیے گئے تھے کہ وہ مخلوق کے ساتھ احسان کا سلوک کریں گے اور ان کو دنیا اور آخرت میں نفع پہنچائیں گے۔ وہ اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ وہ خلوت نشین ہو جائیں اور لوگوں سے کٹ کر رہبانیت اختیار کرلیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان تین افراد پر نکیر فرمائی جنھوں نے ارادہ کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو عبادت کے لیے خالص کرلیں گے اور لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیں گے۔ ان کے خیال میں اللہ کی خاطر دنیا میں پھیل جانا، اس کے بندوں کو نفع پہنچانا اور ان کے ساتھ احسان کرنا اس سے بہتر ہے کہ ان سارے امور کو چھوڑ کر توجہ صرف اللہ کی طرف ہو۔

● چوتھی صنف: یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی رضا کے لیے عمل کرنا افضل ترین عبادت ہے۔ اور ہر وقت میں وہی کام افضل ہے جس کی اس وقت ضرورت ہو۔ چنانچہ جہاد کے وقت افضل ترین عبادت جہاد ہے، خواہ اس کی وجہ سے ذکر و اذکار، تہجد اور نفل روزے چھوڑنے ہی پڑ جائیں۔

۵۱- امام ترمذی نے حضرت ابوامامہؓ سے روایت کی ہے کہ إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ وَأَهْلَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِي جُحْرِهَا وَحَتَّى الْحُوتَ لَيُصَلُّونَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ. اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے، اور آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات، یہاں تک کہ بلوں میں چیونٹیاں اور [پانی میں] مچھلیاں لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دینے والوں کے لیے دعائیں کرتی ہیں۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے [۲۶۸۶]۔ اسے طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ دیکھیے: مجمع الزوائد ۱/۱۲۴، اور صحیح الجامع الصغیر ۴۲۱۳۔

۵۲- یہ ابوالدرداءؓ کی پچھلی حدیث کا حصہ ہے، صرف الفاظ میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔

بلکہ بعض اوقات تو اس کی وجہ سے فرض عبادات میں بھی کمی کی جاتی ہے۔

جب مہمان آجائے تو اس وقت افضل عمل یہ ہوتا ہے کہ اس کے حقوق ادا کیے جائیں اور اس کے لیے مستحب اذکار اور وظیفے چھوڑ دیے جائیں۔ یہی معاملہ شریکِ حیات اور اہل و عیال کے حقوق کے معاملے میں بھی ہے۔

سحری کے وقت میں افضل یہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھیں، قرآن کی تلاوت کریں، دعا، ذکر اور استغفار کریں۔

جب طالب علم علمی رہنمائی چاہتے ہوں، اس وقت اسے تعلیم دینا اور اس کے لیے دوسرے کاموں کو چھوڑ دینا افضل عمل ہوتا ہے۔

جب اذان ہوتی ہے اس وقت افضل عمل یہ ہوتا ہے کہ اپنے اذکار وغیرہ چھوڑ کر مؤذن کی پکار پر لبیک کہیں۔

نمازوں کے اوقات میں افضل عمل یہ ہوتا ہے کہ ان کی تیاری میں خوب کوشش کریں، اسے اول وقت میں ادا کریں اور اس کے لیے جامع مسجد میں جائیں خواہ وہ کتنی ہی دور ہو۔

جس وقت کسی محتاج کو جانی، مالی یا اخلاقی مدد کی ضرورت ہو اس وقت اس کی مدد کرنا، اور اس کی حاجت پوری کرنا اور اسے اپنے ذکر و اذکار اور خلوت نشینی پر ترجیح دینا افضل عمل ہوگا۔

جس وقت قرآن کی تلاوت ہو رہی ہو اپنے دل اور ہمتوں کو سمیٹ کر اس کو غور سے سننا اور اس کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرنا افضل عمل ہوگا یہاں تک کہ گویا اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے تم سے مخاطب ہو رہا ہے۔ اس لیے آپ اپنے دل و جان کو اس کے فہم و تدبر کی طرف متوجہ کریں۔ اس کے احکام کو اپنے اوپر نافذ کرنے کا عزم کریں۔ جیسا کہ آپ کے پاس کسی بادشاہ کی طرف سے خط آجاتا ہے اور آپ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

وقوفِ عرفہ کے وقت افضل عمل یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرے،

دعائیں مانگے، اور ذکر واذکار میں مشغول رہے۔ اس موقع پر روزہ رکھنا درست نہیں ہے اس لیے کہ وہ اس وقت کے افضل اعمال سے آدمی کو کمزور کردینے کا ذریعہ بنتا ہے۔

ذی الحجہ کے دس دنوں میں زیادہ سے زیادہ عبادات انجام دینا افضل ہوتا ہے، خاص طور پر تکبیر، تہلیل اور تحمید کرنا۔ اس وقت یہ نفلی جہاد سے بھی افضل ہوتا ہے۔

رمضان کے آخری دس دنوں میں افضل عمل یہ ہے کہ آدمی مسجد میں معتکف ہوجائے اور خلوت نشینی اختیار کرلے۔ اس میں لوگوں سے میل جول اور ان کے ساتھ مشغولیت نہ رکھے۔ حتی کہ اکثر علما کے نزدیک اس وقت یہ عمل اس سے بھی بہتر ہے کہ کسی کو علم سکھائے، یا ان کو قرآن پڑھائے۔

اگر تمھارا کوئی مسلمان بھائی بیمار پڑ جائے یا وفات پاجائے تو اس کی عیادت کرنا اور اس کے جنازے میں شریک ہونا اور اس کے ساتھ قبرستان تک جانا اس سے افضل ہے کہ آدمی خلوت نشین رہے اور مراقبے میں مشغول رہے۔

حوادث کے نزول کے وقت اور لوگوں کی طرف سے آپ کو تکلیفیں دیے جانے کے وقت صبر کا فریضہ انجام دینا اور ان کے ساتھ مل کر رہنا اس سے افضل ہے کہ آدمی ان سے عزلت نشین ہوجائے اور ان سے ملنا جلنا چھوڑ دے۔ جو مسلمان لوگوں کے درمیان میں رہتا ہے تاکہ ان کی اذیتوں پر صبر کرے یہ اس سے افضل ہے کہ وہ ان سے ملنا جلنا چھوڑ دے اور وہ اسے اذیت دینے سے باز آجائیں۔

اسی طرح بھلائی میں ان سے میل ملاپ افضل ہے اور یہ ان سے گوشہ نشین ہونے سے بہتر ہے۔ اور برائی میں ان سے عزلت نشین ہونا اس سے بہتر ہے کہ ان کے درمیان رہ کر خود بھی ان کے ساتھ ان کی برائیوں میں شریک بن جائے۔ ہاں، اگر وہ جانتا ہے کہ ان کے ساتھ میل ملاپ رکھتا ہے تو انھیں برائی سے روک سکے گا یا ان کی برائی کو کم کرے گا تو اس صورت میں

ان سے بھی الگ ہونے کے بجائے ان سے میل ملاپ رکھنا بہتر ہوگا۔

چنانچہ ہر وقت میں افضل یہ ہے کہ اس وقت کی اللہ کی رضا کو پیش نظر رکھا جائے اور وقت کے فریضے، اس کی ذمہ داری اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مشغول ہوا جائے۔

یہ آخری قسم کے لوگ بھی عبادت گزار ہیں مگر کسی قید سے آزاد، جبکہ اس سے پہلے جن اصناف کا ذکر کیا گیا ہے وہ عبادت گزار ہیں مگر کسی نہ کسی قید کے ساتھ مقید۔ ان میں سے کوئی شخص جب عبادت گزاروں کی اس نوع سے نکلتا ہے جس کے ساتھ اس کا تعلق تھا تو وہ سمجھتا ہے جیسے اس نے کوئی کوتاہی کی ہو یا عبادت ہی چھوڑ دی ہو۔ کیوں کہ وہ ایک ہی جہت میں اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص مطلق عبادت گزار ہوتا ہے اس کو کسی خاص طریقہ عبادت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ اسے دوسروں پر ترجیح دیتا ہو۔ بلکہ اس کا مقصد اللہ کی رضا ہوتا ہے خواہ وہ جہاں بھی ہو۔ اس کی عبادت کا دارومدار اللہ کی رضامندی پر ہوتا ہے۔ اس طرح کا آدمی عبادت کی منزلیں بدلتا رہتا ہے۔ اس کے سامنے جب عبادت کا کوئی درجہ بلند ہوتا دکھائی دیتا ہے تو یہ اس کی طرف چلنے لگتا ہے۔ اور پھر اس میں اتنا مشغول رہتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی اور درجہ نمودار ہوتا ہے۔ اس کی رفتار اسی انداز سے جاری رہتی ہے یہاں تک کہ اس کا سفر تمام ہوجاتا ہے۔ اگر آپ علما کے پاس جائیں تو یہ وہاں موجود ہوگا اور اگر آپ عبادت گزاروں کے پاس جائیں تو یہ آپ کو ان کے ساتھ نظر آئے گا۔ اگر آپ مجاہدین سے ملیں تو اسے وہاں موجود پائیں گے اور اگر ذاکرین کی زیارت کریں تو اس سے وہاں بھی ملاقات ہوگی۔ اگر آپ کی ملاقات صدقہ وخیرات کرنے والوں سے ہو تو اس کام میں بھی اسے سب سے آگے پائیں گے اور اگر آپ کسی ایسی جماعت کے لوگوں کو دیکھیں جو اللہ کے ساتھ تعلق بڑھانے اور اس کے مراقبے میں مشغول ہوں تو یہ ان میں بھی موجود ہوگا۔ یہ عبد مطلق ہے جسے نہ کسی قسم کی لکیریں اپنے دائرے میں بند کرسکتی ہیں اور نہ وہ کسی قید میں مقید ہوتا ہے۔ اس کا عمل اپنے نفس کی مراد کے لیے اور ایسی عبادات کے لیے نہیں ہوتا جن میں اسے

لذت اور راحت محسوس ہوتی ہے۔ یہی شخص ہے جو حقیقی معنوں میں اس عہد پر قائم ہے کہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ۔ (الفاتحۃ ۱:۵) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

پہننے کے لیے اسے جو بھی میسر آئے، کھانے کو جو بھی ملے ہر حال میں اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے کام میں مشغول رہے۔ مجلس میں اسے کوئی بھی جگہ میسر آئے، خواہ مجلس کا آخری سرا ہی کیوں نہ ہو۔ اسے نہ کوئی اشارہ روک سکتا ہے اور نہ کوئی قید اسے اپنا بندہ بنا سکتی ہے، نہ کوئی لکیر ہی اس پر غلبہ حاصل کر سکتی ہے۔ وہ بالکل آزاد ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے حکم کے ساتھ گھومتا ہے، خواہ وہ اسے جہاں بھی گھمائے۔ وہ حکم دینے والے کے دین پر ہوتا ہے خواہ اس کی باگیں جس طرف بھی مڑیں۔ اگر حکم دینے والا اس کو کسی مقام پر ٹھہرا لے تو وہ ٹھہر جاتا ہے۔ یہ ایسا آدمی ہوتا ہے کہ ہر حق پسند اس سے محبت کرتا ہے اور ہر باطل پرست اس سے وحشت محسوس کرتا ہے۔ جیسے بارش ہوتی ہے کہ جہاں بھی پڑے نفع دیتی ہے، یا کھجور کی طرح جس کے پتے نہیں گرتے اور یہ پوری کی پوری منفعت ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کے کانٹے بھی۔ مگر یہی کانٹے اللہ کے احکام نہ ماننے والوں کے لیے سختی اور غضب ہوتے ہیں، جب وہ اللہ کے محارم کو توڑتے ہیں۔ ایسا آدمی اللہ کی خاطر، اللہ کے ذمے اور اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ دوسری مخلوق کو چھوڑ کر اللہ کے ساتھ ہے اور اپنے نفس کو چھوڑ کر لوگوں کے ساتھ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ جب اللہ کے ساتھ ہوتا ہے تو مخلوق سے تعلق کاٹ دیتا ہے اور ان سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے تو اپنے آپ کو درمیان سے نکال دیتا ہے اور اس سے بیزار ہو جاتا ہے۔ آفریں ہے اس آدمی پر! یہ لوگوں میں کتنا عجیب و غریب ہے! اور یہ لوگوں سے کس قدر وحشت زدہ ہے! یہ اللہ کے ساتھ کتنی محبت رکھتا ہے اور کس قدر اس سے خوش ہے! یہ کتنا مطمئن اور پرسکون ہے!! اللہ ہی سے مدد کی دعا اور اسی پر توکل ہے۔[۵۳]

❖❖❖

۵۳- مدارج السالکین ۱/۸۵-۹۰، طبع السنۃ المحمدیۃ۔

18/11/15

۷

مامورات میں ترجیحات

فروع پر اصول کی ترجیح

شرعی اوامر میں سب سے پہلے جس چیز کا خیال رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اصول کو فروع پر ترجیح دی جائے۔

اصول کو ترجیح دینے سے ہماری مراد یہ ہے کہ ان چیزوں کو مقدم کیا جائے جن کا تعلق اللہ تعالیٰ پر، اس کی وحدانیت پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے پیغمبروں پر اور روزِ آخرت پر ایمان کے ساتھ ہے۔ یہ ایمان کے بنیادی ارکان ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ (البقرة ۲:۱۷۷)

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۤ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ (البقرة ۲:۲۸۵)

رسول اُس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اُس کے رَب کی طرف سے اُس پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اِس رسول کے ماننے والے ہیں، انھوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کرلیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں کو مانتے ہیں، اور اُن کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے، ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک! ہم تجھ سے خطابخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیرے ہی طرف پلٹنا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا. (النساء ۴:۱۳۶)

جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔

ان آیات میں اصول عقیدہ کے ضمن میں ایمان بالقدر کا ذکر نہیں کیا گیا کیوں کہ وہ ایمان باللہ میں شامل ہے۔ ایمان بالقدر اصل میں ذاتِ باری تعالیٰ کے کمال، اس کے وسیع علم اور اس کی لامتناہی قدرت کے تقاضے پر ایمان ہے۔

عقیدہ بنیاد ہے اور شریعت اس کی فرع ہے۔

اسی طرح ایمان بنیاد ہے اور عمل اس کی فرع۔

اس مقام پر ہم ایمان اور عمل کے درمیان تعلق کے بارے میں متکلمین کے اختلافات میں نہیں الجھنا چاہتے کہ عمل ایمان کا جزو ہے یا یہ اس کا ثمرہ ہے اور کیا عمل ایمان کے وجود کے لیے شرط ہے یا اس کے کمال کی دلیل ہے؟

اگر ایمان صحیح ہو تو وہ ضرور عمل کا پھل دیتا ہے۔ جس قدر ایمان مضبوط اور راسخ ہوگا اسی

قدر اعمال زیادہ ہوں گے، اوامر کی ادائیگی یا نواہی سے اجتناب کی صورت میں۔

اُس عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں جس کی بنیاد صحیح ایمان پر قائم نہ ہو، اس کی تصویر کشی قرآن نے یوں کی ہے:

كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى إِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (النور ۲۴:۳۹)

جنھوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشتِ بے آب میں سراب، کہ پیاسا اُس کو پانی سمجھے ہوئے تھا، مگر جب وہ وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا، بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا، جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا، اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔

لہٰذا سب سے پہلا اور بنیادی کام عقیدے کی اصلاح کرنا، توحید کو خالص کرنا، کفر و شرک اور تمام خرافات کو چھوڑ دینا اور ایمان کے بیج کو دل کی گہرائی میں کاشت کرنا ہے، تاکہ وہ اللہ کے حکم کے ساتھ اپنا پھل دے سکے اور تاکہ کلمہ لا الہ الا اللہ دل میں ایک حقیقت اور زندگی میں ایسا نور بن جائے جو فکر اور کردار کے اندھیروں کا پردہ چاک کردے۔

محقق اسلام علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جان لو کہ کلمہ لا الہ الا اللہ کی کرنیں گناہوں کے اندھیروں اور اس کے بادلوں کو مٹا دیتی ہیں۔ یہ کرنیں جتنی تیز ہوں گی ان کی روشنی اتنی زیادہ جگہ کو منور کرے گی۔ اس روشنی کی کمی بیشی کی وجہ سے لوگوں اور لوگوں میں جو تفاوت پیدا ہوتا ہے اس کا اندازہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

کچھ لوگوں کے دل میں اس کلمے کی روشنی سورج کی طرح ہوتی ہے۔

کسی کے دل میں وہ چمکدار موتی کی طرح ستارے کے مانند ہوتی ہے۔

کسی کے دل میں یہ روشنی ایک بڑے مشعل کی طرح ہوتی ہے۔

کسی کے دل میں روشن اور کسی کے دل میں ایک ٹمٹماتے چراغ کی طرح۔

لہٰذا یہ روشنی قیامت کے دن اُن کے دائیں طرف اور سامنے اسی حساب سے ان کے لیے راستہ روشن کرے گی جس حساب سے دُنیا میں اُن کے دل میں اس کلمے کی روشنی ہوگی۔

جوں جوں اس کلمے کی روشنی زیادہ اور شدید تر ہوتی جائے گی اسی قدر وہ شکوک وشبہات اور شہوات متاثر رکھے گی اور آخر کار بات اس حد تک پہنچے گی کہ جب بھی کوئی شک وشبہہ یا شہوت وخواہش اس کے سامنے آئے گی یہ روشنی اسے جلا کر راکھ کرے گی۔ اُس شخص کا یہی حال ہوتا ہے جو اپنی توحید میں سچا ہو اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو۔

جس نے یہ سمجھ لیا وہ نبی ﷺ کے اس ارشاد کا مفہوم بھی اچھی طرح سمجھ لے گا کہ إِنَّ اللّٰهَ حَـرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، يَبْتَغِي بِذٰلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ[1] جس نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھا، اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے آگ حرام کی ہے۔ اور لَا يَـدْخُلُ الـنَّـارَ مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ.[2] جس نے کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھا وہ جہنّم کی آگ میں داخل نہیں ہوگا۔

اس قسم کی احادیث کے بارے میں اکثر لوگوں کو اشکال ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ ان کو منسوخ سمجھتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اس وقت کی احادیث ہیں جب اوامر اور نواہی اور احکام شرع نازل نہیں ہوئے تھے۔ کسی کا کہنا ہے کہ یہاں آگ سے مراد وہ آگ ہے جو مشرکین اور کفار کے لیے مختص ہے۔ کسی نے یہ تاویل کی ہے کہ وہ دائمی آگ میں داخل نہیں ہوں گے۔ اس طرح کی اور بھی کئی لایعنی تاویلات ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ نبی ﷺ کی بات کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ محض زبان سے کہہ دینے سے آدمی کے لیے جہنّم کی آگ حرام کی گئی۔ دین اسلام کے بارے میں یہ بات بدیہی طور پر معلوم ہے کہ زبانی قول کے ساتھ دل کا قول بھی ضروری ہے۔ دل کے قول میں معرفت اور

۱- کنز العمال، ج۱،ص۵۰،حدیث۱۴۲۔

۲- بخاری، حدیث۴۴، مسلم، حدیث۴۹، بلفظ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ۔

تصدیق بھی شامل ہوتی ہے اور اس کلمے میں موجود نفی اور اثبات کی حقیقت تک رسائی بھی۔ اسی طرح الوہیت کی وہ حقیقت جس کی اللہ کے سوا دوسروں سے نفی کی گئی ہے اور اسے اللہ کے لیے خالص کیا گیا ہے۔ جس کا ثبوت غیر اللہ کے لیے محال ہوتا ہے۔ یہ چیز جب دل کو حاصل ہوتی ہے اور اس کا علم، اس کا یقین، اس کی معرفت، اور اس کا حال، یہ ساری چیزیں جب آپس میں مل جاتی ہیں تو یہ اس کے لیے آگ کے حرام ہونے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

ہاں! اگر کسی نے معانی سے غافل ہوتے ہوئے اور ان پر غور وفکر سے اعراض کرتے ہوئے صرف زبان سے یہ کلمات ادا کیے اور اس کے دل نے اس کی زبان کا ساتھ نہیں دیا، نہ اس کی قدر اور حقیقت کو پہچانا، اور یہ کلمات اس طرح ادا کیے کہ وہ ان سے ثواب کا بھی امیدوار رہا تو اس کے گناہوں میں سے کچھ گناہ اسی حساب سے محو کر دیے جائیں گے جتنا کہ اس کے دل میں ارادہ ہے۔ کیوں کہ اعمال میں شکل وصورت یا تعداد کے لحاظ سے ایک دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں ہوتی۔ بلکہ ان میں آپس میں ایک دوسرے پر جو فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ دل کے ارادے کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ بعض اوقات دو اعمال ظاہری طور پر ایک جیسے ہوتے ہیں مگر ان میں فضیلت کے لحاظ سے زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ بعض اوقات دو آدمی ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں مگر ان کی نمازوں میں بعد المشرقین ہوتا ہے۔[3]

۳- مدارج السالکین۱/۳۲۹-۳۳۱۔

سنن ونوافل پر فرائض کی ترجیح

فروع کے میدان میں یہ بات معلوم ہی ہے کہ شریعت کی طرف سے مطالبے کے لحاظ سے اعمال میں نمایاں فرق ہے۔

بعض امور کا حکم مندوب اور مستحب ہونے کے لحاظ سے دیا گیا ہے اور بعض کا فرض اور واجب ہونے کے لحاظ سے۔ جب کہ بعض ایسے ہیں جو درمیان درمیان میں ہیں (یعنی وہ امور جو مستحب سے اوپر اور فرض سے کم درجے کے ہوتے ہیں) انھیں بعض فقہا واجب کا نام دیتے ہیں۔

پھر واجب اور فرض میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو کفائی طور پر لازم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جب ان کو ایک فرد یا ایک بڑی جماعت ادا کرے تو باقی لوگوں سے گناہ ساقط ہو جاتا ہے۔

بعض امور فرض عین کے درجے میں ہوتے ہیں۔ فرض عین ان کو کہتے ہیں جن میں بات کا رُخ ہر اس شخص کی طرف ہوتا ہے جو مکلف ہو اور اس حکم کی شرائط پر پورا اُترتا ہو۔

پھر فرض عین آپس میں بھی بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ بعض وہ ہیں جنھیں فرائض رکنیہ کہتے ہیں، جو ارکان اسلام میں سے شمار کیے گئے ہیں۔ جیسے چار عبادات یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج۔ جب کہ بعض ان کے علاوہ ہیں۔

علامہ ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ حدیث: إِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلاَ تُضَيِّعُوهَا[1]...... کی تشریح میں فرماتے ہیں:

۱-المعجم الصغیر ۲/۲۴۹، المعجم الکبیر ۱۱/۲۱۳

علما کے درمیان اس بات میں اختلاف ہے کہ واجب اور فرض ایک ہی معنی میں ہیں یا نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہے۔ جس چیز کا وجوب کتاب اللہ یا سنت رسول یا اجماع جیسے شرعی دلائل سے ثابت ہوتا ہے تو وہ فرض ہوتی ہے۔ یہ رائے اصحاب شافعی وغیرہ کے حوالے سے مشہور ہے۔ امام احمد کی بھی ایک روایت یہی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ جو چیز نماز میں ہے وہ فرض ہے۔

بعض علما کہتے ہیں کہ فرض اس کو کہتے ہیں جو دلیل قطعی سے ثابت ہو، اور واجب اس کو کہتے ہیں جو غیر قطعی دلیل سے ثابت ہو۔ یہ حنفیہ وغیرہ کا قول ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی بہت سی نصوص سے فرض اور واجب کے درمیان فرق ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے اصحاب میں سے کئی افراد نے ان سے یہ بات نقل کی ہے کہ انھوں نے کہا: فرض صرف اسی کو کہتے ہیں جو کتاب اللہ میں مذکور ہو۔ صدقہ فطر کو وہ واجب کہتے ہیں مگر انھوں نے کہا ہے کہ میں اس کو فرض کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ہمارے اصحاب میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ فرض وہ ہوتا ہے جو کتاب اللہ سے ثابت ہو اور سنت اس کو کہتے ہیں جو سنت سے ثابت ہو۔

بعض کہتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ فرض وہ ہوتا ہے جو نقل سے اور خاص طور پر نقل متواتر سے ثابت ہو اور واجب اس کو کہتے ہیں جو اجتہاد کے ذریعے ثابت ہو اور جس کے وجوب میں اختلاف جائز ہو۔[2]

● سنن ومستحبات میں نرم روی

ترجیحات کا مسئلہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم زیادہ اہمیت والے واجب کو عام واجب پر اور عام واجب کو مستحب پر مقدم کریں، سنن اور مستحبات میں اتنی نرمی کریں جتنی فرائض اور واجبات میں نہیں کی جاسکتی اور بنیادی فرائض پر دوسرے فرائض کے مقابلے میں زیادہ زور دیں۔ خاص طور

۲-جامع العلوم والحکم ۲/۱۵۳۔ طبع: الرسالۃ۔

پر نماز اور زکوٰۃ پر جو بنیادی فرائض میں سے ہیں اور جن کو قرآن پاک نے ۲۸ مقامات پر اکٹھے ذکر کیا ہے۔ ان کے بارے میں کئی صحیح احادیث بھی آئی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ، وَحَجِّ الْبَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ.[3]

اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے: یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، بیت اللہ کی زیارت کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل نجد میں سے ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ اس کے بال پراگندہ تھے۔ ہم اس کی آواز کی گونج سن رہے تھے مگر اس کی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب گیا اور اسلام کے بارے میں سوال کرنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا:

خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ. دن رات میں پانچ نمازیں پڑھنا۔

اس نے کہا: کیا اس کے علاوہ کوئی اور نماز مجھ پر لازم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ. نہیں سوائے اس کے کہ تم نفل پڑھو۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

وَصِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ اور رمضان کے مہینے میں روزے رکھنا۔ اس نے پھر پوچھا: کیا مزید بھی کچھ روزے مجھ پر لازم ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ. نہیں، سوائے اس کے کہ تم نفل روزے رکھو۔

کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کے سامنے زکوٰۃ کا ذکر کیا۔ اس پر بھی اس نے کہا: کیا مجھ پر اس کے سوا کوئی چیز لازم ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

۳- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان، حدیث ۹

لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ. نہیں، سوائے اس کے کہ تم نفل ادا کرو۔

اس کے بعد اس آدمی نے منہ موڑا اور یہ کہہ کر جانے لگا کہ میں اس پر نہ اضافہ کروں گا اور نہ اس میں کمی کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ. اگر اس نے سچ کہا ہے تو یہ کامیاب ہوگیا۔[4]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو ان سے کہا:

اُدْعُهُمْ إِلٰى شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ، فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوْكَ لِذٰلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ، فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوْكَ لِذٰلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَاءِ هِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ.[5] ان کو اللہ کے سوا کسی معبود کے نہ ہونے اور میرے رسول ہونے کی گواہی کی طرف بلاؤ۔ اگر انھوں نے آپ کی یہ بات مان لی تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے دن رات میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر انھوں نے یہ بات بھی مانی تو پھر ان کو بتادو کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے۔ وہ ان کے مال داروں سے لیا جائے گا اور ان کے ناداروں کو دیا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَ هُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ.[6] مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ

۴- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان، حدیث ۶

۵- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان، حدیث ۱۱

۶- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان، حدیث ۱۵

وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اگر انھوں نے یہ کام کیا تو انھوں نے مجھ سے اپنی جان اور اپنا مال بچالیا، باقی ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔[۷]

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ وفات پائے اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ خلیفہ بن گئے تو عربوں میں سے جن کو کافر ہونا تھا وہ کافر ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت عمر ؓ نے ابوبکر صدیق ؓ سے کہا تھا: آپ ان لوگوں کے خلاف کیسے لڑیں گے حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَمَنْ قَالَهَا عَصَمَ مِنِّيْ مَالَهٗ وَنَفْسَهٗ إِلَّا بِحَقِّهٖ، وَحِسَابُهٗ عَلَى اللّٰهِ .[مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جس نے یہ بات کہی اس نے مجھ سے اپنا مال اور اپنی جان بچالی سوائے کلمہ توحید کے حق کے، اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے]؟

تو حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے کہا: خدا کی قسم! میں تو اس شخص کے خلاف ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرے کیوں کہ زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کا ایک مالی حق ہے۔ خدا کی قسم! اگر انھوں نے مجھ سے وہ مہار بھی روکی جسے وہ رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے تو میں ان کے خلاف اس پر لڑوں گا۔ حضرت عمر ؓ فرماتے ہیں کہ فوراً مجھے خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر کو اس مسئلے پر شرح صدر عطا فرمایا ہے تو یقیناً یہی بات حق ہوگی۔

حضرت ابوایوب ؓ انصاری سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے کہا: مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جو مجھے جنت میں داخل کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

تَعْبُدُ اللّٰهَ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا، وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ، وَتَصِلُ الرَّحِمَ[۸] اللہ تعالیٰ

۷- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان، حدیث ۱۳
۸- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان، حدیث ۷

کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، نماز پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو۔

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی آیا اور اس نے نبی ﷺ سے کہا: یارسول اللہ! آپ مجھے ایسا عمل دکھائیں جسے میں ادا کروں تو جنت میں چلا جاؤں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

تَعْبُدُ اللّٰهَ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا، وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ الْمَكْتُوْبَةَ، وَتُؤَدِّي الزَّكَاةَ الْمَفْرُوْضَةَ، وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ . اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، فرض نماز پڑھو، فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔

اس نے کہا: اس رب کی قسم، جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! میں اس میں نہ اضافہ کروں گا اور نہ کمی۔ پھر جب وہ منہ موڑ کر جانے لگا تو نبی ﷺ نے فرمایا:

مَنْ سَرَّهٗ أَنْ يَّنْظُرَ إِلٰى رَجُلٍ مِّنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَلْيَنْظُرْ إِلٰى هٰذَا[۹] جو چاہتا ہے کہ اہل جنت میں سے کسی کو دیکھے وہ اس کو دیکھ لے۔

یہ حدیث اور اس سے پہلے حضرت طلحہ ؓ کی حدیث اس بات کی دلالت کرتی ہیں کہ یہ فرائض دین کی عملی بنیاد ہیں اور جس نے انھیں اچھے طریقے سے ادا کیا اور ان میں کوئی کمی بیشی نہ کی تو اس نے اپنے سامنے جنت کے دروازے کھول دیے، خواہ اس نے سنن میں سرگرمی نہ دکھائی ہو۔

یہاں تربیت کا نبوی انداز دیکھیں کہ آپ ﷺ پہلے ارکان اور اساسیات کی تعلیم دینے پر زور دیتے ہیں، نہ یہ کہ پہلے ان جزئیات کو لے لیں اور ان تفصیلات میں جائیں جو نہ ختم ہونے والی ہیں۔

● سنن کے لیے فرائض سے غفلت کی غلطی

تب یہ بات غلط ہے کہ آدمی سنن اور نوافل میں مشغول رہے اور اس کے لیے نماز،

۹- متفق علیہ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان، حدیث ۸

روزے، حج اور دوسرے فرائض سے غفلت اختیار کرے۔

بعض اوقات ہم اچھے خاصے دین داروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ راتوں کو اٹھ کر نمازیں پڑھتے ہیں اور پھر صبح اپنے کام پر، جس پر وہ تنخواہ کے امیدوار ہوتے ہیں اس حالت میں جاتے ہیں کہ وہ تھکاوٹ اور سستی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ اس کا پورا پورا حق ادا نہیں کرپاتے۔ کاش! کہ انھیں معلوم ہوتا کہ اپنے کام کو اچھے طریقے سے انجام دینا بھی فرض ہے:
إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ[10] اللہ تعالیٰ نے ہر کام میں احسان کو لازم کردیا ہے۔ اس میں کوتاہی کرنا امانت میں خیانت ہے اور مہینے کے آخر میں آدمی جو تنخواہ لیتا ہے وہ حرام کا مال ہوتا ہے۔ کاش! لوگوں کو اس بات کی سمجھ آئے کہ رات کے قیام کی حیثیت نفل سے زیادہ نہیں ہے، جو نہ اللہ تعالیٰ نے لازم کیا ہے اور نہ اس کے رسول نے۔

یہی معاملہ اس شخص کا بھی ہوتا ہے جو پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتا ہے۔ اس کو روزے کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ خاص طور پر گرمی کے دنوں میں وہ بڑی مشقت اور تھکاوٹ کے ساتھ اپنے کام پر جاتا ہے۔ وہ اکثر اوقات روزے کو ترجیح دے کر لوگوں کے بے شمار حقوق کو مؤخر کردیتا ہے۔ حالانکہ یہ روزہ نفل ہے، واجب یا فرض نہیں۔ اس کے مقابلے میں انسانوں کی ضروریات پوری کرنا واجب اور لازم ہے۔

نبی ﷺ نے اس عورت کو نفل روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے، جس کا شوہر گھر میں موجود ہو، سوائے اس کے کہ وہ اجازت دے۔ کیوں کہ شوہر کا حق ادا کرنا اس کے لیے نفل روزے سے زیادہ ضروری ہے۔

یہی معاملہ نفلی حج و عمرے کا ہے۔ بعض ایسے دین دار بھی موجود ہیں جو پانچواں، دسواں، بیسواں اور یہاں تک کہ چالیسواں حج کرلیتے ہیں، رمضان کے مہینے میں ہر سال عمرہ کرتے ہیں اور اس پر لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں۔ دوسری طرف بعض ممالک میں ایسے مسلمان ہیں جو

۱۰-مسلم ۱۹۵۵، ابو داؤد، ح ۲۸۱۵، ترمذی، ح ۱۴۰۹، نسائی ۴۴۰۵، ابن ماجہ، ح ۳۱۷۰۔

بلا مبالغہ بھوکے مر رہے ہیں جیسے صومالیہ وغیرہ میں۔ بعض ایسے ہیں جن کی اجتماعی نسل کُشی کی جارہی ہے اور انھیں مکمل طور پر ختم کیا جارہا ہے۔ جیسا کہ ہم بوسنیا، ہرزگ، فلسطین اور کشمیر وغیرہ میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنے بھائیوں کی طرف سے ہر قسم کی امداد کے مستحق ہیں، خواہ غذائی اجناس کی صورت میں ہو، موسم کے مطابق کپڑوں کی صورت میں یا علاج معالجے کی شکل میں۔ ان میں جو مہاجر ہوجاتے ہیں ان کے لیے رہائش کا انتظام، یتیموں، بوڑھوں اور بیواؤں کی کفالت کا انتظام کرنا ہماری توجہ چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کو اپنے دفاع کے لیے اسلحہ کی ضرورت ہے۔

کچھ اور لوگ ہیں جو عیسائی مشنریوں کے لیے لقمہ تر بنے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے کوئی اسلامی تعلیمی ادارہ نہیں جس میں وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلواسکیں، کوئی مسجد نہیں جہاں وہ نماز پڑھ سکیں، کوئی ایسا مرکز نہیں جہاں ان کی کفالت کا انتظام ہوسکے، کوئی ڈسپنسری نہیں جہاں وہ اپنا علاج کرواسکیں، کوئی دعوتی مرکز نہیں جو لوگوں کو اسلام کی طرف بلائے اور کوئی کتاب نہیں جسے لوگ پڑھ سکیں۔ ان حالات میں ہم ہر سال دیکھتے ہیں کہ ۷۰ فی صد حجاج وہ ہوتے ہیں جنھوں نے پہلے حج کیا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ نفل حج ادا کررہے ہوتے ہیں، کروڑوں روپے اس پر خرچ ہوجاتے ہیں اور اس پر وہ بڑے خوش ہوتے ہیں۔ مگر وہ دین کی صحیح سمجھ رکھتے اور انھیں ترجیحات کے مسئلے کی کچھ سمجھ بوجھ ہوتی تو وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی نجات کو حج و عمرے کی اپنی روحانی تسکین پر مقدم کرتے۔ اگر وہ غور کرتے تو ان کو معلوم ہوجاتا کہ مسلمانوں کو ہلاکت سے بچانے کی روحانی تسکین حج و عمرے کی عارضی تسکین سے زیادہ گہری اور پائیدار ہے، جس میں بعض اوقات غیر محسوس طور پر دکھاوے اور ریا کا ملاپ بھی ہوجاتا ہے۔

● امام راغب کی روشن باتیں

فقہا نے یہ بات طے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نفل کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک کہ فرض کو ادا نہ کیا جائے۔

امام راغب نے فرض عبادات اور نفل اخلاقیات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بڑی خوب صورت بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

جان لو کہ عبادت، اخلاقیات سے زیادہ وسیع ہے۔ ہر اخلاقی چیز عبادت ہے مگر ہر عبادت اخلاقیات میں سے نہیں ہے۔ ان کے درمیان ایک فرق یہ ہے کہ عبادات کے لیے چند متعین فرائض اور کھینچے ہوئے خطوط ہیں جن کا تارک ظالم اور حد سے بڑھنے والا شمار ہوتا ہے۔ مگر اخلاقیات کا معاملہ ایسا نہیں۔ آدمی مکارم شریعت کو پورا نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ عبادات کی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہوجائے۔ چنانچہ عبادات میں کوشش کرتے رہنا عدل کے باب سے ہے اور مکارم کی کوشش میں سرگرم ہونا فضل اور نفل کے باب سے ہے۔ اس شخص کی نفل قبول نہیں ہوتی جو فرض کو ادا نہ کرے اور اس شخص کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوتی جس نے عدل کو چھوڑ دیا ہو۔ بلکہ فضل کی لین دین ہی جائز نہیں ہے جب تک کہ آدمی عدل نہ کرے۔ عدل سے مراد ہے واجب کو ادا کرنا، اور فضل کا مطلب ہے واجب سے زائد کی ادائیگی، اور کسی چیز میں زائد کا تصور ہی کیسے کیا جاسکتا جب تک کہ اس کی ذات حاصل نہ ہوجائے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے: لَایَسْتَطِیْعُ الْوُصُوْلَ مَنْ ضَیَّعَ الْاُصُوْلَ. وہ شخص منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا جس نے اصل راستہ ہی ضائع کردیا ہو۔

جو شخص فرض کی ادائیگی میں نفل سے غافل رہا وہ معذور ہے اور جو شخص نفل کی ادائیگی میں فرض سے غافل ہوگیا وہ مغرور [یعنی دھوکے میں] ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لفظ عدل سے احکام کی طرف اور لفظ احسان سے مکارم کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ. (النحل ۱۶:۹۰)

اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

فرض کفایہ پر فرضِ عین کی ترجیح

جیسا کہ فرض کا درجہ نفل سے پہلے ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے اس طرح فرائض کے بھی آپس میں مختلف درجات ہیں۔

یہ بات یقینی ہے کہ فرض عین، فرض کفایہ پر مقدم ہے، کیوں کہ فرض کفایہ کو اگر چند افراد ادا کریں تو باقی لوگوں کی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے۔ جبکہ فرض عین میں ایسا ممکن نہیں ہے، ان میں کوئی بندہ کسی دوسرے کی جگہ یہ فرض ادا نہیں کرسکتا۔

احادیث سے ثابت ہے کہ فرضِ عین فرضِ کفایہ پر مقدم ہے۔ اس کی سب سے واضح مثال وہ ہے جو والدین کی خدمت اور فرض کفایہ جہاد فی سبیل اللہ کے بارے میں آئی ہے۔ فرض کفایہ جہاد اقدامی ہوتا ہے نہ کہ دفاعی۔ اقدامی جہاد اس کو کہتے ہیں کہ دشمن اپنے ملک میں ہو اور ہم اس پر پیش بندی کے طور پر حملہ کریں۔ جیسے ہمیں معلوم ہوجائے کہ وہ ہم پر حملہ کرنے والا ہے اور اس کی طرف سے جنگی سرگرمیاں سامنے آرہی ہیں، جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے بارے میں اس کے ارادے خطرناک ہیں۔ اس صورت میں تمام مسلمانوں کا جہاد کے لیے نکلنا فرض نہیں ہے بلکہ کچھ افراد کا جہاد کے لیے جانا باقی لوگوں کی طرف سے کافی ہوگا اور ان کے ذمے سے یہ فریضہ ساقط ہوجائے گا۔ البتہ اگر امیر سب کو نکلنے کا حکم دے تو پھر جہاد فرض عین ہوگا۔

لہٰذا اقدامی جہاد کی صورت میں والدین کی خدمت اور ان کی نگہداشت کرنا اس سے زیادہ بہتر اور ضروری ہے کہ آدمی فوج میں شامل ہوکر جہاد کرے۔ اسی کی طرف نبی ﷺ نے توجہ

دلائی ہے۔

بخاری ومسلم نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص سے نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی اجازت مانگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: أَحَيٌّ وَالِدَاكَ ؟ کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟ اس نے ہاں میں جواب دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فِيهِمَا فَجَاهِدْ. تم انھیں کی خدمت میں جہاد کرو۔[10]

صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگا: میں آپ سے ہجرت اور جہاد پر بیعت کرنا چاہتا ہوں، میں اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے اجر کا طالب ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَهَلْ مِنْ وَالِدَيْكَ أَحَدٌ حَيٌّ ؟ کیا تیرے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں، دونوں زندہ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَتَبْتَغِي الْأَجْرَ مِنَ اللّٰهِ ؟ تم اللہ سے اجر حاصل کرنا چاہتے ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَارْجِعْ إِلَى وَالِدَيْكَ، فَأَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا . اپنے والدین کے پاس لوٹ جاؤ اور اچھے طریقے سے ان کے ساتھ رہو (اسی میں تمھارا اجر ہے)۔[11]

اسی حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص سے ایک اور روایت منقول ہے کہ ایک شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں اپنے ماں باپ کو روتے ہوئے چھوڑ کر آیا ہوں کہ آپ سے ہجرت پر بیعت کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِرْجِعْ إِلَيْهِمَا، فَأَضْحِكْهُمَا كَمَا أَبْكَيْتَهُمَا .[12] واپس لوٹ جاؤ اور انھیں اسی طرح

۱۰-اسے بخاری نے کتاب الجہاد اور مسلم نے کتاب البر ۲۵۴۹ میں نقل کیا ہے۔

۱۱-صحیح مسلم ۴۹۲۵، شعب الایمان للبیہقی ۶/۱۷۶، السنن الکبریٰ ۹/۲۶۔

۱۲-اسے ابوداؤد نے کتاب الجہاد ۲۵۲۸، ابن ماجہ ۲۷۸۲، اور حاکم ۴/۱۵۲-۱۵۳ نے روایت کیا ہے، حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔

ہنساؤ جیسا کہ تو نے انھیں رُلایا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ مجھے جہاد میں حصہ لینے کا بہت شوق ہے لیکن میں اس سے عاجز ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هَلْ بَقِيَ مِنْ وَالِدَيْكَ أَحَدٌ ؟ کیا آپ کے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟

اس نے جواب دیا: میری ماں زندہ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قَابِلِ اللّٰهَ فِي بِرِّهَا، فَإِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ فَأَنْتَ حَاجٌّ وَمُعْتَمِرٌ وَمُجَاهِدٌ . اُس کے ساتھ حسن سلوک کر کے اللہ سے ملو، اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تمھارے لیے حج بھی ہے، عمرہ بھی اور جہاد بھی۔[13]

اور معاویہ بن جاہمہ سے روایت ہے کہ ایک بار میرے والد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور کہا: یارسول اللہ! میں نے جہاد کا ارادہ کیا ہے اور آپ سے مشورہ لینے آیا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هَلْ لَكَ مِنْ أُمٍّ ؟ کیا تیری ماں زندہ ہیں؟ اس نے کہا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَالْزِمْهَا، فَإِنَّ الْجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلِهَا .[14] اس کے پاس رہو، جنت اسی کے قدموں میں ہے۔

طبرانی نے اس روایت کو سند جید کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: جاہمہ کہتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں شرکت کی اجازت مانگ رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: کیا تیرے والدین ہیں؟ میں نے کہا: جی ہاں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم

۱۳-منذریؒ الترغیب والترھیب میں کہتے ہیں کہ اسے ابویعلیٰ نے المسند اور طبرانی نے الجامع الصغیر اور الأوسط میں روایت کیا ہے اور اس کی سند اچھی ہے۔ میمون بن نجیح کو ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے اور باقی راوی تو مشہور ہیں۔ المنتقی ۴/۱۴۷، اور ہیثمی کہتے ہیں کہ ان کے راوی وہی ہیں جو صحیح کے راوی ہیں، سوائے میمون بن نجیح کے، اور اسے ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ مجمع الزوائد ۸/۱۳۸۔

۱۴-اسے نسائی نے کتاب الجہاد ۶/۱۱۱، ابن ماجہ ۲۷۸۱، اور حاکم نے نقل کیا ہے۔ ذہبی نے ۴/۱۵۱ میں اس سے اتفاق کیا ہے۔

نے مجھے فرمایا:

أَلْزِمْهُمَا، فَإِنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ رِجْلِهِمَا تم ان کے پاس رہو، جنت ان کے قدموں کے نیچے ہے۔[15]

● فرائض کفایہ میں باہم تفاوت

میں یہاں یہ بات بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ فرائض کفایہ کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔

بعض فرض کفایہ وہ ہوتے ہیں جن کو چند افراد ادا کر لیتے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو ایک جم غفیر بن جاتا ہے۔

بعض فرض کفایہ ایسے ہیں جنھیں ایک معقول گروہ انجام نہیں دیتا، بلکہ بعض اوقات تو کوئی بھی اسے ادا نہیں کرتا۔

امام غزالی نے اپنے دور کے لوگوں کا یہ عیب بیان کیا ہے کہ وہ فقہ کے حصول میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں حالانکہ اس کا حصول فرض کفایہ ہے۔ مگر دوسری طرف وہ اور واجبات کفایہ کی خلا کو پر کرنے سے پیچھے رہتے ہیں، جیسے علم طب۔ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک ایک شہر میں پچاس پچاس فقیہ پائے جاتے ہیں مگر ان میں طبیب صرف ایک ہے اور وہ بھی غیر مسلم۔ حالانکہ علم طب کی دنیوی ضرورت تو سب کو معلوم ہے۔ جب کہ اس کا شرعی اور دینی احکام میں بھی بڑا دخل ہے۔

وہ فرض کفایہ جسے کوئی بھی ادا نہ کرے اس میں مشغول ہونا اس فرض کفایہ سے زیادہ بہتر ہوگا جسے بعض لوگ ادا کر رہے ہوں، اگر چہ انھوں نے مطلوبہ ضرورت پوری نہ کی ہو۔ اسی طرح ایسے فرض کفایہ میں لگ جانا جس کو ادا کرنے والے کافی تعداد میں نہ ہوں اس فرض کفایہ میں مشغول ہونے سے بہتر ہوگا جسے اچھی خاصی تعداد ادا کر رہی ہو بلکہ بعض اوقات تو ضرورت

۱۵- منذری نے بھی یہی کہا ہے۔ دیکھیے: المنتقی ۱۴۷/۵، اور ہیثمی کہتے ہیں: اس کے راوی ثقہ ہیں۔ دیکھیے: المجمع ۱۳۸/۸۔

سے زیادہ ہو۔

بعض اوقات تو ایک فرض کفایہ لوگوں میں سے کسی زید یا عمرو کے لیے فرض عین بن جاتا ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا کہ وہ اکیلا ہی ایسا شخص ہو جس میں اس کے لیے مطلوبہ قابلیت اور اہلیت پائی جاتی ہو اور اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ یہ کام کرنا ضروری ہے اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو۔

جیسے کسی شہر میں ایک فقیہ کی ضرورت ہو کہ وہ لوگوں کو فتوے دے اور اکیلا ایک ہی شخص ہو جس نے فقہ کا علم حاصل کیا ہو یا وہی اس کے حصول پر قادر ہو۔ اس پر لازم ہوگا کہ افتا کا کام کرے۔

یہی معاملہ خطیب، ڈاکٹر، انجینئر اور ہر اس شخص کا ہے جسے کسی خاص علم وفن میں مہارت حاصل ہو اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہو، اور صرف وہی یہ کام کر سکتا ہو۔

اسی طرح اگر وہ کوئی خاص عسکری مہارت رکھتا ہو اور اسلامی فوج کو اس کی ضرورت ہو اور اس ایک شخص کے علاوہ کوئی اس ضرورت کو پورا نہ کر سکتا ہو تو اس پر فرض عین ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس خدمت کی ادائیگی کے لیے پیش کرے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ترجیحات

اگر ایک طرف فرض عین فرض کفایہ پر مقدم ہے تو دوسری طرف فرض عین کے بھی آپس میں مختلف درجات ہیں۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت بعض مسائل میں ایسے احکام کو زیادہ اہمیت دیتی ہے جن کا تعلق حقوق العباد سے ہوتا ہے۔

وہ فرض عین جس کا تعلق صرف حقوق اللہ سے ہوتا ہے اس میں تسامح ممکن ہے۔ اس کے برعکس وہ فرض عین جس کا تعلق حقوق العباد سے ہوتا ہے اس میں یہ ممکن نہیں۔ علما نے کہا ہے: حقوق اللہ مسامحت پر مبنی ہیں اور حقوق العباد مشاحت [یعنی لڑائی جھگڑے] پر مبنی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مثلاً ایک طرف حج واجب ہے اور دوسری طرف قرض کی ادائیگی واجب ہے تو ان میں سے قرض کی ادائیگی کو مقدم کیا جائے گا۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ قرض ادا کیے بغیر حج کرے، سوائے اس کے کہ وہ قرض خواہ سے اجازت مانگے یا یہ کہ قرض میں ابھی وقت ہو اور اسے یقین ہو کہ حج کی ادائیگی کے باوجود وہ قرض اپنے وقت پر ادا کر سکے گا۔

اس مقام پر حقوق العباد، اور خاص طور پر مالی حقوق کی اہمیت میں ایک صحیح حدیث بھی کافی ہے جس میں آیا ہے کہ اللہ کی راہ میں شہادت بھی ـــــ جو ایک مسلمان کے لیے اپنے رب کے قرب کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے ـــــ اس کے قرض کو ساقط نہیں کر سکتی۔ یہ بات صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ يُغْفَرُ لِلشَّهِيدِ كُلُّ شَيْءٍ إِلَّا الدَّيْنَ. شہید کے لیے ہر چیز معاف ہے سوائے قرض کے۔[15]

۱۵- اسے امام مسلم نے کتاب الإمارة میں عبداللہ بن عمروؓ سے نقل کیا ہے [۱۸۸۶]۔

اس حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ایک آدمی نے کہا: یارسول اللہ! آپ مجھے بتائیے کہ اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں تو میرے گناہ دھل جائیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نَعَمْ، إِنْ قُتِلْتَ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَأَنْتَ صَابِرٌ مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ. ہاں، اگر تم اس حالت میں مارے جاؤ کہ تم صابر ہو اور آگے بڑھ رہے ہو نہ کہ پیچھے بھاگ رہے ہو۔

یہ بات کہہ کر نبی ﷺ نے پوچھا: تم نے کیا کہا تھا؟! آدمی نے اپنا سوال دہرایا۔ آپ ﷺ نے بھی اپنا جواب دہرایا مگر اب کی بار اس میں یہ اضافہ فرمایا: إِلَّا الدَّيْنَ، فَإِنَّ جِبْرِيلَ قَالَ لِي ذٰلِكَ. سوائے قرض کے، یہ بات مجھے جبریلؑ نے کہی ہے۔[16]

اس سے زیادہ تعجب کی بات نبی ﷺ کا وہ ارشاد ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: سُبْحَانَ اللهِ! مَاذَا أُنْزِلَ مِنَ التَّشْدِيدِ فِي الدَّيْنِ؟! وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَوْأَنَّ رَجُلًا قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللهِ ثُمَّ أُحْيِيَ ثُمَّ قُتِلَ ثُمَّ أُحْيِيَ، وَعَلَيْهِ دَيْنٌ، مَا دَخَلَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَقْضِيَ دَيْنَهُ. سبحان اللہ! یہ قرض کے بارے میں کتنی سختی نازل کی گئی ہے؟! اس ذات کی قسم، جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر ایک آدمی اللہ کی راہ میں قتل ہو جائے، پھر زندہ کیا جائے، پھر قتل ہو جائے اور پھر زندہ کیا جائے مگر وہ جنت میں نہیں جا سکے گا جب تک کہ وہ اپنا قرض ادا نہ کرے۔[17]

یہی معاملہ اس شخص کا ہے جو اللہ کی راہ میں ہو یعنی جہاد کر رہا ہو اور وہ مال غنیمت میں خیانت کرے یعنی اس مال میں سے اپنے لیے کوئی چیز لے لے جو ساری فوج کا حق ہوتا ہے۔ چنانچہ تقسیم ہونے سے پہلے مال غنیمت کی طرف ہاتھ بڑھانا اسے جہاد کی فضیلت اور مجاہدین کے اجر سے محروم کر دیتا ہے اور اگر وہ اسی حالت میں مرجائے تو یہ اس کے لیے شہادت کے شرف اور شہید کے اجر سے محرومی کا ذریعہ بنتا ہے۔

۱۶- اسے امام مسلم نے کتاب الإمارة میں ابوقتادہؓ سے نقل کیا ہے [۱۸۸۵]۔

۱۷- اسے امام احمد، نسائی اور حاکم نے محمد بن جحش سے نقل کیا ہے اور صحیح الجامع الصغیر میں اسے صحیح قرار دیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت پر ایک آدمی کو مقرر کیا تھا جسے کرکرہ کہتے تھے۔ جب وہ مرگیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: هُوَ فِي النَّارِ. وہ آگ میں ہے۔ لوگوں نے جاکر تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اس نے مالِ غنیمت سے ایک جبہ چوری کرلیا تھا۔[18]

صحابہ میں سے ایک شخص خیبر میں وفات پاگیا۔ لوگوں نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

صَلُّوْا عَلٰی صَاحِبِکُمْ. اپنے ساتھی کی نمازِ جنازہ خود ہی پڑھ لو۔

یہ سن کر لوگوں کا رنگ اڑ گیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ صَاحِبَکُمْ غَلَّ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. تمھارے ساتھ نے اللہ کی راہ میں ہوتے ہوئے خیانت کی ہے۔

لوگوں نے اس کا سامان دیکھا تو انھیں ایک ڈھال ملی جسے یہودی استعمال کیا کرتے تھے جس کی قیمت دو درہم بھی نہیں ہوگی۔[19]

دو درہم کی خیانت کی وجہ سے نبی ﷺ نے ایک صحابی کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار کیا۔ اس کا مقصد عوامی مال کی لالچ پر بلیغ ترین زجر و توبیخ کرنا تھا، خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جب غزوہ خیبر کا دن ہوا تو کچھ صحابہ آئے اور کہنے لگے کہ فلاں شہید ہوگیا، فلاں شہید ہوگیا۔ اس دوران وہ ایک اور لاش کے پاس گزرے تو کہنے لگے: فلاں بھی شہید ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

كَلَّا، إِنِّيْ رَأَيْتُهُ فِي النَّارِ، فِيْ بُرْدَةٍ غَلَّهَا — أَوْ — فِيْ عَبَاءَةٍ غَلَّهَا. ہرگز نہیں، میں نے اسے آگ میں دیکھا ہے، کیوں کہ اس نے مالِ غنیمت میں سے ایک چادر — یا —

۱۸- اسے امام بخاری نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۱۹- اس حدیث کو امام مالک نے کتاب الجهاد، ص ۳۵۸، احمد ۱۱۴/۴، ابوداؤد ۲۷۱۰، نسائی ۶۴/۴، ابن ماجہ ۲۸۴۸، اور حاکم ۱۲۷/۲ نے زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اسے صحیح علی شرط شیخین قرار دیا ہے۔ ذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔

ایک جبہ لیا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

يَاابْنَ خَطَّابٍ! اِذْهَبْ فَنَادِ فِي النَّاسِ: إِنَّهُ لَايَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ. اے ابن خطاب! جاکر لوگوں میں اعلان کر دو کہ جنت میں مومنوں کے سوا کوئی نہیں جاسکتا۔[20]

یہ احادیث کس بات کی دلالت کررہی ہیں؟ یہ اس بات کی دلالت کررہی ہیں کہ حقوق العباد کی اہمیت بہت زیادہ ہے، خصوصاً وہ حقوق العباد جن کا تعلق مالی امور سے ہو خواہ عوامی اموال ہوں یا افراد کے ذاتی اموال۔ ان میں ناجائز طور پر مال لینا حرام اور اکل بالباطل ہے، خواہ وہ کتنا ہی کم ہو۔ کیوں کہ اہم کسی کام کا آغاز ہوتا ہے۔ جو شخص 'تھوڑا' لینے کی جرأت کرتا ہے تو خطرہ ہے کہ وہ 'زیادہ' کی جرأت بھی کرے گا۔ صغیرہ گناہ انسانوں کو کبیرہ کی طرف بلاتا ہے۔ بڑے الاؤ کا سبب چھوٹی سی چنگاری ہی تو ہوتی ہے۔

۲۰- اسے مسلم نے کتاب الإيمان میں نقل کیا ہے [۱۸۲]۔

فرد کے حق پر جماعت کے حق کی ترجیح

اس مقام پر ترجیحات کے مسئلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ فرائض جو جماعت کے حقوق سے تعلق رکھتے ہیں وہ مقدم ہوں گے ان فرائض پر جن کا تعلق افراد کے حقوق سے ہے۔ کیوں کہ فرد کی بقا جماعت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ایک انسان اکیلے نہیں رہ سکتا کیوں کہ وہ فطری طور پر تمدن پسند ہے جیسا کہ زمانہ قدیم کے لوگوں نے کہا ہے، یا وہ معاشرتی حیوان ہے جیسا کہ جدید دور کے لوگوں کا کہنا ہے۔ انسان اکیلا ہو تو تھوڑا ہے اور جماعت کے ساتھ ہو تو [ایک اکیلا دو گیارہ کے مصداق] بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اکیلا ہو تو وہ معدوم ہے اور اگر جماعت کے ساتھ ہو تو اس کا وجود قائم رہتا ہے۔●

یہیں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ واجب جس کا تعلق جماعت کے حقوق سے ہو، زیادہ تاکیدی ہے بمقابلہ ان واجبات کے جو فرد کے حقوق سے تعلق رکھتے ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ علما کے ہاں جہادِ کفایہ اور خدمتِ والدین کے درمیان تعارض کی صورت میں یہ بات طے ہے کہ والدین کی خدمت مقدم ہے۔ جیسا کہ ان احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہو چکا ہے جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ مگر جب جہاد فرض عین ہو جائے، مثلاً دشمن کسی مسلمان ملک پر حملہ آور ہو تو اس ملک کے سارے لوگوں پر فرض عین ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے دفاع کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس صورت میں اگر کوئی ماں باپ اپنی مادری اور پدری شفقت کی وجہ سے کسی

● شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ع

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں...... موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مسلمان کو جہاد میں شرکت سے روکیں تو شرعی طور پر اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

یہ بات درست ہے کہ ان کی خدمت اور ان کی اطاعت فرض عین ہے، جیسا کہ یہاں جہاد فرض عین ہے مگر یہاں جہاد کا فرض پوری اُمت کے دفاع کے لیے ہے اور والدین بھی اس میں شامل ہیں۔ اگر یہ ملک ہی دشمن کے قبضے میں چلا جائے یا اس کے سارے لوگ ہلاک ہو جائیں تو ان میں والدین بھی ہلاک ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہاں جہاد میں سب کا مفاد ہے۔

اس سے یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ یہاں جہاد اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور خدمت والدین کا حق ہے اور یہاں اللہ کا حق مخلوق کے حق پر مقدم ہے۔

یہ پچھلی بحث کی مزید تاکید ہے۔ اکثر اوقات جب حقوق اللہ کی بات کی جاتی ہے تو ان سے مراد جماعت یا اُمت کے حقوق ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان احکام کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ یہ سب احکام اول و آخر بندوں کے مفاد میں ہیں۔

اس قاعدے (یعنی اُمت کے حق کو فرد کے حق پر مقدم کرنے) کی عملی تعبیر کے طور پر امام غزالی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر دشمن کسی مسلمان کو اپنے لیے ڈھال بنائے تو چند شرائط کے ساتھ ان کو مارنا جائز ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بات اتنی زیادہ حتمی ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ مسلمان کے خون کی حفاظت کرنا واجب ہے اور ناحق طور پر کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں ہے۔ پھر امام غزالی رحمہ اللہ اور ان جیسے دوسرے علما نے ان بے گناہ لوگوں کو مارنا کیسے جائز قرار دیا ہے جنھیں کافر فوج نے اپنے لیے ڈھال بنا رکھا ہو؟

انھوں نے یہ بات اس لیے جائز قرار دی ہے کی جماعت کی حفاظت کی جائے اور اُمت کو ہلاکت سے بچایا جائے۔ کیوں کہ فرد کے قتل کی تلافی تو ہو جائے گی مگر اُمت کی ہلاکت کی تلافی کیا ہو سکتی ہے۔

فقہا کہتے ہیں: اگر دشمن کسی مسلمان کو اپنے لیے ڈھال بنائے، جیسے وہ ان کو قید کر لے یا

کسی اور طریقے سے انھیں حاصل کرے اور انھیں مسلمان فوج کے سامنے لائے تاکہ انھیں آگے کر کے اپنے آپ کو بچا سکے۔ اب اگر ان حملہ آوروں کو چھوڑنے میں اُمت کی ہلاکت کا خطرہ ہو تو ان کے خلاف لڑنا جائز ہوگا۔ اگرچہ ان کے ساتھ وہ مسلمان بھی قتل ہو جائیں جن کو دشمن نے اپنے لیے ڈھال بنایا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ معصوم ہیں اور اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے مگر پوری اُمت کے دفاع کی ضرورت تقاضا کر رہی ہے کہ ان چند افراد کی قربانی دے کر اسلام کے استیصال اور کافروں کے غلبے کے خطرے کو ٹال دیا جائے۔ اور ان لوگوں کا اجر اللہ کے ذمے ہوگا۔[21]

اسی بنا پر امام غزالی رحمہ اللہ نے ان لوگوں کی دلیل کو مسترد کیا ہے جو اس صورت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ معصوم اور حرمت والی جان کو قتل کرنا ہے، کیوں کہ اسے مجبور کیا گیا ہے۔ اس دلیل کو انھوں نے اس لیے مسترد کیا ہے کہ ان کے خون کو ناجائز قرار دینے سے اتنے زیادہ جانوں اور خونوں کا جواز لازم آتا ہے جس کا کوئی حساب نہیں ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ شریعت کلی اشیا کو جزوی پر ترجیح دیتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو کفار کے آگے جھکنے سے بچانا مقاصد شرعیہ میں زیادہ اہم ہے اس سے کہ ایک مسلمان کے خون کی حفاظت کی جائے۔ لہٰذا یہ بات مقاصد شرع کے لحاظ قطعی بن جاتی ہے۔[22]

یہ بات بھی، جیسا کہ ہمارا خیال ہے، ترجیحات کے مسئلے پر مبنی ہے۔

اسی طرح اگر جنگی حالات تقاضا کریں کہ اہل ثروت لوگوں پر جہاد فنڈ کے لیے، فوجوں کی کمک کے لیے، قلعے بنانے اور اس طرح کے دوسرے جنگی ضروریات کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ مختلف ٹیکس لگائے جائیں تو شریعت نہ صرف اس کی تائید کرتی ہے بلکہ اس کو واجب ٹھہراتی ہے جیسا کہ فقہا نے اس کی تصریح کی ہے۔ اگرچہ اکثریت ان فقہا کی ہے جو عام حالات میں

۲۱- دیکھیے: المستصفیٰ، ۱/۲۹۴-۲۹۵۔

۲۲- دیکھیے: المستصفیٰ، ۱/۳۰۳۔

زکوٰۃ کے علاوہ لوگوں سے کسی قسم کے ٹیکسوں کے حق میں نہیں ہیں۔ اس حوالے سے امام غزالی رحمہ اللہ اپنے اس قول سے استدلال کرتے ہیں: ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ جب دو برائیوں یا دو ضرروں کا آپس میں تعارض آجاتا ہے تو شریعت ان میں سے اسی شر اور ضرر کو پہلے دفع کرتی ہے جو زیادہ نقصان والا اور زیادہ برا ہو۔

ٹیکس لگانے کے صورت میں ان لوگوں میں سے ہر ایک کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ اس نقصان سے بہت کم ہے جو جہاد کے انتظامات نہ ہونے اور ملک کو خطرات درپیش ہونے کی صورت میں ان لوگوں کو مالی اور جانی طور پر پیش آسکتا ہے۔ کیوں کہ وہ جہاد اور مجاہدین کی قوت ہی ہوتی ہے جو ملک کے نظام کی حفاظت کرتی ہے اور برائی کے مادے کو ختم کرتی ہے۔[23]

یہی معاملہ مسلمان قیدیوں کی آزادی اور انھیں کفار کی قیدِ ذلت سے چھڑانے کے سلسلے میں ہے، خواہ اس پر کتنا ہی خرچ آئے۔ امام مالک فرماتے ہیں: تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے قیدیوں کو آزاد کرنے کے لیے فدیہ ادا کریں، خواہ اس سے ان کا سارا مال ختم ہی کیوں نہ ہو جائے۔[24]

یہ بات اس لیے ہے کہ ان قیدیوں کا احترام اُمت مسلمہ کا احترام ہے۔ اور اُمت کا احترام ایسی انفرادی حرمتوں پر فوقیت رکھتا ہے جس کا تعلق افراد کے مال سے ہو۔

۲۳- دیکھیے: المستصفیٰ، ۱/۳۰۳-۳۰۴۔ نیز دیکھیے: الاعتصام، الشاطبی ۲/۱۲۱، طبع: شرکۃ الإعلانات الشرقیۃ۔

۲۴- احکام القرآن، قاضی ابوبکر بن العربی، ص ۵۹-۶۰۔

فرد و قبیلہ کے بجائے اُمت سے جڑ جانا

اس مفہوم کی تائید اس ہدایت سے بھی ہوتی ہے جو قرآن وسنت نے جماعت کے ساتھ تعلّق اور اُمت ہونے کے احساس کو قبیلے، خاندان اور فرد کے ساتھ تعلّق پر مقدم رکھنے کے حوالے سے دی ہے۔ چنانچہ اس میں نہ فردیت ہے نہ عصبیت اور نہ جماعت سے بے مہاری۔

جاہلی معاشرے میں قبیلہ ہی ایک دوسرے سے تعلّق کی بنیاد اور ایک نصب العین پر اکٹھا ہونے کا مرکز تھا۔ ایک فرد حق اور باطل دونوں میں اپنے قبیلے کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کی تعبیر شاعر کے اس قول میں موجود ہے:

لَايَسْأَلُونَ أَخَاهُمْ حِينَ يَنْدُبُهُمْ   فِي النَّائِبَاتِ عَلٰى مَا قَالَ بُرْهَانًا!

ان لوگوں کو جب ان کے بھائی مصیبتوں میں پکارتے ہیں تو یہ اُن سے یہ نہیں پوچھتے کہ تمھاری بات کی دلیل کیا ہے۔

ان کا شعار یہ تھا کہ أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا! اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔[25]

پھر جب اسلام آیا تو اس نے ولایت کو اللہ اور اس کے رسول کے لیے اور جماعت مومنین یعنی اُمت مسلمہ کے لیے خاص کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ

۲۵- ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہی بات فرمائی تو صحابہ کو بہت تعجب ہوا کہ آپ نے جاہلیت کی یہ بات کیسے دہرائی۔ انھوں نے پوچھا: ظالم کی مدد کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے وضاحت فرمائی: ظالم کا ہاتھ پکڑ و یہ اس کی مدد ہے۔ (مترجم)

الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُونَ o وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُونَ. (المائدہ۵: ۵۵-۵۶)

تمھارے رفیق تو حقیقت میں اللہ اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنا لے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔

قرآن وسنت نے لوگوں کی ایسی تربیت کی جس کے ذریعے وہ اللہ اور اس کے رسول کے شہدا بالقسط بن گئے۔ اس سے ان کو نہ کسی رشتہ دار کے ساتھ محبت کا جذبہ روک سکتا ہے نہ کسی دشمن سے بغض کا۔ کیوں کہ عدل تو ہر قسم کے جذبات سے بالاتر اور خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ وہ اپنے کسی محبوب کی بے جا طرف داری کرتا ہے نہ کسی ناپسندیدہ شخص پر بے جا ظلم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوّٰمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ. (النساء۴: ۱۳۵)

اے لوگو، جو ایمان لائے ہو! انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو، اگرچہ تمھارے انصاف اور تمھاری گواہی کی زد خود تمھاری اپنی ذات پر یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوّٰمِينَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى أَلَّا تَعْدِلُوا اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ. (المائدہ۵: ۸)

اے لوگو، جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔

رسول اللہ ﷺ نے جاہلیت کی ایک عبارت استعمال کی مگر اسے ایک نیا مفہوم پہنایا جو لوگوں کے لیے نامانوس تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا ۔اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے پوچھا: اگر وہ مظلوم ہو تو ہم اس کی مدد کریں گے مگر جب وہ ظالم ہو تو پھر ہم اس کی کیسے مدد کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

تَحْجُزُهُ عَنِ الظُّلْمِ فَإِنَّ ذٰلِكَ نَصْرُهُ ۔اس کو ظلم سے روکنا اس کی مدد کرنا ہے۔[26]

اس طرح آپ ﷺ نے ظالم کی مدد کرنے کا مفہوم الٹ دیا۔ اب اس کی یہ مدد کرنا ضروری ہو گیا کہ آپ اس کی خواہشات نفسانی اور اغوائے شیطانی کا مقابلہ کرنے میں اس کی مدد کریں اور اس کا ہاتھ پکڑیں تا کہ وہ ظلم کے گڑھے میں گرنے سے بچے۔ کیوں کہ یہ دُنیا میں وبال اور آخرت میں اندھیرا ہے۔

نبی ﷺ نے عصبیت کی دعوت دینے اور اس کے پرچم تلے لڑنے کی ممانعت فرمائی۔ اگر کوئی اس جھنڈے کے نیچے لڑتے ہوئے قتل ہوا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

ایک حدیث صحیح میں آپ ﷺ سے یہ بات منقول ہے:

مَنْ قُتِلَ تَحْتَ رَايَةِ عُمِّيَّةٍ، يَدْعُو عَصَبِيَّةً، وَيَنْصُرُ عَصَبِيَّةً فَقِتْلَتُهُ جَاهِلِيَّةٌ ۔[27] جو شخص عُمِّیّہ کے جھنڈے تلے لڑا، عصبیت کی دعوت دیتے ہوئے اور عصبیت کی حمایت کرتے ہوئے، تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

عُمِّیّہ اس اندھے معاملے کو کہتے ہیں جس کی صحیح صورتِ حال آدمی کی سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔

ایک اور حدیث میں ہے:

۲۶- اس حدیث کو امام احمد، بخاری اور ترمذی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ اس کا مفہوم امام مسلم نے حضرت جابرؓ سے بھی روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۱۵۰۱، ۱۵۰۲۔

۲۷- اس حدیث کو امام مسلم نے کتاب الإمارۃ میں حضرت جندب بن عبداللہ البجلیؓ سے روایت کیا ہے [۱۸۵۰]۔

مَنْ خَرَجَ عَنِ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ، فَمَاتَ، مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً، وَمَنْ قَاتَلَ تَحْتَ رَايَةِ عُمِّيَّةٍ، يَغْضَبُ لِعَصَبَةٍ، أَوْ يَدْعُو إِلٰى عَصَبَةٍ، أَوْ يَنْصُرُ عَصَبَةً، فَقُتِلَ فَقِتْلَتُهُ جَاهِلِيَّةٌ ۔[28] جو شخص اطاعت سے نکلا، جماعت سے الگ ہوا اور اس حالت میں مرگیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ اور جو عُمِّیّہ کے جھنڈے تلے لڑا، اس کا غصہ عصبیت کے لیے، اس کی دعوت عصبیت کی طرف اور اس کی مدد عصبیت کے ساتھ ہو اور اس حالت میں قتل ہوا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

ایک اور حدیث جو ابوداوٗد نے روایت کی ہے اس میں ہے:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا إِلٰى عَصَبِيَّةٍ، وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَلٰى عَصَبِيَّةٍ، وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَّاتَ عَلٰى عَصَبِيَّةٍ ۔[29] وہ شخص ہم میں سے نہیں جو جاہلیت کی طرف دعوت دے، وہ شخص ہم میں سے نہیں جو جاہلیت کے لیے جنگ کرے اور وہ شخص ہم میں سے نہیں جو جاہلیت پر مرے۔

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: یارسول اللہ! عصبیت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

أَنْ تُعِينَ قَوْمَكَ عَلَى الظُّلْمِ ۔[30] یہ کہ تم ظلم میں اپنی قوم کی حمایت کرو۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اور مرفوعاً دونوں طرح سے روایت ہے:

مَنْ نَصَرَ قَوْمَهُ عَلٰى غَيْرِ الْحَقِّ فَهُوَ كَالْبَعِيرِ الَّذِي رُدِّيَ، فَهُوَ يُنْزَعُ بِذَنَبِهِ ۔[31]

جو شخص ناحق میں اپنی قوم کی حمایت کرتا ہے تو یہ اس اونٹ کی طرح ہے جو کسی گڑھے میں

۲۸- اسے بھی امام مسلم نے روایت کیا ہے مگر حضرت ابوہریرہؓ سے [۱۸۴۸]۔

۲۹- اسے ابوداوٗد نے اپنی سنن کی کتاب الأدب میں نقل کیا ہے [۵۱۲۱]۔

۳۰- اسے ابوداوٗد نے روایت کیا ہے ۵۱۱۹۔

۳۱- ابوداوٗد، موقوفاً: ۵۱۱۷، اور مرفوعاً: ۵۱۱۸۔

گر جائے اور اُسے دُم سے پکڑ کر نکالا جائے۔

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ میں بھی پڑ گیا اور ہلاک بھی ہوا، جیسے ایک اونٹ کنویں میں گر جائے اور کوئی اسے دُم سے پکڑ کر نکالنے کی کوشش کرے مگر اُسے ہلاکت سے نہ بچا سکے۔

نبی ﷺ نے جس طرح عصبیت کو ناپسند کیا، اس سے براءت کا اظہار کیا، اور ہر اس شخص سے جو عصبیت کی طرف دعوت دے، اس کی خاطر لڑے، یا اس کے لیے جان دے، لاتعلقی کا اعلان فرمایا، اسی طرح آپ ﷺ نے جماعت کے ساتھ رہنے کی دعوت دی اور اپنے قول، عمل اور کردار سے اس کی تاکید فرمائی۔ آپ ﷺ نے تفرقے، اختلاف، تشتت اور الگ الگ ہونے سے منع فرمایا۔ اس طرح کے اقوال میں سے آپ ﷺ کے چند ارشادات درج ذیل ہیں:

يَدُ اللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ.[32] جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

اَلْجَمَاعَةُ رَحْمَةٌ، وَالْفُرْقَةُ عَذَابٌ.[33] جماعت رحمت اور تفرقہ عذاب ہے۔

دوسرے الفاظ میں: اَلْجَمَاعَةُ بَرَكَةٌ وَالْفُرْقَةُ عَذَابٌ.[34] جماعت برکت اور تفرقہ عذاب ہے۔

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ، وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ، وَهُوَ مَعَ الْإِثْنَيْنِ أَبْعَدُ، مَنْ أَرَادَ بُحْبُوحَةَ الْجَنَّةِ فَلْيَلْزَمِ الْجَمَاعَةَ.[35] جماعت کے ساتھ

۳۲-۱اسے ترمذی نے ابن عباسؓ سے، ابن ابی عاصم اور حاکم نے ابن عمرؓ سے اور ابن ابی عاصم ہی نے اسامہ بن شریکؓ سے بھی نقل کیا ہے۔ دیکھیے :صحيح الجامع الصغير ۸۰۶۵۔

۳۳-۱اسے احمد نے مسند میں اور ابن ابی عاصم نے السنة میں نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے :صحيح الجامع الصغير

۳۴-۱اسے امام بیہقی نے شعب الإيمان میں نعمان بن سے بھی روایت کیا ہے۔ دیکھیے :صحيح الجامع الصغير ۳۰۱۴۔

۳۵-۱اسے ابوداؤد [۲۵۲۸] وغیرہ نے کتاب الجہاد میں نقل کیا ہے، ابن ماجہ [۲۷۸۲] اور حاکم نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ ۴:۱۵۲-۱۵۳]۔ امام ذہبی نے ان کے ساتھ اتفاق کیا ہے۔

رہو اور تفرقے سے بچ کر رہو کیوں کہ شیطان اکیلے آدمی کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ دو آدمیوں سے دور رہتا ہے۔ جو چاہتا ہے کہ جنت کے عین وسط میں اسے جگہ ملے تو وہ جماعت کے ساتھ رہے۔

● روحِ جماعت کی تخم ریزی

جماعت اور اُمت کے ساتھ ولایت کا یہ جذبہ جو نبی ﷺ نے لوگوں کے دلوں میں کاشت کیا اس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام ہر اس معاملے کی طرف بھرپور توجہ دیتا ہے جس کا تعلق معاشرے اور اُمت سے ہو اور وہ مصالح ومطالب کے درجات میں اسے بلند مقام عطا کرتا ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ شریعت اسلامی نے اپنی عبادات، معاملات، آداب اور باقی احکام میں معاشرتی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔

وہ فرد کو اس مقصد کے لیے تیار کرتی ہے کہ وہ معاشرے کی عمارت میں پہلی اینٹ بن جائے یا اس کے زندہ جسم کے نقشے میں ایک فعال عضو قرار پائے۔

فرد کے لیے عمارت میں اینٹ یا جسم میں عضو ہونے کی تعبیر میری گھڑی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ بلیغانہ نبوی تعبیر ہے جو حدیث صحیح میں آئی ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا.[36] مومن دوسرے مومنوں کے لیے عمارت کی (اینٹوں کی) طرح ہوتے ہیں جو ایک دوسری کو سہارا دیتی ہیں۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ: كَمَثَلِ الْجَسَدِ، إِذَا

۳۶-متفق علیہ بروایت ابوموسیٰ اشعری، دیکھیے :اللؤلؤ و المرجان ۱۶۷۰۔

اشْتَکٰی مِنْهُ عُضْوٌ، تَدَاعٰی لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰی.[۳۷] مومنوں کی مثال باہمی محبت اور رحمت وشفقت میں ایسی ہے جیسے وہ ایک جسم کے اعضا ہوں، جسم کے ایک عضو میں جب شکایت ہوتی ہے تو سارا جسم اس کے لیے بے خوابی اور بخار میں مبتلا رہتا ہے۔

اسلام اپنے تمام احکام اور تعلیمات میں قرآن وسنت کے ذریعے مسلمان کے دل میں اجتماعیت کے احساس کا بیج بوتا ہے۔

نماز با جماعت، جمعہ، عیدین، اذان اور مسجد میں حاضری کو لازم کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اذان سننے کی صورت میں ایک اندھے کو بھی گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی اور آپ ﷺ نے ایسے لوگوں کے گھروں کو آگ لگانا چاہی جو جماعت سے غائب رہتے ہیں۔

پھر مسجد میں ایک مسلمان کے لیے یہ بات ناپسند کی گئی کہ وہ صفوں کے پیچھے اکیلے نماز پڑھے۔ کیوں کہ اس میں انفرادیت اور بظاہر جماعت سے الگ ہونے کی صورت نظر آتی ہے۔

حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھ رہا ہے تو آپ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنی نماز دہرادے۔[۳۸]

حضرت علی بن شیبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: ہم اپنے علاقے سے چلے اور نبی ﷺ کے پاس آئے۔ ہم نے آپ ﷺ سے بیعت کی اور آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی۔ پھر ایک اور نماز پڑھی۔ آپ ﷺ نے جب نماز پوری کی تو دیکھا کہ ایک آدمی صف کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے۔ نبی ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا:

اِسْتَقْبِلْ صَلَاتَكَ، وَلَا صَلَاةَ لِلَّذِيْ صَلّٰى خَلْفَ الصَّفِّ.[۳۹] اپنی نماز نئے سرے

۳۷- متفق علیہ، بروایت حضرت نعمان بن بشیرؓ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۱۶۷۱۔

۳۸- اس حدیث کو ابوداؤد نے حدیث ۶۸۲، ترمذی نے ۲۳۰، اور ابن ماجہ نے ۱۰۰۴ میں نقل کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

۳۹- اس حدیث کو ابن ماجہ نے حدیث ۱۰۰۳ میں نقل کیا ہے اور الزوائد میں ذکر ہے کہ اس کی سند صحیح اور راوی ثقہ ہیں۔

سے ادا کرو، اس شخص کی کوئی نماز نہیں جو صف کے پیچھے [اکیلے] نماز پڑھے۔

مسلمان کو چاہیے کہ جب مسجد میں داخل ہو اور وہ دیکھے کہ صفیں پوری ہوگئی ہیں تو وہ ان میں خالی جگہ تلاش کرے اور اس میں گھس جائے۔ اگر خالی جگہ نہ ملے تو اگلی صف سے ایک آدمی کو پیچھے کھینچ کر اپنے برابر میں کھڑا کردے مگر اکیلے کھڑا نہ ہو۔ جس آدمی کو وہ کھینچتا ہے اس کو بھی چاہیے کہ نرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ پیچھے آجائے۔ اس میں اسے بھی ثواب ملے گا۔

بعض ائمہ نے اس حدیث کو ظاہری معنی میں لے لیا ہے اور انھوں نے اس شخص کی نماز کو باطل قرار دیا ہے جو صف کے پیچھے نماز پڑھتا ہے۔ جبکہ بعض ائمہ نے اسے مکروہ کہا ہے۔

ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام شکل وصورت کے لحاظ سے بھی جماعت اور وحدت کو اہمیّت دیتا ہے اور حقیقی اعتبار سے بھی اس کو اہم قرار دیتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک مسلمان جب اکیلے نماز پڑھتا ہے اس وقت بھی وہ اپنے دل میں مسلمان جماعت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ جب اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس سے مناجات کرتا ہے تو وہ جماعت کی طرف سے گفتگو کرتا ہے۔ مثلاً وہ پڑھتا ہے:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ٥ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ. (الفاتحہ ۱: ۴-۵)

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔

اس میں وہ صرف اپنے لیے ہدایت کی دُعا نہیں کرتا بلکہ اپنے لیے بھی مانگتا ہے اور اپنی جماعت کے لیے بھی۔

روزہ بھی آدمی اکیلے نہیں رکھتا، خواہ اس نے رمضان کا چاند خود ہی دیکھ لیا ہو۔ وہ اکیلے عید فطر بھی نہیں کرتا اگرچہ اس نے شوال کا چاند اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔[۴۰] روزہ اسی دن

۴۰- ائمہ فقہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر رمضان کا چاند اکیلا آدمی بھی دیکھے تو وہ روزہ رکھے گا۔ صرف حضرت عطاؒ تابعی نے اس سے اختلاف کیا ہے مگر وہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اس کے ساتھ ایک اور آدمی دیکھ لے تو دونوں روزہ رکھیں گے۔ دیکھیے: فقہ السنۃ، السید سابق ۱/۳۸۶، طبع: دار الکتب العربی۔ معلوم ہوا کہ اس مسئلے میں مؤلف کی رائے تفرد پر مبنی ہے۔ (مترجم)

رکھتا ہے جب دوسرے لوگ روزہ رکھتے ہیں اور عید فطر اسی دن کرتا ہے جس دن دوسرے لوگ کرتے ہیں جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے۔

یہی معاملہ وقوف عرفہ کا بھی ہے۔ یہ وقوف اسی وقت کیا جائے گا جب پوری مسلمان جماعت وقوف کرتی ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ ایک بستی کے بعض لوگوں نے ذوالحجہ کا چاند دیکھا مگر شہر کے ذمہ دار افسر کے نزدیک اس کا ثبوت نہیں ہوا تو کیا وہ نویں دن کا روزہ رکھ سکتے ہیں حالانکہ وہ حقیقت میں ان کے مطابق دسواں دن ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں، مسلمانوں کی جماعت کے ہاں جو بظاہر نواں دن ہے تو اس دن وہ روزہ رکھیں، اگرچہ ان کے چاند دیکھنے کو معتبر کیا جائے تو وہ حقیقت میں دسواں دن ہو۔ اس کی دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

صَوْمُكُمْ يَوْمَ تَصُوْمُوْنَ، وَفِطْرُكُمْ يَوْمَ تُفْطِرُوْنَ، وَأَضْحَاكُمْ يَوْمَ تُضَحُّوْنَ.[41]

تمھارا روزہ اس دن ہوگا جس دن تم سب روزہ رکھو، تمھاری عیدِ فطر اس دن ہوگی جس دن تم سب عیدِ فطر مناؤ اور تمھاری عیدِ اَضحیٰ اس دن ہوگی جب تم سب عیدِ اَضحیٰ مناؤ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْفِطْرُ يَوْمَ يُفْطِرُ النَّاسُ وَالْأَضْحٰى يَوْمَ يُضَحِّي النَّاسُ.[42] عیدِ فطر کا دن وہ ہے جس دن لوگ فطر کرتے ہیں اور عیدِ اَضحیٰ کا دن وہ ہے جب لوگ قربانیاں کرتے ہیں۔

سارے ائمہ مسلمین کا عمل اسی پر ہے۔ اگر لوگ غلطی سے دسویں دن عرفات پر کھڑے ہوں تو اس پر اتفاق ہے کہ ان کا وقوف درست ہوگا اور ان کے حق میں یہی دن عرفہ ہوگا۔[43]

❖❖❖

۴۱- اسے ابوداؤد، ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

۴۲- اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

۴۳- شرح غاية المنتهى فى الفقه الحنبلى ۲/۲۱۷-۲۱۸۔

۸

منہیات میں ترجیحات

کفر کی قسمیں اور ان میں ترجیحات

ہم نے مامورات کے بارے میں تفاوت واختلاف کے حوالے سے جو بات کہی ہے اور مستحب سے لے کر واجب تک، اور فرض کفایہ سے لے کر فرض عین تک، اس کے جو درجات اور مختلف منزلیں مقرر کی ہیں، اور فرض عین میں بھی مختلف درجات کا تعین کرلیا ہے، تو وہی بات ہم منہیات کے حوالے سے بھی کہتے ہیں۔ منہیات بھی سارے کے سارے ایک ہی مرتبے میں نہیں ہیں۔ بلکہ اس میں بہت زیادہ تفاوت پایا جاتا ہے۔ ان میں سب سے اعلیٰ ممنوع جس میں کوئی شک نہیں ہے اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار ہے اور اس کا ادنیٰ ترین درجہ مکروہ تنزیہی کا ہے، جسے دوسرے الفاظ میں 'خلاف اَولیٰ' کہتے ہیں۔ کفر کے بھی اسی طرح کے ایک دوسرے سے کم یا زیادہ درجات ہیں۔

● **انکار والحاد کا کفر**

کفر کی ایک قسم یہ ہے کہ اس میں الحاد اور اللہ کے وجود سے انکار پایا جاتا ہو۔ اس کفر کے لحاظ سے جو شخص کافر ہو جاتا ہے وہ نہیں مانتا کہ اس کائنات کا کوئی رب ہے، نہ وہ یہ مانتا ہے کہ اس کے کچھ فرشتے ہیں اور نہ یہ مانتا ہے کہ اس نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے کوئی کتاب نازل کی ہے، یا ان کو سیدھا راستہ دکھانے اور غلط راستے سے روکنے کے لیے کوئی نبی بھیجا ہے۔ نہ وہ یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ کوئی قیامت قائم ہونے والی ہے جس میں لوگوں سے ان کے اچھے اور برے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ یہ لوگ نہ الوہیت کا اقرار کرتے ہیں، نہ نبوت ورسالت کو

مانتے ہیں اور نہ وہ اخروی جزا وسزا کا اعتراف کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی حالت وہی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اسلاف کے بارے میں بیان فرمائی ہے:

إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ. (الأنعام ٦:٢٩)

زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ اٹھائے نہ جائیں گے۔

یا جیسا کہ ان میں سے بعض لوگوں نے اپنی بات یوں بیان کی ہے کہ اور کچھ نہیں ہے بس ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے اور زمین نے نگل لیا۔

یہ ہر دور کے مادہ پرستوں کا کفر ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں اشتراکی فکر کی بنیاد اسی کفر پر ہے، جس کے قلعے ڈھ چکے ہیں۔ یہ وہ فکر تھی جس کے بنیادی دستور حکومت میں یہ بات لکھی ہوئی تھی کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے، اور زندگی مادے کا نام ہے۔

ان لوگوں کے نزدیک دین خرافات اور الوہیت ایک افسانہ ہے۔ ان کے ہاں وہ بات بہت مشہور ہے جو کسی مادیت پرست فلسفی نے کہی ہے وہ کہتا ہے: یہ بات درست نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے، بلکہ انسان [کا ذہن] ہی ہے جس نے خدا کو تخلیق کیا ہے۔

یہ صاف گمراہی ہے جسے وحی کی منطق تو درکنار ـــــ جو اس کے ثبوت پر قطعی دلائل قائم کرتی ہے ـــــ عقلی وفطری منطق اور سائنس وکائنات کی منطق بھی نہیں مانتی۔ اللہ تعالیٰ نے کیا خوب فرمایا:

وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (النساء ٤:١٣٦)

جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔

یہ کفر کی قسموں میں سب سے بدترین قسم ہے۔

● شرک کا کفر

اس کفر مطلق سے کم درجے کا کفر وہ ہے جسے کفرِ شرک کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ دورِ جاہلیت کے عربوں نے کیا تھا۔ وہ اللہ کے وجود پر ایمان لاتے تھے، اور اس پر بھی یقین کرتے تھے کہ آسمان اور زمین اور انسان اس نے پیدا کیے ہیں، ان میں رزق اور زندگی اور موت کے حوالے سے اسی کی تدبیر چلتی ہے۔ مگر اس نوع کے اقرار کے باوجود ـــــ جسے توحید ربوبیت کا نام دیا جاتا ہے ـــــ وہ اس کے ساتھ اس چیز میں شرک کرتے تھے جسے توحید الٰہیہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے اللہ کے ساتھ آسمان اور زمین کے دوسرے معبودوں کو بھی شریک کرلیا تھا۔

اسی کے بارے میں قرآن گویا ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ. (الزخرف ٤٣:٩)

اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ انھیں اسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ. (العنکبوت ٢٩:٦١)

اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو کس نے مسخر کر رکھا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ. (یونس ١٠:٣١)

ان سے پوچھو: کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جان دار کو اور جان دار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالی کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو، پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز کیوں نہیں کرتے؟

یہ لوگ اللہ پر اس لحاظ سے تو ایمان رکھتے ہیں کہ وہ ہمارا خالق، رازق، اور مدبر ہے مگر اس کے ساتھ اور معبودوں کی عبادت بھی کرتے ہیں، جو لکڑی، پتھر اور دھات سے بنے ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى. (الزمر ۳۹:۳)

ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس ۱۰:۱۸)

یہ لوگ اللہ کے سوا ان کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع، اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

یہ شرک اپنی مختلف صورتوں کے ساتھ ـــــ جن میں عرب کے بت پرستوں کا شرک بھی داخل ہے، فارس کے مجوسیوں کا شرک بھی، جو کہتے تھے کہ الٰہ دو ہیں: ایک خیر اور نور کا الٰہ اور دوسرا شر اور ظلمت کا الٰہ اور اس میں ہندوؤں اور بدھ مذہب وغیرہ کا شرک بھی شامل ہے جن کی بت پرستی اب تک بہت بڑی بڑی اقوام کے دماغ کو گھیرے ہوئے ہے اور ایشیا و افریقہ میں کروڑوں لوگ اس کے پیروکاروں میں شامل ہیں ـــــ پیروکاروں کے لحاظ سے سب سے بڑا شرک ہے۔

شرک خرافات کی آماجگاہ اور فضولیات کا مرکز ہے۔ یہ انسان کو پستی کے گہرے گڑھے

میں پھینک دیتا ہے۔ کیوں کہ جو شخص اس میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ ان چیزوں کی عبادت شروع کر دیتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مسخر کیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اس کی خدمت میں لگی رہتیں اور اس کی خادم بلکہ غلام بن کر اس کی اطاعت گزار ہوتیں اور اس کے آگے جھکتیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ. (الحج ۲۲:۳۱)

اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا، اب یا تو اسے پرندے اُچک لے جائیں گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔

● اہل کتاب کا کفر

اس کفر سے بھی کم درجے کا کفر اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کا ہے۔ ان کا کفر اس وجہ سے ہے کہ وہ محمد ﷺ کی رسالت کو نہیں مانتے، حالانکہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اختتامی رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ آپ ﷺ پر ایک دائمی کتاب نازل کی گئی جو ایک طرف تورات اور انجیل جیسی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی تھیں اور دوسری طرف ان تعلیمات کی تصحیح کر رہی ہے جو اُن میں بھی موجود تھیں مگر بعد میں تحریف کی گئی ہیں۔

اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ. (المائدة ۵:۴۸)

پھر ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور 'الکتاب' میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔ لہٰذا تم

خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمھارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

محمد ﷺ ان کی طرف جو چیز لے کر آئے وہ یہ تھی کہ الوہیت کے بارے میں ان کے افکار کی تصحیح ہو۔ ان کی کتابوں اور ان کے عقائد میں الوہیت کے ساتھ بہت سے شائبے لاحق ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے اس کی شفافیت میں فرق آ گیا تھا۔ ان کے عقائد نے اسے پاک وصاف توحید سے نکال دیا تھا، جو ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے پیش کیا تھا۔ تورات ساری اللہ واحد اور احد کے بارے میں تجسیم اور تشبیہ* کے عقائد سے بھری ہوئی ہے، حتی کہ وہ بھی انسانوں جیسی ایک مخلوق معلوم ہوتا ہے۔ وہ خوف بھی رکھتا ہے، حسد بھی کرتا ہے، اسے غیرت بھی آتی ہے، وہ انسانوں سے کشتی بھی کرتا ہے اور کبھی انسان اس پر غالب آ کر اسے پچھاڑ بھی دیتے ہیں، جیسا کہ اسرائیل کے ساتھ اس کی کشتی ہوئی۔ یہ اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں جو تورات کے پاروں اور اس کے ضمیموں میں موجود ہیں۔

اسی طرح تثلیث کا عقیدہ جو نصاریٰ کے عقائد میں شامل ہے، اور رومی بت پرستی کے اُن اثرات میں سے ہے جو مسیحی مذہب پر ہوئے ہیں۔ رومی حکمران قسطنطین جب عیسائی ہوا تو عیسائیت نے اقتدار تو حاصل کیا مگر مذہب کو کھو دیا۔ یہاں تک کہ ہمارے بعض علما نے کہا: روم عیسائی نہیں ہوا بلکہ عیسائیت رومی ہو گئی۔

اس کے علاوہ یہود و نصاریٰ اگرچہ اسلام کا پیغام اور نبی ﷺ کی نبوت جھٹلانے کی وجہ سے کافر کہلائے مگر کفر میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ چونکہ وہ ایک آسمانی کتاب کی صفت کے ساتھ موصوف ہو کر الوہیت فی الجملہ اور آسمانی پیغامات اور آخرت کی جزا وسزا کو ماننے والے ہیں، اس وجہ سے وہ دوسروں کی نسبت مسلمانوں سے قریب تر ہیں۔ اس بنا پر قرآن نے ان کے ساتھ کھانے پینے اور ان کی عورتوں سے رشتہ جائز قرار دیا ہے:

* اللہ کے لیے جسم ثابت کرنے کو تجسیم اور اس کو انسانوں کے مشابہ قرار دینے کو تشبیہ کہتے ہیں۔ (مترجم)

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ (المائدة ۵:۵)

اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمھارے لیے حلال ہیں، خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔

اور یہی سورہ (مائدہ) ہے جو نصاریٰ کا کفر بھی بیان کر رہا ہے کیوں کہ انھوں نے کہا تھا:

إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (المائدة ۵:۷۲) اللہ مسیح بن مریم ہی ہے۔

اور إِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (المائدة ۵:۷۳) اللہ تین میں کا ایک ہے۔

اس کے بعد کسی کے لیے یہ کہنے کی گنجایش نہیں ہے کہ آج کے عیسائی وہ عیسائی نہیں ہیں جو نزول قرآن کے وقت تھے، [لہٰذا موجودہ عیسائیوں کو کافر نہ سمجھا جائے۔ یہ بات اس لیے غلط ہے کہ] سب جانتے ہیں کہ عیسائیت اسی وقت واضح ہو چکی تھی اور اس کے عقائد اسی وقت طے ہو چکے تھے جب ۳۲۵ عیسوی میں مشہور زمانہ نیقی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔

صحابہ کرام کو مکی دور ہی سے معلوم تھا کہ اہل کتاب اور خاص طور پر نصاریٰ ان کے قریب ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب روم کی بازنطینی حکومت، جو عیسائی مذہب پر تھی، ایرانیوں سے شکست کھا گئی، جو کہ مجوسی تھے، تو مسلمان اس سے رنجیدہ ہو گئے تھے۔ جب کہ دوسری طرف مکہ کے مشرکین ایرانیوں کی فتح سے خوش ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر فریق کو معلوم تھا کہ ایرانیوں اور رومیوں میں سے کون کس کے قریب ہے اور کس سے دور ہے۔ اس موقع پر قرآن کی تا قیامت تلاوت کی جانے والی آیات نازل ہوئیں جن میں مسلمانوں کو خوش خبری سنائی گئی کہ روم عن قریب فارس پر غالب آئے گا۔ یہ آیات سورۂ روم کے آغاز میں اس طرح موجود ہیں:

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝

فِي بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ○
بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ (الروم ۳۰:۱-۵)

ا،ل،م۔ رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں، اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہو گا جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے۔

یہ واقعہ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات میں موازنے اور ترجیح کا ایک اہم قاعدہ ہمارے سامنے رکھتا ہے اور یہ بحیثیت مجموعی اہل کتاب کو ملحدین اور بت پرستوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے قریب تر قرار دیتا ہے جب تک ایسے مخصوص عوامل پیدا نہ ہوں جو اہل کتاب کو مسلمانوں کے ساتھ زیادہ عداوت اور حسد پر آمادہ کریں، جیسا کہ موجودہ دور میں سربوں اور یہودیوں کا معاملہ ہے۔

یہ بات یقینی ہے کہ کفار میں کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو امن سے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ ہمیں بھی امن سے رہنے کا حکم ہے۔ جبکہ ان میں کچھ عنادی اور برسرِ جنگ ہوتے ہیں تو ان سے ہمیں بھی لڑنے کا حکم ہے جیسا کہ وہ ہم سے لڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صرف کافر ہوتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ظالم بھی ہوتے ہیں اور کافر بھی، یا وہ جو کفر بھی کرتے ہیں اور اللہ کی راہ سے بھی روکتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا إِلَيْهِمْ ؕ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ○ إِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَأَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○ (الممتحنة ۶۰:۸-۹)

اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو

جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو، جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔

یہ بات بھی متعین ہے کہ ذمیوں کو شہری حقوق حاصل ہوتے ہیں، اس اعتبار سے کہ وہ دارالاسلام کے رہنے والے ہیں۔ ان کے مجموعی طور پر وہی حقوق ہیں جو ہمارے ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو ہم پر عائد ہوتی ہیں۔ اس سے وہ امور مستثنیٰ ہیں جو دین کے اختلاف کا تقاضا ہوتے ہیں۔ ان پر وہ پابندیاں عائد نہیں کی جائیں گی جو ان کی دینی شخصیت کو ختم کر دیں، اور اسی طرح مسلمانوں سے بھی اس کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

● مرتدین کا کفر

علمائے امت کے درمیان یہ بات طے ہے کہ کفر کی بدترین قسم مرتد ہونا ہے۔ اور مرتد ہونا یہ ہے کہ آدمی کو اللہ نے ہدایت عطا فرمائی ہو اور وہ اس کے بعد دوبارہ کفر کی طرف لوٹ جائے۔ ایمان لانے کے بعد کافر ہونا اس سے زیادہ سخت گناہ ہے کہ آدمی ابتداءً ہی کافر ہو۔ یہ وہ حرکت ہے کہ دشمنانِ اسلام اب بھی اس سے باز نہیں آئے۔ وہ ہر ممکن ذریعہ استعمال کر کے مسلمانوں کو کافر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوْا. (البقرة ۲:۲۱۷)

وہ تو تم سے لڑتے ہی جائیں گے حتی کہ اگر ان کا بس چلے تو تمھارے دین سے تم کو پھیر لے جائیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی سزا بھی بیان فرمائی ہے جو ان گمراہ کرنے والوں کی بات پر لبیک کہتے ہیں اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے اپنے دین کو خیرباد کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ. (البقرۃ ۲:۲۱۷)

اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا، اس کے اعمال دنیا و آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔

اس حالت میں ارتداد اسلام اور امتِ مسلمہ کے ساتھ ایک عظیم خیانت ہے۔ کیوں کہ اس میں ان کے ساتھ تعلق کی تبدیلی یا ان سے پہلو تہی یا ایک امت سے دوسری امت منتقل ہونے کی بات ہوتی ہے۔ اس کا معاملہ ایسے ہوتا ہے جیسے اس نے اپنا تعلق بدل کر اپنے ملک کے ساتھ خیانت کی ہو اور اپنی قوم کی جگہ کسی اور قوم میں جا داخل ہوا ہو۔ ایسا آدمی اپنے ملک وقوم کی جگہ کسی اور ملک وقوم کو اپنی محبت اور تعاون کا مستحق سمجھتا ہے۔

چنانچہ ارتداد محض عقلی طور پر نقطۂ نظر کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ ایک جماعت سے اپنا تعلق توڑ کر ایک ایسی جماعت کے ساتھ جڑنا ہوتا ہے جو اس کے خلاف بلکہ اس کی دشمن ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ارتداد کو ختم کرنے میں بڑی شدت سے کام لیا ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ مرتد اپنے ارتداد کا اعلان کرے اور دوسروں کو بھی مرتد ہونے کی دعوت دے۔ کیوں کہ یہ لوگ معاشرے کے لیے ایک عظیم خطرہ بن جاتے ہیں اور اس کی فکری بنیادوں پر تیشہ چلاتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض علمائے سلف اور تابعین نے ارتداد کی دعوت دینے والوں کو ان لوگوں میں شامل کیا ہے جو:

يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا. (المائدۃ ۵:۳۳)

اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ بات واضح کی ہے کہ کفر کی اشاعت کے لیے زمین میں فساد کی سعی کرنا اور ملت اسلام کے خلاف شبہات پھیلانا اس سے زیادہ سخت جرم ہے کہ آدمی لوگوں کا مال لینے اور ان کا خون بہانے کے لیے سعی کرے۔

اور یہ بالکل بجا ہے کیوں کہ امت کے مفاد کو نقصان پہنچانا اور اس کے عقائد کو منہدم کرنا اس کے اموال کے ضایع کرنے، اس کی عمارتیں ڈھانے اور افراد کے قتل سے زیادہ خطرناک ہے۔

اس وجہ سے قرآن اہل ایمان پر بہت زیادہ تاکید کرتا ہے کہ وہ ارتداد کو ختم کریں۔ اور یہ تاکید اس نسل کو کی گئی ہے جو جہادی نسل تھی، جو نہ باطل پر خاموش ہوتی تھی اور نہ حق کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (المائدۃ ۵:۵۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگوں کو پیدا کر دے گا جو اللہ کے محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے، جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔

قرآن پاک نے منافقین کو وعید سنائی ہے کہ اگر انھوں نے اپنے کفر کا اعلان کیا تو:

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَنْ يُصِيبَكُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِنْ عِنْدِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُمْ مُتَرَبِّصُونَ. (التوبۃ ۹:۵۲)

ان سے کہو: تم ہمارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے۔ اور ہم تمھارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہیں

وہ یہ ہے کہ اللہ خود تم کو سزا دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں دلواتا ہے؟ اچھا تو اب تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمھارے ساتھ منتظر ہیں۔

ان کو مسلمانوں کے ہاتھ عذاب اس وقت پہنچے گا جب وہ اس کفر کا اظہار کریں گے جو انھوں نے اپنے سینوں میں چھپایا ہے۔ مسلمان ان کے دلوں کو پھاڑ کر نہیں دیکھتے بلکہ ان کے ساتھ اس صورتِ حال کے مطابق معاملہ کرتے ہیں جو ان کی زبان اور اعضا سے ظاہر ہو چکا ہے۔

قتل مرتد کے بارے میں بہت سی احادیث صحیحہ وارد ہوئی ہیں اور متعدد صحابہ سے مروی ہیں۔ یہی جمہور کی رائے ہے۔ حضرت عمرؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ مرتد کو جیل میں ڈالنے اور اسے زندہ رہنے دینے کو بھی جائز کہتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی موت مرجائے یا اللہ کے سامنے لوٹ آئے۔ اس رائے کو امام نخعیؒ اور امام ثوریؒ نے اختیار کیا ہے۔

اگر ارتداد ایسا ہو کہ مرتد خاموش رہے اور اس کی طرف دوسروں کو دعوت نہ دے تو اس کے حوالے سے میں اسی رائے کو ترجیح دیتا ہوں۔ رہا وہ ارتداد جس میں مرتد اپنے ارتداد کا اعلان ہی نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی اس کی طرف بلاتا ہے اس کے بارے میں میرا خیال نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ اور امام نخعیؒ یا امام ثوریؒ میں سے کوئی بھی اس بات پر راضی ہو کہ ایسے افکار کی کھلی چھٹی ہو جو اسلامی عقائد کے لیے تباہ کن ہیں، ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کی جائے اور ان کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھائی جائے، باوجودیکہ ان کی پشت پر کوئی قوت بھی موجود ہو جو انھیں قوت پہنچا رہی ہو۔

چنانچہ ضروری ہے کہ ہم ارتداد خفیف اور ارتداد غلیظ میں فرق کریں اور 'خاموشی سے' مرتد ہونے والے اور اس شخص کے درمیان فرق ملحوظ رکھیں جو اپنے ارتداد کی طرف 'دعوت دینے والا' ہو۔ ایسا شخص تو کھلم کھلا ان لوگوں میں سے ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کے مرتکب ہوتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ علما نے بدعت میں مخفف اور مغلظ کے درمیان

فرق کیا ہے، اور اس مبتدع کے جو اپنی بدعت کی طرف دعوت دے رہا ہو اور جو خاموشی سے اپنی بدعت پر عمل کرتا ہو، ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے۔[1]

● کفرِ نفاق

کفر کی غلیظ ترین اور اسلامی زندگی کے لیے سب سے خطرناک قسم منافقت ہے۔ اس کے پیروکار مسلمانوں کے درمیان رہتے ہیں کیوں کہ وہ انھی میں سے شمار ہوتے ہیں، ان کے ساتھ نمازوں میں شریک ہوتے ہیں، انھی کی طرح زکوٰۃ دیتے ہیں، انھی کی طرح دوسری عبادات ادا کرتے ہیں مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ باطنی طور پر ان کے دشمن ہوتے ہیں۔ وہ ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، چالیں چلتے ہیں اور ان کے دشمنوں کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ان کے حالات بیان کرنے کو بڑی اہمیت دی، ان کے پردوں کو چاک کیا اور ان کے اوصاف اور اخلاق کا صاف صاف بیان کیا۔ سورۂ توبہ کا ایک نام 'الفاضحہ' [شرمانے والی] بھی ہے کیوں کہ وہ ان کی قسموں کا احاطہ کر رہی ہے اور ان کے اوصاف کو واضح کر رہی ہے۔ ان کے بارے میں ایک مستقل سورت بھی نازل ہوئی جو انھی کی مناسبت سے المنافقون کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی قرآن پاک میں بہت سی آیات ہیں۔

اسی طرح سورۂ بقرہ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے متقین کا ذکر صرف تین یا چار آیات میں فرمایا اور کفار کے بارے میں دو آیتیں نازل فرمائی گئیں۔ رہے منافقین تو ان کے ذکر نے تیرہ آیات لے لیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جہنم کا سب سے نچلا درجہ مقرر کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝ إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَأَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللهِ وَأَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ

ا۔ مرتد کے بارے میں ہمارے تفصیلی خیالات اور اسلامی معاشرے میں ارتداد کا قلع قمع کرنے کے بارے میں جاننے کے لیے دیکھیے ہماری کتاب: ملامحُ المجتمعِ المسلمِ الذي نُنشِدُہ، فصل: العقيدة والإيمان، طبع: مكتبة وهبة، قاہرہ۔

الْمُؤْمِنِيْنَ. (النساء ۴:۱۴۵-۱۴۶)

یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کردیں، ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں۔

ہمارے دور میں بہت سے منافقین پائے جاتے ہیں جو نہ وحی الٰہی کا اقرار کرتے ہیں اور نہ شریعت کو فکر، کردار اور تعلقات کے لیے اعلیٰ ترین ماخذ کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ دین، اس کے داعیوں اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مگر ان کی صورتِ حال یہ ہے کہ وہ منافق ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان پر اسلام کا نام بھی موجود رہے اور انھیں مسلمانوں کے زمرے میں بھی شمار کیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ دورِ نبوت کے منافقین سے بدتر ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی حالت یہ ہوتی تھی کہ وہ نماز کے لیے سستی کے ساتھ اٹھتے تھے اور یہ اس کے لیے اٹھتے ہی نہیں ہیں، نہ چستی کے ساتھ اور نہ سستی کے ساتھ۔ وہ اللہ کو یاد کرتے تھے مگر تھوڑا، اور یہ اللہ کو یاد ہی نہیں کرتے نہ تھوڑا اور نہ زیادہ۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں بھی شریک ہوتے تھے اور دشمن کے خلاف بھی لڑتے تھے اور یہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف لڑتے ہیں۔ وہ بظاہر مسلمانوں کے ساتھ مسجدوں میں ہوتے تھے اور یہ کافروں کے ساتھ ان کے لہو لعب میں مصروف ہوتے ہیں۔

اگر یہ لوگ اپنے کفر کا صراحت کے ساتھ اعلان کریں گے تو ان کا موقف متعین ہو جائے گا اور ہم ان کی طرف سے مطمئن ہو جائیں گے۔ مگر یہ ایسے بن گئے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ. (البقرة ۲:۹)

وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں، مگر دراصل وہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔

کفر و شرک اور منافقت کے درجات

اس مقام پر بہت ضروری ہے کہ ہم کفر و شرک اور منافقت میں ان مراتب کا لحاظ کریں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، کوئی کفر اکبر ہوتا ہے اور کوئی اصغر۔ جب ان میں سے کسی کا مطلق ذکر ہوتا تو مراد اکبر ہی ہوتی ہے۔

لیکن شریعت میں بعض اوقات یہ کلمات اطلاق کے ساتھ ذکر ہوتے ہیں اور ان سے مراد معاصی ہوتے ہیں، خاص طور پر کبائر۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس بات کا لحاظ رکھا جائے اور اس کے مواقع کو پہچان لیا جائے تاکہ ہمارے لیے معاملہ مشتبہ نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم گناہ گاروں پر کفر اکبر کا الزام لگا دیں جو ملت سے خارج کرنے والا ہے، حالانکہ وہ مسلمان ہوں گے، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان کو اپنا دشمن قرار دیں اور ان کے خلاف اعلان جنگ کردیں حالانکہ ان کی طرف سے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کے باوجود ہمارے اور ان کے درمیان ابھی دین کا رشتہ برقرار ہو۔ اور معاملہ ایسا ہو جیسا کہ عربی ضرب المثل ہے کہ أَنْفُكَ مِنْكَ وَإِنْ كَانَ أَجْدَعَ! ناک اگرچہ کٹی ہے مگر ہے تیری ہی۔

● کفر اصغر اور کفر اکبر

یہ بات معلوم ہے کہ کفر اکبر یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے وجود سے یا اس کے رسولوں سے انکار کرے۔ جیسا کہ ہم نے اشتراکیوں کے کفر کے سلسلے میں ذکر کیا ہے۔ یا یہ کہ آدمی نبی ﷺ کی نبوت سے انکار کرے جیسا کہ یہود و نصاریٰ کا کفر ہے۔ یہ لوگ دنیوی احکام میں بھی

رسالت محمدی کے کافر تصور کیے جاتے ہیں۔ رہی ان کی اخروی سزا تو وہ اس بات پر منحصر ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کس قدر دشمنی رکھتے ہیں، حالانکہ ان کے سامنے حق واضح ہو چکا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا. (النساء ۴:۱۱۵)

جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآنحالیکہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔

وہ لوگ جن کے سامنے ہدایت واضح نہیں ہوئی، مثلاً ان کو دعوت پہنچی ہی نہیں یا انھیں دعوت پہنچی تو ہے مگر درست طریقے سے نہیں پہنچی، کہ اس کی وجہ سے وہ تحقیق اور غوروفکر پر مجبور ہو۔ ایسا شخص معذور ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۱۵)

اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لیے) ایک پیغام بر نہ بھیج دیں۔

میرا خیال ہے کہ مسلمان بڑی حد تک اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ زمین پر بسنے والی قومیں گمراہ کیوں رہیں اور وہ اسلام کے حقائق سے بے خبر کیوں رہیں۔ وہ اسلام کے دشمنوں کے اباطیل کے ساتھ کیوں چمٹی رہیں؟ ان پر لازم ہے کہ اپنے پیغام کو دنیا تک پہنچانے میں اپنی پوری قوت صرف کریں اور سچے دل سے اس راستے میں کام کریں۔ انھیں چاہیے کہ ہر قوم کو اپنی دعوت انھی کی زبان میں پہنچائیں تاکہ اسے ان کے سامنے حقیقی معنوں میں بیان کر سکیں اور ثابت کر سکیں کہ پیغام محمدی حقیقی طور پر ایک عالمی پیغام ہے۔

رہا کفر اصغر تو وہ تمام معاصی ہیں خواہ دین میں ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو۔

مثلاً تارک صلوٰۃ جو سستی کے وجہ سے نماز کو ترک کرتا ہے، نہ کہ انکار یا استہزا کی وجہ سے۔ ایسا آدمی جمہور علمائے امت کے نزدیک گناہ گار یا فاسق ہے کافر نہیں ہے۔ بعض احادیث میں اس پر جو لفظ کفر کا اطلاق کیا گیا ہے تو اس سے مراد کفر کی چھوٹی اقسام ہیں نہ کہ یہی کفر اکبر۔

مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ

اَلْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ، فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ۔[2] ہمارے اور ان کے درمیان نماز کا عہد ہے، جس نے نماز چھوڑی وہ کافر ہو گیا۔

بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ۔[3] آدمی اور اس کے کفر کے درمیان صرف ترک نماز کا فرق ہے۔

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ اپنی ظاہریت کے باوجود تارک نماز کو کافر نہیں کہتے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے کفر کا جو قول مروی ہے اس کا حکم کسی پر اس وقت لگایا جائے گا جب حکمران یا قاضی نے اسے نماز کی دعوت دی ہو اور اس سے توبہ کا مطالبہ کیا ہو اور اس نے توبہ کرنے سے انکار کیا ہو۔

امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی بات کو راجح کہا ہے کہ تارک نماز کافر نہیں ہے، جب تک کہ وہ اس سے انکار نہ کرے یا اس کا استخفاف نہ کرے۔ اگرچہ اس کے نزدیک اسے ترک نماز پر قتل کیا جائے گا مگر اس وجہ سے نہیں کہ وہ کافر ہو گیا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ حد کا مستحق ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ اسے قتل کیا جائے۔ یہی ایک روایت امام احمد کی بھی ہے۔ ابوعبداللہ بن بطہ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور انھوں نے اس سے انکار کیا ہے کہ امام احمد تارک نماز کو کافر کہتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ اصل مذہب یہ ہے اور اس مسئلے میں ہمارے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ اکثر فقہا کا مذہب ہے، جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، مالک رحمۃ اللہ علیہ،

۲- اسے احمد، ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت بریدہؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۴۱۴۳۔

۳- اسے مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۲۸۴۸۔

شافعی رحمہ اللہ وغیرہ۔ اس نے ان متفق علیہ احادیث سے استدلال کیا ہے، جن میں یہ ذکر آیا ہے کہ اس شخص پر آگ حرام ہے، جس نے صدق دل سے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو، اور جس نے یہ کہا وہ آگ سے نکلے گا، اور جس کے دل میں گندم کے دانے کے برابر ایمان ہوگا وہ بھی جہنّم سے نکلے گا۔

انھوں نے آثار صحابہ اور اجماع سے بھی استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ہمیں معلوم نہیں کہ کسی دور میں بھی ایک تارکِ نماز کی وفات پر اسے غسل نہ دیا گیا ہو اور اس کی نماز جنازہ نہ پڑھائی گئی ہو اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا گیا ہو اور اس کے وارثوں کو اس کی میراث سے محروم کیا گیا ہو یا خود تارکِ نماز کو اس کے وارثوں کی میراث سے محروم کیا گیا ہو یا زوجین میں سے کسی کو اس وجہ سے دوسرے سے الگ کیا گیا ہو کہ وہ تارک نماز ہے، حالانکہ تارکین نماز ہر دور میں بہت سے ہوتے ہیں۔ اگر وہ کافر ہوتا تو اس کے بارے میں یہ سارے احکام ثابت ہوتے۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ ہمیں مسلمانوں کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف معلوم نہیں ہے کہ تارکِ نماز پر اس کی قضا واجب ہے۔ اگر وہ مرتد ہوتا تو اس پر نہ نماز کی قضا لازم ہوتی اور نہ روزوں کی۔ رہی مذکورہ احادیث یعنی جن کا ظاہر اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ تارکِ نماز کافر ہو جاتا ہے تو وہ زجر و توبیخ کے لیے فرمائی گئی ہیں اور ان کا مقصد اسے کفار کے مشابہ قرار دینا ہے۔ یہ اپنی حقیقی معنی پر محمول نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث ہے کہ

سِبَابُ الْمُؤْمِنِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ۔[4] یعنی مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس کے ساتھ قتال کرنا کفر ہے۔

مَنْ قَالَ لِأَخِيهِ يَا كَافِرُ، فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا۔[5] جس نے اپنے مسلمان بھائی سے کہا: اے کافر، تو ان میں سے ایک تو اس میں مبتلا ہو گیا۔

اس طرح کی احادیث وعید میں تشدید پیدا کرنے کے لیے آتی ہیں۔ ہمارے نزدیک

۴۔ متفق علیہ، بروایت ابن مسعودؓ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۴۳۔

۵۔ متفق علیہ، بروایت ابن مسعودؓ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۴۳۔

یہی صحیح ترین قول ہے، واللہ اعلم۔[6]

● امام ابن قیم رحمہ اللہ کا قول

امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنی کتاب مدارج السالکین میں کہتے ہیں:

کفر کی دو قسمیں ہیں: کفر اکبر اور کفر اصغر۔ کفر اکبر خلود فی النار کا موجب ہے اور کفر اصغر خلود فی النار کا نہیں بلکہ استحقاق وعید کا موجب ہے۔ جیسا کہ نبی ﷺ کا قول ہے:

اِثْنَتَانِ فِي أُمَّتِي، هُمَا بِهِمْ كُفْرٌ: الطَّعْنُ فِي النَّسَبِ، وَالنِّيَاحَةُ۔[7] میری اُمت میں دو افعال ہیں جو میری امت کے لیے کفر ہیں: ایک، نسب میں الزام لگانا اور دوسری نیاحت [یعنی میت پر جاہلیّت کے انداز میں رونا]۔

اسی طرح ارشاد ہے:

مَنْ أَتَى امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ۔[8] جس نے کسی عورت سے دُبر میں تعلق قائم کیا اس نے محمد ﷺ پر نازل ہونے والی تعلیمات سے کفر کیا۔

ایک اور حدیث میں ہے:

مَنْ أَتٰى كَاهِنًا أَوْ عَرَّافًا، فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ، فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ۔[9] جو شخص کسی کاہن یا نجومی کے پاس گیا اور اس کی بات پر یقین کیا وہ اس تعلیم سے کافر ہو گیا جو نبی ﷺ پر نازل ہوئی ہے۔

اسی طرح فرمایا:

لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ۔[10] میرے بعد کافر نہ بنو کہ

۶۔ دیکھیے: المغنی ۳/۳۵۱-۳۵۹۔

۷۔ اسے احمد اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۱۳۸۔

۸۔ اسے ابوداؤد ۳۹۰۴، ترمذی ۱۳۵، اور ابن ماجہ ۹۳۹ نے روایت کیا ہے۔

۹۔ اسے احمد اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

۱۰۔ متفق علیہ، بروایت حضرت جریر و ابن عمرؓ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۴۴، ۴۵۔

ایک دوسرے کی گردنیں مارتے رہو۔

یہی تاویل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور اکثر صحابہ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی فرمائی ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ. (المائدۃ ۵:۴۴)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کفر نہیں ہے جو ملت سے خارج کرنے والا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب وہ یہ کام کرے گا تو وہ اس کے لیے کفر کے مترادف ہوگا۔ یہ اس شخص جیسا نہیں ہوگا جس نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے۔ یہی قول طاؤس کا بھی ہے۔

حضرت عطا کہتے ہیں: یہ کُفْرٌ دُوْنَ کُفْرٍ ، ظُلْمٌ دُوْنَ ظُلْمٍ اور فِسْقٌ دُوْنَ فِسْقٍ والی بات ہے۔ [یعنی ان میں سے ہر ایک کے مختلف درجات ہیں جن میں سے ایک ادنیٰ درجہ یہ ہے]۔

بعض نے اس آیت کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب وہ ماانزل اللہ پر فیصلہ نہ کرنے کے ساتھ اس سے انکار بھی کرے۔ یہ عکرمہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے مگر یہ ایک مرجوح تاویل ہے۔ اس لیے کہ اگر ایک آدمی اس سے ویسے انکار کرے وہ بھی کافر ہے، خواہ اس پر فیصلہ کرے یا نہ کرے۔

بعض نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ اس صورت پر محمول ہے جب وہ سارے ماانزل اللہ پر فیصلہ کرنا چھوڑ دے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں توحید اور اسلام کے بارے میں فیصلہ بھی مراد ہے۔ یہ عبدالعزیز الکنانی رحمہ اللہ کی تاویل ہے، مگر یہ تاویل بھی بعید ہے۔ کیوں کہ وعید ماانزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے سے انکار پر آئی ہے اور وہ ویسے ہی جمیع اور بعض سب کی تعطیل کو شامل ہے۔

بعض نے اسے نص کے خلاف فیصلہ کرنے پر محمول کیا ہے، جبکہ وہ قصداً عمداً نص کی مخالفت کرے، نہ کہ جہالت یا اجتہادی غلطی کی وجہ سے۔ یہ تاویل امام بغوی نے عموماً علما سے نقل کی ہے۔

کسی نے اسے اہل کتاب پر محمول کیا ہے۔ یہ قتادہ اور ضحاک وغیرہ کا قول ہے۔ یہ تو زیادہ بعید ہے۔ کیوں کہ یہ نص کے ظاہری الفاظ کے خلاف ہے۔ چنانچہ اس کی طرف تو ذہاب نہیں کیا جاسکتا۔[۱۱]

بعض نے اس کو کفر قرار دیا ہے جو ملت سے نکالنے والا ہے۔

مگر درست یہی ہے کہ ماانزل اللہ کے سوا کسی چیز پر فیصلہ کرنے میں دو کفر پائے جاتے ہیں: ایک اصغر اور ایک اکبر۔ ان کا تعین فیصلہ کرنے والے کی حالت دیکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس نے یہ عقیدہ رکھا کہ اس پر پیش آمدہ مسئلے میں ماانزل اللہ پر فیصلہ کرنا واجب ہے مگر نافرمانی کرتے ہوئے اس سے منہ موڑتا ہے اور ساتھ ہی اعتراف کرتا ہے کہ اپنی اس حرکت کی وجہ سے وہ سزا کا مستحق ہے تو یہ کفر اصغر ہے۔ اور اگر اس کا عقیدہ یہ ہو کہ اس پر ماانزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہی نہیں ہے، اسے یقین ہو کہ اللہ کا فیصلہ یہی ہے مگر وہ سمجھے کہ اس کے باوجود میں اس کا پابند نہیں ہوں۔ تو یہ کفر اکبر ہے۔ لیکن اگر وہ بے خبر ہے یا اجتہادی غلطی سے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو یہ خطا کار ہے اور اس کا حکم خطا کاروں کا حکم ہے۔

الغرض، گناہ جتنے بھی ہیں وہ کفر اصغر کی انواع میں سے ہیں۔ یہ شکر کے خلاف ہیں جو بھلائی پر عمل کا دوسرا نام ہے۔ پس جو آدمی سعی کرتا ہے وہ یا شکر ہوگی یا کفر یا پھر ایک تیسری چیز ہوگی جو نہ اس میں ہے اور نہ اُس میں۔ واللہ اعلم۔[۱۲]

● شرک اکبر اور شرک اصغر

جیسا کہ کفر میں اکبر اور اصغر ہوتا ہے اسی طرح شرک میں بھی اکبر اور اصغر ہوتا ہے۔ شرک اکبر تو معروف ہے جیسا کہ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا جائے۔ اس سے اسی طرح محبت کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہیے۔ یہ وہ شرک ہے جس میں

۱۱- اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب: فتاویٰ معاصرۃ الجزء الثانی میں ہمارا فتویٰ: الحکم بغیر ماأنزل اللہ۔

۱۲- دیکھیے: مدارج السالکین ۱/۳۳۵-۳۳۷۔

مشرکین کے معبودوں کو اللہ کے ساتھ شریک کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے جب وہ آگ میں جائیں گے تو اپنے معبودوں سے کہیں گے:

تَاللّٰهِ إِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ o إِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (الشعراء۲۶:۹۷-۹۸)

خدا کی قسم! ہم تو صریح گم راہی میں مبتلا تھے جب کہ تم کو رب العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے۔

یہ وہ شرک ہے جس کی مغفرت توبہ کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ. (النساء ۴:۴۸)

اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔

یہ اس وجہ سے کہ جب جاہلیت اور شرک اور وہ چیز جسے قرآن نے معیوب قرار دیا ہے، معروف نہ ہو تو لوگوں کا اس میں پڑنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اس کا اقرار بھی کریں گے، اس کی طرف لوگوں کو دعوت بھی دیں گے اور اس کی تصویب وتحسین بھی کریں گے۔ حالانکہ اس کے بارے میں معلوم نہیں ہوگا کہ یہی وہ شرک ہے جس میں اہل جاہلیت مبتلا تھے۔ یہ اس کی طرح یا اس سے برا ہے، یا برائی میں اس سے کم ہے۔ اس طرح لوگوں کے دل سے اسلام کی ایک ایک کڑی گرتی جائے گی۔ معروف منکر بن جائے گی اور منکر معروف۔ بدعت سنت بن جائے گی اور سنت بدعت۔ ایک آدمی کو محض ایمان لانے اور توحید خالص اختیار کرنے کی وجہ سے کافر قرار دیا جائے گا اور دوسرے کو خالص اتباع رسول اور خواہشات وشہوات کو ترک کرنے کی وجہ سے بدعتی قرار دیا جائے گا۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت اور دل زندہ دیا ہوگا وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ واللہ المستعان

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اور رہا شرک اصغر تو اس کی مثال معمولی ریا، مخلوق کے لیے تصنع اور غیر اللہ کی قسم ہے،

جیسا کہ نبی ﷺ سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ أَشْرَكَ.[۱۳] جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی وہ مشرک ہوگیا۔

اور کسی آدمی کا کسی سے یہ کہنا کہ مَاشَاءَ اللهُ وَشِئْتَ یعنی جو اللہ چاہے اور تو چاہے۔ یا یہ کہ هٰذَا بِاللهِ وَبِكَ. یہ کام آپ کر سکتے ہیں یا پھر اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ یا یہ کہ أَنَا بِاللهِ وَبِكَ. میں اللہ کی اور تیری پناہ میں آتا ہوں۔ یا یہ کہ مَالِيْ إِلَّا اللهُ وَأَنْتَ. میرا اللہ اور تیرے سوا اور کون ہے۔ اور یہ کہ أَنَا مُتَوَكِّلٌ عَلَى اللهِ وَعَلَيْكَ. میں اللہ پر اور آپ پر توکل کرتا ہوں۔ اور یہ کہ لَوْلَا أَنْتَ لَمْ يَكُنْ كَذَا كَذَا. اگر آپ نہ ہوتے تو میرا فلاں فلاں کام نہ ہوتا۔

یہ کبھی کبھی شرک اکبر ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ کہنے والے کی حالت اور اس کے ارادے کے لحاظ سے لگایا جائے گا۔ نبی ﷺ سے یہ بات صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ایک آدمی سے ـــــ جس نے آپ ﷺ سے کہا تھا: مَاشَاءَ اللهُ وَشِئْتَ [جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں] ـــــ فرمایا تھا: أَجَعَلْتَنِيْ لِلّٰهِ نِدًّا؟ قُلْ مَاشَاءَ اللهُ وَحْدَهٗ. کیا تم نے مجھے اللہ کے ساتھ شریک بنایا؟ یہ کہو کہ جو اللہ وحدہ چاہے۔

یہ لفظ دوسرے الفاظ سے ہلکا تھا مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے اس شخص کو یہ کہا تھا۔

شرک کی قسموں میں ایک قسم یہ ہے کہ مرید اپنے شیخ کے سامنے سجدہ کرے۔ یہ ساجد اور مسجود دونوں کی طرف سے شرک ہے۔

اس کی ایک قسم شیخ کی خاطر سر منڈوانا ہے۔ کیوں کہ یہ غیر اللہ کے لیے عبادت ہے اور سر منڈوانے کی عبادت حج یا عمرے کے موقع پر اللہ کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔

اس کی ایک قسم شیخ کی طرف توبہ کرنا ہے۔ یہ بہت بڑا شرک ہے۔ توبہ صرف اور صرف اللہ کے لیے ہے۔ جیسے نماز، روزہ، حج اور قربانی وغیرہ۔ یہ خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

۱۳- اسے احمد، ترمذی اور حاکم نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۸۴۶۲۔

مسند میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک قیدی لایا گیا۔ اس نے کہا: اے اللہ میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں، محمد کے سامنے نہیں کرتا۔

نبی ﷺ نے فرمایا: عَرَفَ الْحَقَّ لِأَهْلِهِ. اس نے حق دار کا حق پہچان لیا ہے۔

چنانچہ توبہ ایک عبادت ہے اور وہ اللہ کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ جیسے سجدہ اور روزے وغیرہ۔

شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ غیر اللہ کی نذر مانی جائے۔ یہ بھی شرک ہے اور یہ غیر اللہ کی قسم سے زیادہ بری چیز ہے۔ جب یہ بات ثابت ہوئی کہ مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ أَشْرَكَ [جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی وہ مشرک ہوگیا] تو اس شخص کی کیا حالت ہوگی جس نے غیر اللہ کی نذر مانی ہو۔ حالانکہ سنن میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نبی ﷺ کی حدیث ہے کہ اَلنَّذْرُ حِلْفَةٌ. نذر ایک قسم ہے۔

اس کی ایک قسم غیر اللہ کا خوف کھانا غیر اللہ پر توکل کرنا، غیر اللہ کے لیے انابت اور خضوع اختیار کرنا اور اس کے سامنے عاجزی دکھانا ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی کے ہاں رزق تلاش کرنا اور اس کے علاوہ کسی کی عطا پر اس کی حمد بیان کرنا اور اس حمد کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنے سے مستغنی سمجھنا اور جو کچھ اس کو نہیں دیا گیا اور اس کے لیے مقدر نہیں کیا گیا اس کے بارے میں اللہ سے ناراض ہونا اور اس پر برا بھلا کہنا۔ اس کی نعمتوں کو کسی اور کی طرف منسوب کر دینا۔ اور یہ عقیدہ رکھنا کہ کائنات میں کوئی چیز ایسی بھی ہو سکتی ہے کہ جس کو اللہ نے نہ چاہا ہو۔[14]

● نفاق اکبر اور نفاق اصغر

جس طرح شرک اور کفر میں اکبر اور اصغر موجود ہے اسی طرح نفاق بھی اکبر اور اصغر ہوتا ہے۔

نفاق اکبر عقیدے کا نفاق ہے اور یہ جہنم کے نچلے طبقے میں ہمیشہ رہنے کا موجب ہے۔

۱۴- دیکھیے: مدارج السالکین ۱/۳۴۴-۳۴۶۔

یہ وہ ہے جس میں آدمی کے دل میں کفر ہوتا ہے اور بظاہر اسلام کا اعلان۔ یہ وہی نفاق ہے جو نبی ﷺ کے دور میں موجود تھا۔ قرآن کریم ایسی آیات سے بھرا پڑا ہے جن میں ان کے راز کے پردوں کو چاک کیا گیا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مسلمان بندوں کے لیے ان کے معاملات نمایاں کر کے رکھ دیے ہیں تا کہ وہ ان سے محتاط رہیں اور مسلمان اپنی استطاعت کی حد تک ان کے اخلاق سے دور رہیں۔

رہا نفاق اصغر تو وہ عمل اور کردار کا نفاق ہے۔ وہ یہ کہ آدمی دل میں درست عقیدہ رکھے مگر اعمال، اخلاق اور کردار میں منافقین کے طریقے پر چلے۔ اس سے صحیح احادیث میں محتاط رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ جیسے:

أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ.[15] چار خصلتیں ہیں جو اگر کسی میں پائی گئیں تو وہ خالص منافق ہوگا اور اگر کسی میں ان میں سے ایک پائی گئی تو اس میں منافقت کی ایک خصلت موجود ہوگی، جب تک کہ اسے چھوڑ نہ دے: بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، معاہدہ کرے تو دھوکہ دے اور لڑے تو گالیاں بکے۔

آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ.[16] منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور اگر اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ وَإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ[17] اگر چہ وہ

۱۵- متفق علیہ بروایت عبداللہ بن عمروؓ۔ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۳۷۔

۱۶- متفق علیہ بروایت ابو ہریرہؓ۔ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۳۷۔

۱۷- مسلم بروایت ابو ہریرہؓ، کتاب الایمان ۱۰۹، ۱۱۰۔

نماز پڑھے، روزے رکھے اور یہ گمان کرے کہ وہ مسلمان ہے۔

یہ اور اس طرح کی دوسری احادیث ہی تھیں جن کی وجہ سے صحابہ کو اپنے بارے میں یہ خوف رہتا تھا کہ کہیں وہ منافق تو نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ان احادیث سے کوئی مسلمان خوف زدہ ہوئے بغیر نہ رہا اور کوئی منافق اس سے خوف زدہ نہیں ہوا۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے — جنھیں رسول اللہ ﷺ نے منافقین کے بارے میں بتا دیا تھا — کہا کرتے تھے: أَتَجِدُنِي مِنْهُمْ؟! کیا میں ان لوگوں میں شامل ہوں؟!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ وہ لوگوں کو منافقِ علیم سے محتاط رہنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ ایک منافق 'علیم' کیسے ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا: وہ زبان کا علیم اور دل کا کورا ہوتا ہے۔

کسی نے کہا: اَللّٰھُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ خُشُوعِ النِّفَاقِ. اے اللہ! میں نفاق کے خشوع سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ سائل نے پوچھا: نفاق کا خشوع کیا ہوتا ہے؟ اس نے کہا: وہ یہ ہے کہ جسم پر خشوع نظر آئے مگر دل میں خشوع نہ ہو۔[18]

۱۸-مدارج السالکین ۱/۳۵۸۔

گناہِ کبیرہ کی قسمیں

کفر اور اس کی تمام قسموں کے بعد معاصی کی باری آتی ہے۔ اس کے دو مرتبے ہیں: ایک کبائر اور دوسرے صغائر۔ کبائر وہ بڑے گناہ ہوتے ہیں جو زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ جن کے فاعل پر اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے، وہ اس کی لعنت اور جہنم کی آگ کا مستحق بنتا ہے۔ اور بعض اوقات ان کی وجہ سے دنیا میں حد بھی لازم ہوتی ہے۔

اس کی تعریف کرنے میں علما کے درمیان بہت اختلاف ہوا ہے۔ سب سے زیادہ آرا جس تعریف کے بارے میں ہیں وہ یہ ہے کہ وہ گناہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کوئی حد مقرر کی ہو یا اس کے لیے آخرت میں کسی وعید شدید کا اعلان کیا ہو، جیسے آگ میں جانا، جنت سے محروم ہو جانا، یا اللہ کے غضب یا اس کے عذاب کا مستحق ہونا۔ یہ ساری باتیں کسی گناہ کے بڑے ہونے کی دلالت کرتی ہیں۔

● عمل سے متعلق کبائر

بعض نصوص نے ان میں سے چند کبائر کا ذکر کیا ہے، جس کی اس نے متعین تعریف بیان کی ہے۔ جیسے اَلسَّبْعُ الْمُوْبِقَاتُ [یعنی سات مہلکات] اور ان میں شرک کے بعد اللہ کی حرام کردہ جان کو ناحق قتل کرنا، جادو کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، پاکیزہ اور بے خبر مومنات پر الزام لگانا، یَوْمُ الزَّحْفِ [میدان جنگ] میں دشمن سے منہ موڑنا۔ اور اسی طرح کا معاملہ ان گناہوں کا بھی ہے جو صحیح احادیث میں وارد ہوئے ہیں، جیسے والدین کی نافرمانی، قطع رحمی،

جھوٹی گواہی، یَمِینُ غُمُوسٍ [یعنی جھوٹی قسم] شراب نوشی، زنا، لوط علیہ السلام کی قوم کا عمل، خود کشی، راہزنی، غصب، مالِ غنیمت میں خیانت، رشوت، چغلی کھانا۔

بنیادی فرائض کا ترک بھی ان میں شامل ہے۔ جیسے نماز، زکوٰۃ، روزۂ رمضان، اور استطاعت کی صورت میں حج وغیرہ۔

احادیث سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ فی نفسہ کبائر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے صحیح حدیث میں یہ بات آئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِأَكْبَرِ الْكَبَائِرِ ؟[19] کیا میں تمھیں اکبر الکبائر کے بارے میں نہ بتاؤں؟

پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو شرک کے بعد والدین کی نافرمانی اور جھوٹی گواہی کے گناہ گنتی کر کے بتا دیے۔ اسی طرح آپ ﷺ سے یہ بھی صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ:

إِنَّ مِنْ أَكْبَرِ الْكَبَائِرِ أَنْ يَّلْعَنَ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ. سب سے بڑا کبیرہ یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین پر لعن طعن کرے۔

لوگوں نے پوچھا: کوئی شخص اپنے والدین پر لعن طعن کیسے کرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

يَسُبُّ الرَّجُلُ أَبَا الرَّجُلِ، فَيَسُبُّ أَبَاهُ وَيَسُبُّ أُمَّهُ.[20] ایک آدمی کسی کے باپ کو گالی دے تو وہ اس کے ماں باپ کو گالی دے گا۔

یعنی جب یہ دوسروں کو گالیاں دیتا ہے تو گویا اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہے۔ کیوں کہ یہ اس بات کا ذریعہ بنتا ہے کہ دوسرا اس کو جواب دے بلکہ کبھی تو اس کو اینٹ کا جواب پتھر سے ملتا ہے۔ یعنی یہ دوسرے کے صرف باپ کو گالی دیتا ہے اور وہ جواب میں اس کے باپ کو بھی گالی دیتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی ماں کو بھی نشانہ بنا دیتا ہے۔

۱۹- یہ ابوبکرہ کی متفق علیہ حدیث ہے۔ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۵۴۔

۲۰- متفق علیہ بروایت عبداللہ بن عمروؓ۔ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۵۷۔

اس حدیث نے اپنے والدین کو گالیاں دینے کا سبب بننے کو اکبر الکبائر میں شمار کیا ہے۔ یعنی یہ صرف حرام نہیں ہے اور نہ صرف کبیرہ گناہ ہے بلکہ اکبر الکبائر ہے۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو شخص براہ راست اپنے والدین کو گالیاں دیتا ہے اس کا گناہ کتنا بڑا ہوگا۔ اور پھر اس سے زیادہ یہ کہ آدمی اپنے والدین کو ایذا پہنچائے یا انھیں مارے پیٹے۔ اور پھر خصوصاً اس شخص کی کیا حالت ہوگی جو اپنے والدین کی زندگی کو اپنی جفا کاری اور نافرمانی سے جہنم زار بنا دے۔

شریعت نے اس حوالے سے گناہوں کے درمیان فرق کیا ہے کہ کون سے گناہ ہیں جن پر آدمی کسی کمزوری کی وجہ سے آمادہ ہوتا ہے اور کون سے گناہ ایسے ہیں جو سرکشی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ پہلے کی مثال زنا ہے اور دوسرے کی مثال سود ہے۔ سود کو اللہ کے ہاں سب سے زیادہ سخت گناہ قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن نے جو بات سود کے بارے میں فرمائی ہے وہ سود کے علاوہ کسی اور گناہ کے بارے میں نہیں فرمائی:

وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ. (البقرۃ ۲:۲۷۸-۲۷۹)

جو کچھ تمھارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمھارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اس کے موکل، اس کے وکیل اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں:

دِرْهَمُ رِبًا يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ، أَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَّثَلَاثِيْنَ زَنْيَةً. سود کا ایک درہم سے آدمی جان بوجھ کر کھائے تو یہ ۳۶ بار زنا سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔[21]

اس کے علاوہ سود کے ستر، بہتر، یا تہتر درجے قرار دیے گئے ہیں جن میں سب سے کم

۲۱- یہ حدیث امام احمد اور طبرانی نے عبداللہ بن حنظلہ سے روایت کی ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر [۳۳۷۵]۔

درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں کو بیوی بنائے۔[22]

● عقیدے سے متعلق کبائر

کبائر اعمال ظاہر ہی پر موقوف نہیں ہیں، جیسا کہ کبھی کبھی گمان کرلیا جاتا ہے، بلکہ عقیدے کے کبائر زیادہ بڑے اور خطرناک گناہ ہوتے ہیں۔

● آدم علیہ السلام و ابلیس کی حکم عدولی میں فرق

قرآن کے بیان کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اور ان کی جنت میں سکونت کے بعد جو پہلی حکم عدولی ہوئی ان میں سے ایک حضرت آدم اور اس کی بیوی کی حکم عدولی تھی جب کہ انھوں نے اسی درخت میں سے کھایا جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو روکا تھا۔ یہ وہ حکم عدولی تھی جو ظاہری اور جسمانی اعمال کے ساتھ تعلّق رکھتی تھی۔ اس کی طرف ان کے مائل ہونے کی وجہ ان کا نسیان اور عزم کی کمزوری تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُۥ عَزْمًا. (طٰہٰ۲۰:۱۱۵)

ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔

ابلیس لعین نے اس ضعف اور نسیان کا فائدہ اٹھایا۔ اس نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی کے لیے اسی درخت سے کھانا مزین کردیا اور انھیں دھوکے سے ورغلایا۔ اس نے اپنی دھوکہ بازی کو جھوٹی قسموں سے مؤکد کیا یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی میں مبتلا ہوگئے۔

مگر جلد ہی حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے دل میں ایمان کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اُٹھی اور وہ سمجھ گئے کہ انھوں نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی:

۲۲- اسے طبرانی نے حضرت براءؓ سے، حاکم نے ابن مسعودؓ سے اور ابن ماجہ نے ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر [۳۵۴۱،۳۵۳۹،۳۵۳۷]۔

وَعَصَىٰٓ ءَادَمُ رَبَّهُۥ فَغَوَىٰ. ثُمَّ ٱجْتَبَٰهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ. (طٰہٰ۲۰:۱۲۱-۱۲۲)

آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہِ راست سے بھٹک گیا۔ پھر اس کے رب نے اسے برگزیدہ کیا اور اس کی توبہ قبول کرلی اور اسے ہدایت بخشی۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ (الأعراف ۷:۲۳)

دونوں بول اٹھے: اے رب! ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہوجائیں گے۔

فَتَلَقَّىٰٓ ءَادَمُ مِن رَّبِّهِۦ كَلِمَٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ. (البقرۃ۲:۳۷)

اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی، جس کو اس کے رب نے قبول کرلیا، کیوں کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

دوسرا ابلیس کا گناہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسے ملائکہ کے ساتھ حکم دیا کہ وہ حضرت آدم کو سجدہ کرے، عزت افزائی کے لیے یا اس مخلوق کو سلام پیش کرنے کے لیے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا ہے اور اس میں اپنی روح پھونک دی ہے۔

فَسَجَدَ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ۝ إِلَّآ إِبْلِيسَ أَبَىٰٓ أَن يَكُونَ مَعَ ٱلسَّٰجِدِينَ ۝ قَالَ يَٰٓإِبْلِيسُ مَا لَكَ أَلَّا تَكُونَ مَعَ ٱلسَّٰجِدِينَ ۝ قَالَ لَمْ أَكُن لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُۥ مِن صَلْصَٰلٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ۝ قَالَ فَٱخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكَ ٱللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ ٱلدِّينِ. (الحجر ۱۵:۳۰-۳۵)

تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے، کہ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ رب نے پوچھا: اے ابلیس! تجھے کیا ہوا کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا؟ اس نے کہا: میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے۔ رب نے فرمایا: اچھا! تو نکل جا یہاں سے،

کیوں کہ تو مردود ہے، اور اب روزِ جزا تک تجھ پر لعنت ہے۔

یہ اللہ کے حکم سے انکار اور استکبار کی معصیت ہے۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں آیا ہے:

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ. (البقرة ۲:۳۴)

سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔

اس کے غرور و تکبر کی بڑی نشانی یہ ہے کہ اس نے بڑی بے شرمی کے ساتھ اپنے رب سے کہا:

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ. (الأعراف ۷:۱۲)

میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔

ان دونوں معصیتوں میں فرق تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی معصیت ظاہری اور جسمانی تھی اس لیے انھوں نے جلد ہی اس سے توبہ کر لی۔ مگر ابلیس کی معصیت قلبی اور باطنی تھی۔ یہی اس کی وہ خطرناکی جس نے اسے بدترین انجام سے دوچار کر دیا۔ وَالْعِيَاذُ بِاللّٰهِ تَعَالٰى۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان قلبی معصیتوں کے بارے میں زیادہ سخت وعید اور ان سے محتاط رہنے کی زیادہ تاکید آئی ہے جن کا شمار کبائر اور مہلک گناہوں میں ہوتا ہے۔ اکثر اوقات یہی ہوتے ہیں جو ظاہری کبائر کے ارتکاب، مامورات کے ترک اور ممنوعات کو اختیار کرنے کے لیے اصل اور بنیادی محرک بن جاتے ہیں۔

- **تکبر کی ہلاکت خیزی**

جیسا کہ ہم نے آدم و ابلیس کے قصے میں دیکھا کہ ابلیس کو تکبر نے کس طرح اللہ کے حکم کی نافرمانی پر آمادہ کیا۔ اور اس نے کہا:

لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ. (الحجر ۱۵:۳۳)

میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے

سے پیدا کیا ہے۔

اور: اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ (صٓ: ۷۶) میں اس سے بہتر ہوں۔

اسی وجہ سے کبر و غرور اور دوسرے کو حقیر جاننے کی بڑی سخت وعید آئی ہے۔ یہاں تک کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ.[۲۳] وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو گا۔

اور ایک حدیث قدسی ہے:

اَلْعِزُّ إِزَارِيْ، وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ، فَمَنْ يُنَازِعُنِيْ عَذَّبْتُهٗ.[۲۴] عزت میرا لباس اور تکبر میری چادر ہے، جو مجھ سے [ان کے بارے میں] نزاع کرے گا اسے میں عذاب میں مبتلا کروں گا۔

ایک اور حدیث میں ہے:

بِحَسْبِ امْرِئٍ مِّنَ الشَّرِّ أَنْ يَّحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ.[۲۵] آدمی کے لیے اتنا شر بہت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔

اور مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.[۲۶] جس نے تکبر کے ساتھ اپنا کپڑا [زمین پر] گھسیٹا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔

قرآن کریم نے کئی آیات میں تکبر اور متکبرین کی مذمت کی ہے اور یہ بات واضح کی ہے کہ وہ

۲۳- اسے مسلم نے کتاب الایمان میں ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔ [۱۴۷]۔

۲۴- اسے مسلم نے کتاب البر والصلة میں ابو سعیدؓ اور ابو ہریرہؓ دونوں سے روایت کیا ہے [۲۶۲۰] حدیث کے آخر میں ایک ٹکڑا محذوف ہے اور وہ یہ کہ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: فَمَنْ يُنَازِعُنِيْ عَذَّبْتُهٗ۔

۲۵- اسے مسلم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے [۲۵۶۴]۔

۲۶- متفق علیہ، یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۱۳۴۹۔

تکبر ہی تھا جس نے بہت سے لوگوں کو رسولوں پر ایمان لانے سے روکا اور انھیں جہنم تک پہنچا دیا:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا. (النمل ۲۷:۱۴)

انھوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا۔

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ. (النحل ۱۶:۲۹)

اب جہنم کے دروازوں میں گھس جاؤ، وہیں تم کو ہمیشہ رہنا ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ برا ہی برا ٹھکانا ہے متکبروں کا۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ. (النحل ۱۶:۲۳)

وہ ان لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرورِ نفس میں مبتلا ہوں۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ. (المؤمن ۴۰:۳۵)

اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر و جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ. (الأعراف ۷:۱۴۶)

میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو ناحق طور پر زمین میں بڑے بنتے ہیں۔

● بغض وحسد

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے قصے میں جسے قرآن کریم نے ہمارے سامنے حقانیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حسد ہی تھا جو برے بھائی کے لیے اپنے اچھے بھائی کو قتل کرنے کا محرک بنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ

اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۝ (المائدة ۵:۲۷-۳۱)

اور انھیں آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا قصہ بھی بے کم و کاست سنا دو، جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی۔ اس نے کہا: میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اس نے جواب دیا: اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔ آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تا کہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا: افسوس مجھ پر! میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا۔ اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔

اور قرآن نے حکم دیا ہے کہ حسد کے شر سے پناہ مانگیں:

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ. (الفلق ۱۱۳:۵)

اور حسد کرنے والے کے حسد سے جب وہ حسد کرنے لگے۔

اسی طرح حسد کے ساتھ یہودیوں کو متصف کیا ہے، فرمایا:

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ. (النساء ۴:۵۴)

کیا یہ دوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انھیں اپنے فضل سے نواز دیا؟

حسد کو اسلام پر ایمان لانے کے موانع اور اس کے خلاف چالوں کے اسباب میں سے قرار دیا ہے:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ. (البقرة ۲:۱۰۹)

اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمھیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگر چہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے۔

رسول کریم ﷺ بغض وحسد کو قوموں کی بیماریوں میں سے ایک خطرناک بیماری شمار کرتے ہیں، جو دین پر بہت زیادہ اثر انداز ہو جاتی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

دَبَّ إِلَيْكُمْ دَاءُ الْأُمَمِ مِنْ قَبْلِكُمْ: اَلْبَغْضَاءُ وَالْحَسَدُ، وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ، لَا أَقُولُ: حَالِقَةُ الشَّعْرِ، وَلٰكِنْ حَالِقَةُ الدِّينِ.[۲۷] تمھارے اندر قوموں کی بیماری سرایت کر جائے گی: یعنی بغض وحسد، اور یاد رکھو کہ بغض مونڈنے والا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈ دیتا ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتا ہے [یعنی اس کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے]۔

ایک اور حدیث میں ہے:

لَا يَجْتَمِعُ فِي جَوْفِ عَبْدٍ الْإِيمَانُ وَالْحَسَدُ.[۲۸] ایک بندے کے دل میں ایمان اور حسد ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

۲۷- اسے بزار نے حضرت زبیرؓ سے جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے، جیسا کہ منذری المنتقی ۱۶۱۵، اور ہیثمی المجمع ۸/۳ میں کہتے ہیں۔ اسی طرح ترمذی ۲۵۱۲ نے بھی اسے روایت کیا ہے اور کہتے ہیں کہ اس حدیث کی روایت میں اختلاف کیا گیا ہے۔

۲۸- اسے نسائی ۶/۱۳، اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ دیکھیے: الموارد ۱۵۹۷۔ صحیح الجامع الصغیر اور حاکم میں مسند احمد کی طرف منسوب کیا گیا ہے [۷۶۲۰]۔

اور فرمایا: لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَّا لَمْ يَتَحَاسَدُوا. لوگ ہمیشہ بھلائی پر رہیں گے جب تک کہ وہ آپس میں حسد نہ کریں۔[۲۹]

● طمع ولالچ

قلبی گناہوں میں جو کبائر ہیں ان میں سے تین مہلکات اور بھی ہیں جن سے حدیث میں محتاط رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

ثَلَاثٌ مُّهْلِكَاتٌ: شُحٌّ مُّطَاعٌ، وَهَوًى مُّتَّبَعٌ، وَإِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ.[۳۰] تین اشیا مہلکات میں شامل ہیں: ایک طمع ولالچ جس کی پیروی کی جائے، دوسری خواہش جس کے پیچھے چلا جائے اور تیسرا آدمی کا اپنے آپ میں گم ہونا۔

طمع ولالچ کی مذمت میں کئی احادیث آئی ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

لَا يَجْتَمِعُ الشُّحُّ وَالْإِيمَانُ فِي قَلْبِ عَبْدٍ أَبَدًا.[۳۱] طمع ولالچ اور ایمان ایک مسلمان بندے کے دل میں کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

شَرُّ مَا فِي الرَّجُلِ: شُحٌّ هَالِعٌ، وَجُبْنٌ خَالِعٌ.[۳۲] ایک آدمی میں سب سے زیادہ بری چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ ہے حرصِ شدید اور انتہائی بزدلی ہے۔

اِتَّقُوا الظُّلْمَ، فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَاتَّقُوا الشُّحَّ، فَإِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ

۲۹- اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں، دیکھیے: منذری کی المنتقی ۴/۱۷، اور ہیثمی کی المجمع ۸/۷۸۔

۳۰- اسے طبرانی نے الأوسط میں حضرت انسؓ اور ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے اور صحیح الجامع الصغیر [۳۰۳۰، ۳۰۳۵] میں اسے حسن قرار دیا گیا ہے۔

۳۱- اس کو احمد ۲/۳۴۲، بخاری الأدب المفرد ۲۸۱، نسائی ۶/۱۳، اور حاکم ۲/۸۲ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اس نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔ ابن حبان نے اسے الإحسان ۳۲۵۱ میں روایت کیا ہے اور اس کے محقق شیخ شعیب نے اس کو صحیح لغیرہ کہا ہے۔

۳۲- اسے احمد اور بیہقی ۹/۱۷۰ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ حافظ عراقی الإحیاء کی تخریج میں کہتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے۔ شیخ شعیب نے ابن حبان کی تخریج میں اور البانی نے صحیح الجامع الصغیر میں اسے صحیح کہا ہے [۳۷۰۹]۔

مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ: حَمَلَهُمْ عَلٰى أَنْ سَفَكُوْا دِمَاءَ هُمْ، وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ.[۳۳]
ظلم سے بچ کر رہو کیوں کہ ظلم قیامت کے دن اندھیروں کی صورت میں سامنے آئے گا۔ اور طمع ولالچ سے بچو کیوں کہ اس نے تم سے پہلے والے لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔ اسی نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک دوسرے کا خون بہائیں اور اللہ کے محارم کو حلال سمجھیں۔

إِيَّاكُمْ وَالشُّحَّ، فَإِنَّمَاهَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالشُّحِّ: أَمَرَهُمْ بِالْقَطِيْعَةِ فَقَطَعُوْا، وَأَمَرَهُمْ بِالْبُخْلِ فَبَخِلُوْا، وَأَمَرَهُمْ بِالْفُجُوْرِ فَفَجَرُوْا [۳۴] طمع ولالچ سے بچو کیوں کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے ہیں تو اسی کی وجہ سے۔ طمع ولالچ ہی ان کو قطع رحمی کا حکم دیتا تھا تو یہ اسے قطع کر دیتے تھے، وہ انھیں بخل کا حکم دیتا تھا تو بخل کرتے تھے اور وہ انھیں گناہوں کا حکم دیتا تھا تو وہ گناہ کرتے تھے۔

علما کہتے ہیں کہ شُحّ [طمع ولالچ] بخل اور حرص کے مجموعے کا نام ہے چنانچہ اس کی ممانعت حرص سے بھی زیادہ شدید ہے۔ بخل صرف مال کے حوالے سے ہوتا ہے اور شُحّ [یعنی طمع ولالچ] کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو نفس کو مال خرچ کرنے، کسی سے بھلائی کرنے یا کسی بھی عبادت میں کشادہ دلی سے روکتی ہے۔ اور شُحٌّ هَالِعٌ [یعنی شدید طمع ولالچ] وہ ہوتی ہے جو اپنے صاحب کو پریشانی اور اضطراب سے دوچار کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی حرص کی وجہ سے سخت پریشان ہوتا ہے کہ اپنا حق کسی طرح اس سے نکالے۔ اور کہا جاتا ہے کہ حرص ولالچ اللہ کی معرفت کے ساتھ کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ سخاوت اور مال کے انفاق میں جو چیز مانع ہوتی ہے وہ غریبی کا ڈر ہے۔ اور یہ اللہ سے غافل رہنا اور اس کے وعدوں پر یقین نہ

۳۲- اسے احمد اور بیہقی ۹/۱۷ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ حافظ عراقی الإحیاء کی تخریج میں کہتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے۔ شیخ شعیب نے ابن حبان کی تخریج میں اور البانی نے صحیح الجامع الصغیر میں اسے صحیح کہا ہے [۳۷۰۹]۔

۳۳- اسے مسلم نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے۔

۳۴- اسے ابوداؤد ۱۶۹۸، اور حاکم ۱/۱۱ نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے اور اسے صحیح علی شرط مسلم قرار دیا ہے، ذہبیؒ نے اس پر خاموش ہیں۔

ہونا ہے۔ اسی وجہ سے حدیث نے ایک دل میں حرص ولالچ کے جمع ہونے کی نفی فرمائی ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوتے، بلکہ ان میں سے ایک جاتی ہے تب دوسری آتی ہے۔

● شدید خواہش نفسانی

حدیث میں جن مہلکات کا ذکر ہے ان میں سے ایک 'شدید خواہش نفسانی' ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس سے قرآن نے بھی متعدد مقامات پر محتاط رہنے کی تاکید کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. (ص ۳۸:۲۶)

اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔

اور خاتم النبیین ﷺ سے فرمایا:

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ أَمْرُهٗ فُرُطًا. (الکهف ۱۸:۲۸)

کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو، جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط وتفریط پر مبنی ہے۔

اور ارشاد ہے:

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰيهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ. (القصص ۲۸:۵۰)

اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے۔

ایک قوم کی مذمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا أَهْوَآءَ هُمْ. (محمد ۴۷:۱۶)

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے اور یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں۔

قرآن نے یہ بات بیان کی ہے کہ خواہش نفس کی پیروی آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ وہ آدمی کو علم کے باوجود گمراہ کر دیتی ہے۔ وہ اس کی بصیرت و بصارت کو چھین لیتی ہے۔ پھر وہ نہ کچھ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ فرمایا:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰهُ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهِ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ. (الجاثیة ٤٥:٢٣)

کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اللہ کے بعد اور کون ہے جو اسے ہدایت دے؟

یہی وجہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: شَرُّ إِلٰهٍ عُبِدَ فِي الْأَرْضِ: الْهَوٰى زمین میں بدترین معبود جس کی عبادت کی جاتی ہے، خواہش نفس ہے۔

قرآن نے جنت میں داخل ہونے کے لیے جو اسباب بیان کیے ہیں ان میں خواہش نفس کی پیروی سے بچنا سرفہرست ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى o فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى o (النازعات ٧٩:٤٠-٤١)

اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے دور رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہوگی۔

● خود پسندی

تیسری مہلک چیز جو حدیث میں بیان ہوئی ہے وہ خود پسندی ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی اپنے آپ میں مگن رہے۔ جو شخص خود پسندی میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے عیبوں کو نہیں دیکھتا خواہ کتنے ہی بڑے ہوں۔ وہ اپنے محاسن اور زینت کو خوردبین سے دیکھتا ہے اور انھیں بڑا کر کے پیش کرتا ہے۔

قرآن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ خود پسندی نے کس طرح مسلمانوں کو ہزیمت سے دوچار کر دیا، حتی کہ وہ دوبارہ اپنی رشد کی حالت میں اور اپنے رب کی طرف لوٹے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ o ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهُ عَلٰى رَسُوْلِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَأَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا o (التوبة ٩:٢٥-٢٦)

اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمھاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوہ حنین کے روز (اس کی دست گیری کی شان تم دیکھ چکے ہو)۔ اس روز تمھیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرہ تھا، مگر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ وہ برائی جو تمھیں پریشان کر دے، اس بھلائی سے بہتر ہے جو تمھیں خود پسندی میں ڈال دے۔

ابن عطا نے بھی یہی معنی لیے ہیں اور اسی مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے سامنے کسی عبادت کا راستہ کھول دیتا ہے مگر قبولیت کا دروازہ نہیں کھولتا۔ اور کبھی وہ تیرے لیے ایسی معصیت مقدر کر دیتا ہے جو تیرے منزل مقصود پر پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ وہ معصیت جس پر تم اپنے آپ کو ذلیل محسوس کرو اور انکسار اختیار کرو اس عبادت سے بہتر ہے جو تمھارے اندر خود پسندی اور استکبار پیدا کرے۔

گناہ کر کے حقیر محسوس ہونا

● ریاکاری

افعالِ قلوب میں جو کبیرہ گناہ ہیں ان میں ایک وہ ریا ہے جو اعمال کو ضائع کر دیتا ہے اور اسے اللہ کے ہاں قبولیت سے نکال دیتا ہے، اگرچہ اس کا ظاہر لوگوں کے لیے کتنا ہی

خوب صورت اور حسین ہو۔

اللہ تعالیٰ منافقین کے بارے میں فرماتا ہے:

يُرَآءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيلًا o (النساء ۴:۱۴۲)

محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ o الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ o الَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ o وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ o (الماعون ۱۰۷: ۴-۷)

پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔

ریاکار شخص کے انفاق کی تصویر کشی اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے:

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا o (البقرۃ ۲:۲۶۴)

اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی، جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا، تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔

احادیث میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ ریا ایک طرح کا شرک ہے۔ ریاکار کا اپنے عمل سے اصل مقصود اللہ کی رضا نہیں ہوتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس سے راضی ہوں، اس کی تعریف کریں اور کی شرافت وبزرگی کے گن گائیں۔

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، فَمَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ. • میں شرک سے بالکل بے نیاز ہوں، جس نے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے

• مسلم، ح: ۷۶۶۶

ساتھ کسی اور کو شریک کیا میں اسے اس کے شریک کے سپرد کر دوں گا۔

اور ایک روایت میں ہے: فَأَنَا مِنْهُ بَرِيءٌ، وَهُوَ لِلَّذِي أَشْرَكَ • میں اس سے بیزار ہوں اور اس کا عمل اس کے شریک کے لیے ہے۔

اس سلسلے میں جو مشہور احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جسے مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور جس میں یہ ذکر ہے کہ قیامت کے دن تین آدمیوں کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا کہ انھیں اوندھے منہ آگ میں پھینک دیا جائے۔ ان میں سے ایک مجاہد اور شہید ہوگا، دوسرا وہ ہوگا جس نے علم حاصل کر کے دوسروں کو تعلیم کیا ہوگا اور وہ قرآن پڑھنے والا ہوگا۔ اور تیسرا وہ شخص ہوگا جس نے اپنا مال بھلائی کے کاموں میں خرچ کیا ہوگا۔ مگر اللہ تعالیٰ جو ان کی نیتوں اور رازوں سے آگاہ ہے، سارے لوگوں کے سامنے ان کو جھٹلائے گا اور ان میں سے ہر ایک سے کہے گا کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ تو نے جو کچھ کیا تھا وہ تو اس لیے کیا تھا کہ دنیا میں لوگ تمھاری تعریف کریں۔ اور تمھاری وہ تعریف ہو چکی ہے۔

انسان کی طرف سے اس طرح کی جعل سازی بدترین عمل اور شدید ترین جرم ہے۔ پھر جب اس طرح کی جعل سازی مخلوق کی طرف سے خالق پر ہو تو اس کا جرم اور زیادہ ناپسندیدہ اور شنیع بن جاتا ہے۔ یہ اس شخص کا عمل ہے جو لوگوں کو راضی کرنے کے لیے عمل کرتا ہے اور جھوٹ بنا کر لوگوں کو دکھاتا ہے کہ وہ لوگوں کے رب کو راضی کر رہا ہے۔ تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس دن میں شرمندہ اور ذلیل کرے جب دنیا کے سارے راز کھولے جائیں گے۔ پھر اسے اوندھے منہ آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ.

• دنیا کی محبت

قلبی گناہ کبیرہ میں سے ایک دنیا کی محبت اور اس کی طلب اور اسے آخرت پر مقدم کرنا ہے۔ یہ ہر غلطی کا سرا ہوتا ہے۔ یہاں خطرے کی بات دنیا کا مالک ہونا نہیں ہے بلکہ خطرے کی بات

• ابن ماجہ، ح: ۴۲۰۲

اسی کو منزل مقصود بنانا اور اس کے مال و متاع اور زیب و زینت کا حریص ہونا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کہیں دنیا اور آخرت میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو تو دنیا کو ترجیح دی جائے۔ یہی چیز دنیا اور آخرت دونوں میں ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔

آخرت کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَأَمَّا مَنْ طَغٰى ○ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ فَإِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَأْوٰى ○ (النازعات ۷۹: ۳۷-۳۹)

جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ○ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (هود ۱۱: ۱۵-۱۶)

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (وہاں معلوم ہو جائے گا کہ) جو کچھ انھوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔

فَأَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ○ (النجم ۵۳: ۲۹-۳۰)

جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے، اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے۔

وَمَآ أُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى

أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (القصص ۲۸: ۶۰)

تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور زیادہ دیر باقی رہنے والا ہے۔

اور دنیا کے بارے میں اس حدیث میں آیا ہے جو امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اس میں یہ ذکر ہے کہ امت کی ہلاکت کا راز کیا ہوگا حالانکہ ان کی تعداد کم نہیں ہوگی تو آپ نے فرمایا: حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ. دنیا کی محبت اور موت سے ڈرنا۔

● مال، جاہ اور عہدے کی محبت

دنیا کی محبت مال و دولت، جاہ و جلال، شہرت اور مقام و مرتبہ کی محبت کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ پھر ان چیزوں کی ایسی حرص کہ جس کی وجہ سے ایک آدمی اپنی اقدار اور روایات سے بھی دست برداری کا اعلان کرتا ہے۔ اس طرح اس کا دین بھی ضائع ہوتا ہے اور ایمان بھی۔ اسی کے بارے میں وہ حدیث وارد ہوئی ہے:

مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلَا فِيْ غَنَمٍ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ، لِدِيْنِهٖ.[35] دو بھوکے بھیڑیے بکریوں میں چھوڑ دیے جائیں تو وہ ان کے لیے اتنے نقصان دہ نہیں ہیں جتنا کہ دین کے لیے یہ بات نقصان دہ ہے کہ آدمی مال اور شرف کی حرص کرے۔

حرص کی انسان کو ضرورت بھی ہے مگر ایک معلوم اندازے کے مطابق۔ اگر کسی کی حرص کی حد نہ ہو اور اس کی ہوائیں چلتی ہی رہیں تو نفس بے قابو ہو جاتا ہے اور وہ ضروری حدود سے آگے بڑھتا ہے اور پھر وہ بھی اسی طرح فساد کرتا ہے۔ جیسا کہ دو بھوکے بھیڑیوں کو بکریوں کے درمیان میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ فساد اس وجہ سے برپا ہوتا ہے کہ اس کی حرص شرعی طور پر مذموم

۳۵- اسے امام احمد ۳/۳۵۶، ۳۶۰، ترمذی نے کتاب الزہد میں ذکر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے [۲۳۷۷]۔ اسے مناوی نے الفیض میں منذری سے نقل کیا ہے کہ اس کی سند جید ہے [۵/۴۴۶]۔

تکبر اور فساد کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَّالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ. (القصص ۲۸:۸۳)

وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں۔ اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے۔

اسی طرح دنیا کی محبت اور اس کے چاہنے کا ایک مظہر عہدوں اور مناصب کی حرص، امارت کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر جھپٹنا اور نمایاں ہونے کا شوق ہے جو اکثر اوقات نمایاں ہونے میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔

یہ وہی بات ہے جس سے نبی ﷺ نے اپنی امت کو خبردار کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّكُمْ سَتَحْرِصُوْنَ عَلَى الْإِمَارَةِ وَإِنَّهَا سَتَكُوْنُ نَدَامَةٌ وَّحَسْرَةٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَنِعْمَ الْمُرْضِعَةُ، وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ.[36] تم عن قریب امارت کی حرص کرو گے مگر یہ قیامت کے دن حسرت اور ندامت ثابت ہوگی۔ پس بہت اچھی دودھ پلانے والی ہے اور بہت بری دودھ چھڑانے والی ہے۔

یہاں استعارۃً امارت اور ولایت سے حاصل ہونے والے نفع کو حالت رضاع سے تشبیہ دی اور اس سے معزول ہونے یا مر جانے کی صورت میں محروم ہونے کو دودھ چھڑانے سے تشبیہ دی۔ امارت و ولایت حاصل کرنے کے بعد آدمی پر کچھ عرصے تک عارضی انعامات کی بارش ہوتی ہے پھر جلد ہی جب وہ امارت سے محروم ہوتا ہے تو وہ زائل ہو جاتی ہیں اور یہ اس پر حسرت کرتا رہ جاتا ہے اور اس کے عواقب کو بھگتتا ہے۔ چنانچہ کسی عاقل کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ ایسی لذتوں کی حرص کرے جس کے بعد حسرت ہی حسرت ہو۔

۳۶- اسے بخاری اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع لصغیر ۲۳۰۴۔

● حسرت و یاس

پھر قلبی گناہ کبیرہ میں سے ایک حسرت و یاس اور اللہ کی رحمت سے ناامیدی و مایوسی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے کہتا ہے:

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ٥ (یوسف ۱۲:۸۷)

اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔

اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے فرمایا:

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الْقَوْمُ الضَّاۗلُّوْنَ ٥ (الحجر ۱۵:۵۶)

ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گم راہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔

● چند مزید قسمیں

ان کبائر میں سے ایک اللہ کی پکڑ سے بے فکر ہو جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَفَأَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ٥ (الأعراف ۷:۹۹)

کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔

ان میں سے ایک یہ کہ آدمی چاہے کہ مسلمان معاشرے میں فحاشی پھیلے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ أَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ٥ (النور ۲۴:۱۹)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔

یہ وہ بعض کبائر ہیں جو ہلاکت اور تباہی میں ڈالنے والے ہیں اور ان کا تعلق قلبی گناہوں

سے ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے اکثر لوگ غفلت کرتے ہیں اور اپنی زیادہ تر توجہ ظاہری اعمال کی طرف رکھتے ہیں۔ یہ وہ گناہ ہیں جنھیں امام غزالیؒ نے **المهلكات** کہا ہے۔ انھوں نے اپنی جامع اور مشہور کتاب **إحياء علوم الدين** کی تیسری چوتھائی کو انھی کے لیے خاص کیا ہے۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی طرف اہل دین اور دعوت کے علم برداروں کو اسی طرح توجہ دینی چاہیے جس طرح اہمیت شریعت نے اسے دی ہے۔ انھیں چاہیے کہ اپنے دل و دماغ کو اس کی طرف متوجہ کریں اور انھیں فہم، سمجھ اور تعلیم و تربیت کا محور بنانا چاہیے۔

گناہِ صغیرہ کی قسمیں

کبائر کے بعد ان محرمات کی باری آتی ہے جن کی حرمت قطعی ہوتی ہے۔ انھیں شارع نے لمم یا محقرات کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

یہ ایسے گناہ ہیں جن سے شاید ہی کوئی شخص محفوظ رہا ہو، عموماً کسی نہ کسی دور میں آدمی ان میں مبتلا ہوا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کو کبائر سے الگ کیا جاتا ہے۔ یہ ایسے گناہ ہوتے ہیں جو پنج وقتہ نمازوں، نماز جمعہ، رمضان کے روزوں اور اس میں قیام اللیل سے بخش دیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں آیا ہے:

اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ، وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ، وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ: مُكَفِّرَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ إِذَا اجْتُنِبَ الْكَبَائِرُ.[۳۷] پانچ نمازیں، جمعہ اگلے جمعہ تک اور رمضان اگلے رمضان تک، [یہ سارے اعمال] اپنے درمیانی گناہوں کے لیے کفارہ بنتے ہیں، بشرطیکہ کبائر سے اجتناب کیا جائے۔

اور صحیحین میں ہے:

أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَنَّ نَهْرًا بِبَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسَ مَرَّاتٍ، فَهَلْ يَبْقٰى عَلٰى بَدَنِهٖ مِنْ دَرَنِهٖ شَيْءٌ؟ فَذٰلِكَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ، يَمْحُو اللهُ بِهِ الْخَطَايَا.[۳۸] تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم میں کسی کے گھر کے سامنے ایک نہر ہو اور وہ دن میں

۳۷- اسے مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

۳۸- متفق علیہ بروایت حضرت ابوہریرہؓ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۴۳۵، اور المنتقٰى من الترغيب والترهيب ۵۱۴۔

پانچ مرتبہ اس میں نہائے، کیا اس کے جسم پر کوئی میل رہ جائے گا؟ یہی حال پانچ نمازوں کا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے گناہوں کو مٹاتا ہے۔

صحیحین ہی میں ایک روایت ہے:

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ. جس نے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے اس کے پچھلے گناہ معاف کیے جائیں گے۔

اور مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ.[۳۹] جس نے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے رمضان میں قیام اللیل کیا اس کے پچھلے گناہ معاف کیے جائیں گے۔

بلکہ قرآن نے تو یہ بھی بیان کیا ہے کہ آدمی صرف اتنا کرے کہ کبائر سے بچے تو صغائر کو اللہ تعالیٰ ویسے معاف کردے گا۔ فرمایا:

إِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّئٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلاً كَرِيْمًا. (النساء ۴:۳۱)

اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمھیں منع کیا جارہا ہے تو تمھاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمھارے حساب سے ساقط کردیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔

رہا کبائر کا معاملہ تو انھیں توبۃ النصوح کے سوا کوئی چیز ختم نہیں کرسکتی۔

صغائر کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ ان میں عام طور پر انسان مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب اپنے بندوں میں سے محسنین اور اچھے لوگوں کا ذکر کیا تو اُن کی صرف یہ صفت

۳۹۔ متفق علیہ بروایت حضرت ابوہریرہؓ دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان ۴۳۵، اور المنتقیٰ من الترغیب والترھیب ۵۱۴۔ یہاں گناہ سے مراد گناہ صغیرہ ہیں، گناہ کبیرہ نہیں ہیں۔

بیان کی کہ وہ کبائر اور فواحش سے اجتناب کرتے ہیں۔ سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ٥ (الشوریٰ ۴۲:۳۶-۳۷)

جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کرجاتے ہیں۔

سورۂ نجم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ أَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ أَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ٥ الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ ط إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ٥ (النجم ۵۳:۳۱-۳۲)

زمین اور آسمان کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے۔ تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور ان لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنھوں نے نیک رویہ اختیار کیا، جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں، الا یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہوجائے۔ بلاشبہ تیرے رب کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔

یہ ان لوگوں کی صفت ہے جنھوں نے احسان کیا اور جن کے لیے حسنیٰ ہے۔ یعنی وہ کبائر اور فواحش سے اجتناب کرتے ہیں سوائے لمم کے۔ سلف کی ایک بڑی جماعت سے لمم کی تعریف میں روایت کیا گیا ہے کہ یہ کسی وقت گناہ کی طرف مائل ہونا اور دوبارہ اس کی طرف نہ لوٹنا ہے، خواہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت ابوصالحؒ فرماتے ہیں: مجھ سے اللہ تعالیٰ کے قول اللمم کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے کہا کہ یہ وہ گناہ ہے کہ آدمی ایک بار اسے کرے اور پھر اس کے پاس نہ جائے۔

پھر میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا: لَقَدْ أَعَانَكَ عَلَيْهَا مَلَكٌ كَرِيمٌ. ایک معزز فرشتے نے اس میں تیری مدد کی ہے۔

جمہور کا مذہب یہ ہے کہ لمم ان گناہوں کو کہتے ہیں جو کبائر کے علاوہ ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت اصح ہے۔ جیسا کہ ان سے صحیح بخاری میں مروی ہے: میں نے لمم کی اس سے زیادہ قریب کوئی چیز نہیں دیکھی جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے:

إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزِّنَى، أَدْرَكَ ذٰلِكَ لَامُحَالَةَ، فَزِنَى الْعَيْنِ النَّظَرُ، وَزِنَى اللِّسَانِ اَلنُّطْقُ، وَالنَّفْسُ تَتَمَنّٰى وَتَشْتَهِي، وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ أَوْ يُكَذِّبُهُ. اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے لیے ہر چیز میں زنا کا اپنا حصہ رکھا ہے جسے وہ ضرور پائے گا۔ آنکھ کا زنا دیکھنا، زبان کا زنا بولنا ہے۔ نفس تمنا اور خواہش کرتا ہے اور فرج اس کی تصدیق یا تکذیب کرتا ہے۔

مسلم نے بھی اسے روایت کیا ہے، اس میں الفاظ یہ ہیں:

اَلْعَيْنَانِ زِنَاهُمَا النَّظَرُ، وَالْأُذُنَانِ زِنَاهُمَا الْإِسْتِمَاعُ، وَاللِّسَانُ زِنَاهُ الْكَلَامُ، وَالْيَدُ زِنَاهَا الْبُطْشُ، وَالرِّجْلُ زِنَاهَا الْخُطَا. آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے کانوں کا سننا، زبان کا کلام کرنا، ہاتھ کا پکڑنا اور پاؤں کا چلنا ہے۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: صحیح قول جمہور کا ہے اور وہ یہ کہ لمم چھوٹے گناہوں کو کہتے ہیں، جیسے دیکھنا، چھونا، چومنا وغیرہ۔ یہ جمہور صحابہ اور تابعین وغیرہ کا قول ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ، مسروق رحمۃ اللہ علیہ اور شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ یہ قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول کے خلاف نہیں ہے جو ان سے دوسری روایت میں منقول ہے، جس کے مطابق لمم یہ ہے کہ گناہِ کبیرہ کی طرف عارضی طور پر متوجہ ہو اور

پھر اس کی طرف دوبارہ نہ آئے۔ لمم کا لفظ یا تو دونوں کو متناول ہوگا اور دونوں باتیں درست ہوں گی۔ یا یہ کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس شخص کے گناہ کو بھی لمم میں شامل کیا ہے جو ایک بار گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے اور اس پر اصرار نہیں کرتا بلکہ زندگی میں ایک بار اس سے صادر ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس بات کو دیکھا ہے کہ جس شخص نے گناہ کبیرہ کا بار بار ارتکاب کیا ہوتا ہے اس کے حق میں وہ بڑا ہو کر عظیم اور سخت ہو جاتا ہے۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی فقاہت اور ان کی علمی گہرائی کا ایک نمونہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے ایک دو مرتبہ تو مسامحت کر لیتا ہے۔ البتہ خوف اس شخص کے بارے میں ہے جو گناہ کو اپنے لیے عادت بنا لے۔ اور اس کا کئی بار ارتکاب کرے۔[۴۰]

یہ بھی ہے کہ شریعت خواہ لمم اور صغیرہ گناہوں پر کتنی ہی مسامحت کرے مگر اسے معمولی سمجھے، اور اس پر دوام اور اصرار کرنے سے پھر بھی محتاط رہنے کا حکم ہے۔ کیوں کہ چھوٹی چیز جب ایک اور چھوٹی سے ملتی ہے تو وہ بڑی ہو جاتی ہے۔ اس طرح صغائر انسان کو کبائر کی طرف کھینچتے ہیں اور کبائر اسے کفر کی طرف کھینچتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وَمُعْظَمُ النَّارِ مِنْ مُّسْتَصْغَرِ الشَّرَرِ. بڑا الاؤ چھوٹی چنگاری سے بنتا ہے۔

اسی وجہ سے سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے:

إِيَّاكُمْ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوبِ، فَإِنَّمَا مَثَلُ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوبِ كَمَثَلِ قَوْمٍ نَزَلُوا بَطْنَ وَادٍ، فَجَاءَ ذَا بِعُودٍ، وَجَاءَ ذَا بِعُودٍ حَتّٰى حَمَلُوا مَا أَنْضَجُوا بِهِ خُبْزَهُمْ، وَإِنَّ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوبِ مَتٰى يُؤْخَذُ بِهَا صَاحِبُهَا تُهْلِكُهُ.[۴۱] چھوٹے سمجھے جانے

۴۰- دیکھیے: مدارج السالکین، ابن قیمؒ، ۱/۳۱۶-۳۱۸، طبع: السنة المحمدية، تحقیق: محمد حامد الفقی۔

۴۱- ہیثمی المجمع ۱۰/۱۹ میں کہتے ہیں کہ اسے احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی وہی ہیں جو صحیح کے ہیں۔ اسے طبرانی نے اپنی تینوں کتابوں میں دو سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ان میں سے ایک کے راوی صحیح کے ہیں سوائے عبدالوہاب بن الحکم کے، مگر وہ بھی ثقہ راوی ہیں۔ صحیح الجامع الصغیر ۲۶۸۶ میں اس کی نسبت بیہقی کی طرف کی گئی ہے۔

والے گناہوں سے بچو، چھوٹے گناہوں کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگ کسی وادی میں پڑاؤ ڈالیں، ایک ادھر سے ایک لکڑی لے آئے دوسرا اُدھر سے ایک لکڑی لے آئے۔ اس طرح وہ اتنی لکڑیاں جمع کرلیں جس سے وہ اپنے لیے کھانا پکاسکیں۔ چھوٹے گناہوں اگر آدمی مواخذہ کیا جائے تو وہ اسے ہلاک کردیں گے۔

اسے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

إِيَّاكُمْ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوبِ، فَإِنَّهُنَّ يَجْتَمِعْنَ عَلَى الرَّجُلِ حَتّٰى يُهْلِكْنَهُ.

چھوٹے گناہوں سے بچو، یہ جب انسان کے اوپر جمع ہوتے ہیں تو اسے ہلاک کردیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے یہ مثال پیش فرمائی کہ کچھ لوگ ایک ویران جگہ میں پڑاؤ ڈالیں اس قوم کا کام اس طرح انجام پائے کہ ان میں سے ایک آدمی نکلے وہ ایک لکڑی لے آئے۔ پھر دوسرا نکلے وہ بھی ایک لکڑی لے آئے، یہاں تک کہ سارے مل کر بڑی تعداد میں لکڑیاں جمع کرلیں اور اس سے ایک بڑی آگ بھڑکالیں۔ پھر اس پر جو چاہیں پکائیں۔[۴۲]

تشبیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی متفرق لکڑیاں جب جمع ہوگئیں تو انھوں نے ایک بھڑکتی ہوئی عظیم آگ کو جنم دیا۔ یہی کام چھوٹے گناہ بھی کرتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مومن اپنے گناہوں کو ایک پہاڑ کی طرح دیکھتا ہے اور ڈرتا ہے کہ یہ اس پر گر جائیں گے اور منافق اپنے گناہوں کو ایسے دیکھتا ہے جیسے اس کی ناک پر مکھی آکر بیٹھ گئی ہے۔ وہ اسے اس طرح اور اس طرح کرتا ہے یعنی ہاتھ ہلا کر اسے اپنے سے دور ہٹا دیتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے إحیاء علوم الدین کی کتاب التوبۃ میں ان صغائر کا ذکر کیا ہے جو صغائر کو کبائر میں بدل دیتے ہیں اور کبائر کے حجم میں اضافہ کردیتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ

۴۲۔ ہیثمی المجمع ۱۰/۱۸۹ میں کہتے ہیں کہ اسے احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں، سوائے عمران بن قطان کے، مگر اسے بھی ثقہ قرار دیا گیا ہے۔ مناوی نے حافظ عراقی سے نقل کیا ہے کہ اس کی سند جید ہے۔ علائی کہتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین کی شرطوں کے لحاظ سے جید ہے اور ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے۔ دیکھیے: فیض الباری ۳/۱۲۸۔

ہے کہ آدمی گناہ کو معمولی سمجھے اور معصیت کو حقیر جانے۔ حتی کہ بعض سلف نے کہا ہے کہ جس گناہ کے بارے میں معاف نہ ہونے کا خدشہ ہوتا ہے وہ گناہ ہے جس کا ارتکاب کرنے والا کہتا ہے: کاش کہ میرا پچھلا گناہ بھی اس طرح ہوتا جیسا کہ یہ ہے۔ ان امور میں سے ایک اور امر گناہ پر جہر کرنا اور بے شرمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے: كُلُّ أُمَّتِي مُعَافًى إِلَّا الْمُجَاهِرِينَ. میرے تمام امتیوں کو معافی ہوگی سوائے مہاجرین کے۔

اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہاں ایک ضروری امر ہے جس کو سمجھنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ کبیرہ کے ساتھ بعض اوقات حیا، خوف اور اس کو بڑا سمجھنے کا احساس مل جاتا ہے تو وہ اسے صغائر میں شامل کردیتے ہیں۔ اور کبھی صغیرہ گناہ کے ساتھ حیا کی کمی، بے پروائی اور خوف شامل ہوجاتا ہے تو یہ چیز اسے کبائر کے ساتھ جوڑ دیتی ہے، بلکہ اسے ان کا بلند ترین مرتبہ دے دیتی ہے۔[۴۳]

اسی طرح کبھی ایک ہی معصیت ہوتی ہے مگر اس کا ارتکاب کرنے والے شخص یا اس کے حالات کے لحاظ سے اس کے گناہ میں فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ غیر شادی شدہ کے زنا اور شادی شدہ کے زنا میں فرق ہوتا ہے، جوان اور بوڑھے کے زنا میں بھی فرق ہوتا ہے، اور اسی طرح پڑوسی کی بیوی یا اس شخص کی بیوی سے زنا کرنا جس کا شوہر جہاد میں شریک ہو، یا محرم عورت کے ساتھ، یا رمضان کے دنوں میں، یا حرم میں، زنا دوسرے حالات میں زنا سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔ ہر چیز کا اللہ کے ہاں مقررہ حساب ہوتا ہے۔

اس مقام پر علامہ ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ کا بہت خوب صورت بیان ہے۔ اس کے فائدے کی خاطر ہم اسے یہاں نقل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

وہ محرمات جن کی حرمت قطعی ہو، کتاب وسنت میں مذکور ہیں جیسے:

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِّنْ إِمْلَاقٍ ...... (الأنعام۶:۱۵۱)

۴۳۔ مدارج السالکین ۱/۳۲۸۔

ان سے کہو کہ آؤ میں تمھیں سناؤں تمھارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں: یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو...... یہاں سے لے کر تیسری آیت کے آخر تک۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ o (الأعراف ۷:۳۳)

ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام، خواہ کھلے ہوں یا چھپے، اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی ایسے کو شریک کرو جس کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی، اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمھیں معلوم نہ ہو (کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے)۔

بعض آیات میں کسی ایک نوع کے ساتھ مخصوص محرمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض مقامات پر کھانے پینے کے محرمات کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک مقام یہ ہے:

قُلْ لَا أَجِدُ فِيمَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ. (الأنعام ۶:۱۴۵)

ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں تو میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو، الا یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو کہ وہ ناپاک ہے، یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔

دوسرا یہ کہ

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ o (البقرة ۲:۱۷۳)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو وہ یہ ہے کہ مردار نہ کھاؤ، خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو، اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔

ایک اور آیت میں ہے:

وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ o (النحل ۱۶:۱۱۵)

اور ایسی چیز جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔

اسی طرح فرمایا:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ o (المائدة ۵:۳)

تم پر حرام کیا گیا مردار، خون، سور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، وہ جو گلا گھٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا ہو، اور وہ جس کو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔ نیز یہ بھی تمھارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرو۔

محرمات نکاح کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کیا ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ...... الآية (النساء ۴:۲۳)

تم پر حرام کی گئیں تمھاری مائیں، بیٹیاں...... وغیرہ

کمائی کے حوالے سے محرمات کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کیا ہے:

وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَوا o (البقرة ۲:۲۷۵)

اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

سنت میں تو بہت سے محرمات کا ذکر آیا ہے۔ جیسے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيرِ وَالْأَصْنَامِ [۴۴] اللہ تعالیٰ نے شراب، مردار، سور اور بتوں کی خرید وفروخت حرام کی ہے۔

دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ إِذَا حَرَّمَ شَيْئًا حَرَّمَ ثَمَنَهُ. [۴۵] اللہ تعالیٰ جس چیز کو حرام کرتا ہے اس کی قیمت بھی حرام ہوتی ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے: كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ. [۴۶] ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

نیز فرمایا: إِنَّ دِمَائَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ. [۴۷] تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری عزتیں تمھارے لیے حرام ہیں۔

چنانچہ معلوم ہوا کہ جس چیز کی حرمت پر کتاب وسنت میں تصریح ہو وہ حرام ہوتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نہی اور وعید اور تشدید مل جائیں تو اس سے بھی حرمت کے معنی لیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ج

۴۴-اسے حضرت جابرؓ کی روایت سے احمد ۳/۳۲۴، ۳۲۶، ۳۴۰، بخاری ۲۲۳۶، ۴۲۹۶، مسلم ۱۵۸۱، ابوداؤد ۳۴۸۶، ترمذی ۱۲۹۷، نسائی ۷/ ۱۷۷، ۳۰۹، اور ابن ماجہ ۲۱۶۷ نے ذکر کیا ہے۔

۴۵-اسے ابوداؤد نے ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے اس کی سند صحیح ہے۔

۴۶-اسے مسلم ۲۰۰۳، ابوداؤد ۳۶۷۹، ترمذی ۱۸۶۴، نسائی ۸/ ۲۹۷ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

۴۷-اس کی تخریج ابوبکرۃ کے حدیث میں گزر چکی ہے۔

فَهَلْ أَنتُمْ مُّنْتَهُوْنَ. (المائدۃ ۵: ۹۰-۹۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمھیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہوگے؟

جب مطلق نفی ہو اور اس کے ساتھ وعید نہ ہو تو اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ اس سے حرمت کے معنی لیے جائیں گے یا نہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے نزدیک اس سے حرمت کے معنی لینا درست نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہمیں سلام بن ابی مطیع نے بتایا، انھوں نے ابن ابی ذخیلہ سے اور انھوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھا۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے کھجور اور کشمش سے 'منع' فرمایا ہے، یعنی ان دونوں کو ملا کر کھانے سے۔ میرے پیچھے ایک آدمی بیٹھا تھا اس نے مجھ سے پوچھا: کیا فرمایا؟ میں نے کہا: فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے کھجور اور کشمش کو 'حرام' کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے میری بات سنی اور فرمایا: تم نے جھوٹ بولا ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا: کیا آپ نے ابھی یہ نہیں فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے؟ اگر یہی بات ہے تب تو وہ حرام ہی ہے۔ انھوں نے کہا: کیا تم اس کی گواہی دیتے ہو؟ سلام کہتے ہیں کہ گویا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے نہی کا اصل حکم کیا ہے۔ [۴۸]

ہم نے اس سے پہلے جلیل القدر علمائے کرم جیسے احمد اور مالک سے نقل کیا ہے کہ وہ اس چیز پر لفظ حرام کا اطلاق کرنے سے اجتناب کرتے تھے جس کی حرمت یقینی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس میں کسی طرح کا شبہہ پایا جاتا تھا یا اس کی تحریم کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا۔

۴۸-اس روایت میں ابن ابی ذخیلہ اور اس کا باپ غیر معروف ہیں۔

امام نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ بعض ایسی چیزوں کو ناپسند کرتے تھے جنھیں وہ حرام بھی نہیں کہتے تھے۔ ابن عون کہتے ہیں کہ مکحول نے مجھے کہا: اس پھل کے بارے میں تم کیا کہتے ہو جسے کچھ لوگوں کے سامنے پھینک دیا جاتا ہے اور وہ اس کو لوٹ لیتے ہیں؟ ہمارے نزدیک تو یہ مکروہ ہے۔ انھوں نے کہا: یہ حرام ہے! میں نے کہا: ہمارے نزدیک تو یہ مکروہ ہی ہے۔ انھوں نے کہا: یہ حرام ہے! ابن عون کہتے ہیں کہ اب ہم اسے مکحول کے قول کی وجہ سے ناپسند کرتے ہیں۔

جعفر بن محمد کہتے ہیں: میں نے ایک آدمی سے سنا کہ وہ قاسم بن محمد سے پوچھ رہا تھا: کیا موسیقی حرام ہے؟ قاسم اس پر خاموش رہا۔ سوال پھر دہرایا گیا۔ قاسم پھر خاموش رہا۔ سوال تیسری بار دہرایا گیا تو اس نے کہا: حرام وہ ہے جو قرآن میں حرام کیا گیا ہو۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ اللہ کے سامنے حق بھی لایا جائے اور باطل بھی تو ان میں سے کس میں موسیقی ہوگی؟ سائل نے کہا: باطل میں۔ قاسم نے کہا: پھر تم اپنے دل سے پوچھو۔

امام احمد رحمہ اللہ کے صاحبزادے عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا، وہ فرما رہے تھے: وہ چیزیں جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے ان میں سے بعض حرام ہیں۔ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ پھوپھی کے ساتھ بھتیجی کو اور خالہ کے ساتھ اس کی بھانجی کو ایک نکاح میں جمع کیا جائے۔[49] یہ حرام ہے۔

۴۹- یہ حدیث بخاری ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، مسلم ۱۴۰۸، ابوداؤد ۲۰۶۵، ۲۰۶۶، نسائی ۹۷/۷، اور ابن ماجہ ۱۹۲۹ میں ابوہریرہؓ سے منقول ہے۔

۵۰- اسے ابوداؤد ۴۱۳۲، ترمذی ۱۷۷۰، ۱۷۷۱، نسائی ۱۶۷/۷، اور حاکم ۱۴۴/۱ نے سعید بن ابی عروبہ سے، اس نے قتادہ سے، اس نے ابوالملیح سے، اس نے اپنے باپ سے اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے درندوں کی جلد سے منع فرمایا ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ ابوالملیح عن ابیہ سے کسی نے روایت کی ہو سوائے سعید بن ابی عروبہ کے۔ پھر انھوں نے اس حدیث کو شعبة، عن يزيد الرشك، عن أبي المليح، عن النبي صلى الله عليه وسلم کی سند سے مرسلاً نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اصح سند ہے۔ اس کے علاوہ دیکھیے: شرح السنة للبغوی ۹۹/۲-۱۰۰۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درندوں کی جلد سے منع فرمایا۔[50] یہ بھی حرام ہے۔

اس طرح کی اور بھی کئی اشیا انھوں نے ذکر کیں۔ ان میں وہ اشیا بھی ہیں جن سے منع فرمایا گیا ہے مگر وہ ادب کی نوع سے ہیں۔[51]

۵۱- جامع العلوم والحكم، لابن رجب، تحقیق: شعیب الأرناؤوط، ۱۵۷/۲-۱۶۰، طبع: الرسالة، بیروت۔ ہم نے اس کی تخریج احادیث سے بھی استفادہ کیا ہے۔

عملی اور اعتقادی بدعتیں

اس مقام پر ہم وہ چیز بھی گناہوں کے ساتھ شامل کر سکتے ہیں جو شریعت میں بدعت کے نام سے مشہور ہے۔ اور بدعت وہ ہوتی ہے جسے لوگوں نے دینی معاملات میں نیا ایجاد کیا ہو۔ خواہ وہ اعتقادی بدعت ہو، جسے بدعت قولی بھی کہتے ہیں، یا عملی بدعت ہو، جسے بدعت فعلی بھی کہتے ہیں۔

یہ بھی محرمات کی ایک قسم ہے مگر عمومی معاصی سے مختلف ہے۔ اس کا فاعل ان سے اللہ کا قرب چاہتا ہے اور اس کا عقیدہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے اللہ کی اطاعت اور اس کی عبادت کر رہا ہے۔ یہی اس کا اصل نقصان ہے۔

بدعت کبھی اس طرح ہوتی ہے کہ آدمی اس حق کے خلاف عقیدہ رکھے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث فرمایا ہے اور جس کے ساتھ اس نے اپنی کتاب نازل فرمائی ہے۔ اسے اعتقادی یا قولی بدعت کہتے ہیں۔ اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کی طرف وہ بات منسوب کرتا ہے جو اس نے کی نہیں ہوتی۔ یہ ایک بہت بڑی حرام چیز ہے۔ بلکہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سب سے بڑی حرام چیز ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (الأعراف ۷:۳۳)

ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام —

خواہ کھلے ہوں یا چھپے — اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی ایسے کو شریک کرو جس کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی، اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمھیں معلوم نہ ہو (کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے)۔

اس باب میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ اللہ کی حلال کردہ اشیا کو بغیر کسی دلیل کے حرام کیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا ط قُلْ آللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ ۝ (یونس ۱۰:۵۹)

ان سے کہو: تم لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمھارے لیے اتارا تھا اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھیرا لیا! ان سے پوچھو: اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی، یا تم اللہ پر افترا کر رہے تھے؟

کبھی بدعت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے مگر ایسے طریقوں اور شکل و صورت کے ساتھ جو شریعت میں مشروع نہیں ہوتی، بلکہ نئی ایجاد ہوئی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ ط (الشوریٰ ۴۲:۲۱)

کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا۔

اور حدیث میں آیا ہے:

إِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ.[۵۲] [دین میں] نئی نئی چیزوں سے بچ کر رہو، کیوں کہ ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

۵۲- اسے احمد ۴/۱۲۶، ۱۲۷، ابوداؤد ۴۶۰۷، ابن ماجہ ۴۳، ۴۴، حاکم ۱/ ۹۵، اور ابن حبان نے عرباض بن ساریہؓ سے نقل کیا ہے۔

مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ.[53] جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز پیدا کی، جو اس میں سے نہ ہو، تو وہ مردود ہے۔

یہ دونوں بدعتیں جیسا کہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ایک دوسرے کے لازم اور ملزوم ہیں اور کم ہی ایسا ہوا ہوگا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئی ہوں۔ کسی نے کہا ہے کہ قولی بدعت نے عملی بدعت کے ساتھ شادی کی ہے۔ پھر دونوں میاں بیوی نے زفاف کی ہے اور اس سے ان کے ہاں بہت سے حرامی بچے پیدا ہوئے ہیں جو اسلامی ممالک میں رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے اللہ کی زمین اور اس کے بندے اللہ کے ہاں فریادی ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حقیقت کافرہ نے بدعت فاجرہ سے شادی کی ہے جنھوں نے مل کر دنیا و آخرت کا نقصان ہی جنم دیا ہے۔

ابلیس کو گناہ کے مقابلے میں بدعت زیادہ محبوب ہے کیوں کہ اس کا صاحب اس سے نہ توبہ کرتا اور نہ اس سے باز آتا ہے۔ بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کی طرف بلاتا ہے۔ پھر ضمنی طور پر اللہ اور اس کے رسول کی مسترد کردہ امور کو معتبر سمجھا جاتا ہے اور ان کے معتبر کردہ امور کو مسترد کیا جاتا ہے، جن لوگوں سے اللہ اور اس کے رسول کی دوستی ہے ان سے بدعتی کی دشمنی ہوتی ہے اور جن سے اللہ اور اس کے رسول کی دشمنی ہوتی ہے ان سے اس کی دوستی ہوتی ہے۔ جن چیزوں کی اللہ اور اس کے رسول نے نفی کی ہوتی ہے انھیں یہ ثابت کرتا ہے اور جن کو اللہ اور اس کے رسول نے ثابت کیا ہوتا ہے یہ ان کی نفی کرتا ہے۔[54]

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ بدعتیں ساری ایک مرتبے کی نہیں ہوتیں۔ کچھ بدعات مغلظہ ہوتی ہیں اور کچھ مخفف، کچھ متفقہ ہوتی ہیں اور کچھ اختلافی۔

بدعات مغلظہ میں بھی بعض وہ ہوتی ہیں جو — اللہ کی پناہ — آدمی کو کفر تک پہنچا دیتی

۵۳- متفق علیہ، بروایت حضرت عائشہؓ، بخاری ۲۶۹۷، مسلم ۱۷۱۸۔

۵۴- دیکھیے: مدارج السالکین ۱/۲۲۲-۲۲۳۔

ہیں۔ جیسے وہ فرقے جو دین اسلام کے اصول ہی سے نکل گئے اور اُمت سے الگ تلگ ہو گئے۔ مثلاً نصیریہ، درزیہ[55]، متشدد شیعہ، اسماعیلیہ [آغا خانی] اور اس طرح کے دوسرے لوگ جن کے بارے میں امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کی ظاہری صورت رافضیوں کی اور ان کا باطن کافروں کا ہے۔ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ یہود و نصاریٰ سے بڑے کافر ہیں۔ اس وجہ سے ان کی عورتوں سے شادی جائز نہیں اور ان کا ذبیحہ کھانا بھی ناجائز ہے، حالانکہ اہل کتاب کا ذبیحہ کھایا جاسکتا ہے اور ان کی عورتوں سے شادی بھی جائز ہے۔

کچھ بدعتیں ایسی ہیں جو غلیظ تو ہیں مگر وہ آدمی کو کفر تک نہیں پہنچاتیں بلکہ اسے فسق تک پہنچا دیتی ہیں۔ اور یہ اعتقادی فسق ہوتا ہے عملی نہیں۔ اس طرح کا بدعتی بعض اوقات سب سے زیادہ اور لمبی لمبی نمازیں پڑھتا ہے اکثر روزے رکھتا ہے اور قرآن کی تلاوت بھی بہت زیادہ کرتا ہے۔ جیسا کہ خوارج کا حال تھا۔ جن کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

يُحَقِّرُ أَحَدُكُمْ صَلَاتَهُ إِلَىٰ صَلَاتِهِمْ، وَصِيَامَهُ إِلَىٰ صِيَامِهِمْ، وَقِرَاءَتَهُ إِلَىٰ قِرَاءَتِهِمْ تم میں سے ایک شخص اپنی نماز کو ان کی نماز، اپنے روزے کو ان کے روزے اور اپنی تلاوت کو ان کی تلاوت کے مقابلے میں حقیر سمجھے گا۔

مگر ان کی خرابی ان کے ضمیر میں نہیں بلکہ ان کی عقل میں ہے۔ وہ جمود کے شکار اور پتھر کی طرح سخت ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اہل اسلام کو قتل کرتے ہیں اور اہل اصنام کو چھوڑتے ہیں۔

انھی خوارج کی طرح وہ لوگ بھی ہیں جو رافضیہ ہیں یا قدریہ ہیں یا معتزلہ اور بہت سے وہ جہمیہ ہیں جو اپنے مذہب میں زیادہ سخت نہیں ہیں۔ جیسا کہ ان کے بارے میں ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا۔[56]

اس کے علاوہ کچھ بدعات خفیفہ ہیں جو اجتہادی غلطی کی وجہ سے یا استدلال میں التباس

۵۵- یہ لوگ فاطمی حکمران حاکم بامر اللہ کی تقدیس کرتے ہیں اور ابو محمد عبداللہ الدرزی کی طرف منسوب ہیں۔ (مترجم)

۵۶- دیکھیے مدارج السالکین ۱/۳۶۲۔

کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں۔ ان کا شمار معاصی کے باب میں صغائر کے ساتھ ہوگا۔

کچھ بدعات ایسی ہیں جن کے بارے میں اختلاف ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے ان کی تائید کی ہوتی ہے اور بعض نے تردید۔ جیسے نبی ﷺ اور اللہ کے دوسرے نیک بندوں کو وسیلہ بنانا۔ یہ عملی اور فروعی مسائل ہیں عقیدے اور اصول کے نہیں۔ جیسا کہ امام حسن البنا رحمۃ اللہ علیہ نے بالکل درست طور پر کہا ہے اور یہی بات امام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔

اسی طرح بعض عبادات کا التزام، کہ وہ بدعت میں شامل ہیں یا نہیں۔

مختصراً یہ کہ بدعتیں سب ایک درجے اور ایک سطح کی نہیں ہیں اور اسی طرح مبتدعین کا بھی ایک ہی مرتبہ اور درجہ نہیں ہے۔ بعض لوگ بدعتوں کے داعی ہوتے ہیں اور بعض لوگ دوسروں کی پیروی میں صرف خود بدعت کرتے ہیں اور وہ دوسروں کو دعوت نہیں دیتے۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا حکم ہے۔

مشتبہات

صغائر محرمات کے بعد مشتبہات کی باری آتی ہے۔ مشتبہات وہ ہوتی ہیں جن کا حکم اکثر لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا۔ وہ اس کے حلال یا حرام ہونے کے حوالے سے اشتباہ میں ہوتے ہیں۔ یہ ان محرمات کی طرح نہیں ہیں جن کی حرمت قطعی ہوتی ہے۔

جو شخص اہل اجتہاد میں سے ہو اور اس کا اجتہاد اسے کسی مشتبہ چیز کی اباحت یا اس کی حرمت کے بارے میں یکسو کر دے تو اسے اپنے اجتہاد پر عمل کرنا چاہیے۔ اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اجتہاد پر عمل کو چھوڑ کر دوسروں کے خیالات پر تکیہ کرے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنے اجتہاد کے حوالے سے مکلّف کرتا ہے بشرطیکہ وہ اجتہاد کے اہل ہوں۔ پھر خواہ کسی مخصوص مسئلے میں ان کا اجتہاد غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اس صورت میں وہ معذور ہوں گے اور ان کو اپنے اجتہاد کا ایک اجر بھی ملے گا۔

اور جو شخص اہل تقلید میں سے ہو اس کے لیے گنجایش ہے کہ وہ علما میں سے جس پر اعتماد کرتا ہے اس کی تقلید کرے۔ اگر اس کا دل اپنے مقتدا کے علم اور اس کے ایمان پر مطمئن ہے تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے۔

البتہ جس پر معاملہ مشتبہ ہو جائے اور اس کے سامنے حق کا پہلو غالب نہ ہو تو اس کے بارے میں اشتباہ کا حکم ہے۔ اس کے لیے مناسب یہ ہوتا ہے کہ اپنے دین اور اپنی عزت کو بچانے کے لیے اس چیز سے اجتناب کرے۔ جیسا کہ متفق علیہ حدیث میں آیا ہے:

إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ، كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى يُوشِكُ أَنْ يَرْتَعَ فِيهِ.[57]

حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی۔ اور ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں جنھیں اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جو مشتبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت بچالی۔ اور جو مشتبہات میں پڑ گیا وہ گویا حرام میں لت پت ہو گیا، اس چرواہے کی طرح جو اپنی بکریاں باڑ کے قریب قریب چراتا ہے، اس کے بارے میں ہر وقت یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اس کی بکریاں باڑ کے اندر چر جائیں گی۔

ایک ان پڑھ آدمی کو اس طرح کے مواقع پر کسی با اعتماد عالم سے پوچھنا چاہیے تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ اس کے مسئلے کا حل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (النحل ۱۶:۴۳)

اہل ذکر سے پوچھو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے۔

اور حدیث میں ہے:

أَلَا سَأَلُوا إِذْ لَمْ يَعْلَمُوا؟ فَإِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ. اگر ان کو معلوم نہیں تھا تو انھوں نے کسی سے پوچھا کیوں نہیں؟ لاعلمی کی بیماری کا علاج یہی ہے کہ وہ پوچھے۔[58]

مشتبہات کے بارے میں لوگوں کے درمیان بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف ایک طرف ان کے نقطہ ہائے نظر کے حوالے سے ہے اور دوسری طرف ان کی طبیعتوں کے اختلاف کی وجہ سے اور تیسری جانب تقویٰ وغیرہ کے بارے میں ان میں نقطہ نظر کے اختلاف کی وجہ سے۔

بعض لوگ وسوسے کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں جو انتہائی معمولی مناسبت ہونے کے

۵۷- اسے نعمان بن بشیرؓ نے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: بخاری [۵۲]، ۲۰۵۱، مسلم ۱۵۹۹۔

۵۸- اسے ابوداؤد نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: الجامع الصغیر ۴۳۶۲۔

باوجود مشتبہات کی تحقیق کرتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کو معلوم کر کے رہیں گے۔ ان کی مثال وہ لوگ ہیں جو مغربی ممالک میں کسی معمولی سے معمولی شک کی وجہ سے گوشت کے حلال ہونے میں شک کرتے ہیں۔ وہ بعید تاویلات کو قریب لا کر رکھتے ہیں اور جو کام تقریباً ناممکن ہوا سے ایک حقیقت واقعی کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ بار بار پوچھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اپنے لیے مسئلہ مشکل بنا دیتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آسانی رکھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْئَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ. (المائدة ۵:۱۰۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں ناگوار ہوں۔

کسی مسلمان سے اس قدر گہرائی میں جانے اور اتنی نکتہ چینی کا تقاضا نہیں ہے۔

اور اس حدیث میں جو بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے آیا ہے کہ نبی ﷺ سے پوچھا گیا: کوئی قوم ہمارے پاس گوشت لے کر آتی ہے مگر ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ انھوں نے اس پر اللہ کا نام لیا ہو گا یا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

سَمُّوا اللّٰهَ عَلَيْهِ وَكُلُوْا تم اس پر اللہ کا نام لو اور اسے کھاؤ۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اس حدیث سے ایک قاعدہ اخذ کیا ہے اور وہ یہ کہ مَا غَابَ عَنَّا لَا نَسْأَلُ عَنْهُ. جو چیز ہم سے چھپی ہے ہم اس کے بارے میں نہیں پوچھتے۔

ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی راستے سے گزر رہے تھے۔ ان پر کسی پرنالے سے پانی گر گیا۔ ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ اس نے پرنالے والے سے پوچھا: بھائی! یہ پانی صاف تھا یا نہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے پرنالے والے سے فرمایا: بھائی! آپ ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہ بتائیں، ہمیں تکلف سے روکا گیا ہے۔

اور نبی ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ ﷺ سے ایک ایسے آدمی کی شکایت ہوئی جسے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ وہ نماز میں یا مسجد میں کوئی چیز محسوس کرتا ہے۔ [یعنی اسے خیال آتا ہے کہ اس کا وضو ٹوٹ گیا] آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو [اپنی نماز یا مسجد سے] نہیں جانا چاہیے، جب تک کہ وہ کوئی آواز نہ سنے یا کوئی بو محسوس نہ کرے۔

اسی سے علما نے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ إِنَّ الْيَقِيْنَ لَا يَزُوْلُ بِالشَّكِّ. یقین کو شک زائل نہیں کرسکتا۔ اور یہ کہ يُعْمَلُ بِالْأَصْلِ وَيُطْرَحُ بِالشَّكِّ. اصل پر عمل کیا جائے اور شک کو مسترد کیا جائے۔ یہ قاعدہ وسوسے کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی کی دعوت قبول کی اور اس کے ہاں کھانا کھایا اور اس سے یہ نہ پوچھا کہ یہ حلال ہے یا حرام اور اس کے برتن صاف ہیں یا نہیں؟

آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے پاس وہ کپڑے اور برتن لائے جاتے تھے جنھیں کفار نے تیار کیا ہوتا تھا اور آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین انھیں بے تکلفی سے استعمال کیا کرتے تھے۔ جہاد کے موقع پر بھی مختلف قسم کے برتن اور کپڑے ہاتھ آتے تھے۔ آپ ﷺ انھیں تقسیم کرتے تھے اور انھیں استعمال بھی کرتے تھے۔ بلکہ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے مشرکین کے چھوڑے ہوئے مشکیزے سے منہ لگا کر پانی پیا۔[59]

اس جواز کے بالمقابل ایسے لوگ بھی ہیں جو ان چیزوں میں سخت رائے رکھتے ہیں۔ ان کی دلیل نبی ﷺ کی وہ صحیح حدیث ہے جس میں آیا ہے کہ آپ ﷺ سے اہل کتاب کے برتنوں کے بارے میں پوچھا گیا، جو سور کھاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: إِنْ لَّمْ تَجِدُوْا غَيْرَهَا فَاغْسِلُوْهَا بِالْمَاءِ، ثُمَّ كُلُوْا فِيْهَا.[60] اگر اس کے علاوہ اور برتن نہ ہوں تو ان کو پانی سے دھو لو اور پھر ان میں کھاؤ۔

۵۹- دیکھیے: بخاری ۳۴۴، اور جامع العلوم والحکم، ابن رجب ۱/۱۹۹۔

۶۰- متفق علیہ، بروایت: ابوثعلبہ الخشنی، بخاری ۵۴۷۸، مسلم ۱۹۳۰۔

امام احمد نے مشتبہ کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ یہ حلال اور حرام کے درمیان ایک تیسرا درجہ ہے۔ ان کی تفسیر میں حرام سے مراد حرام محضہ اور حلال سے مراد حلال محضہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو اس [تیسرے درجے] سے بچا تو اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچالیا۔ کبھی وہ اس کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ وہ چیز ہے جس میں حلال اور حرام خلط ملط ہو گئے ہوں۔

علامہ ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اِس سے اُس شخص کے معاملے میں استدلال کیا جاتا ہے جس کے مال میں حرام اور حلال دونوں خلط ملط ہوں۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ اس سے اجتناب ضروری ہے، سوائے اس کے کہ چیز بہت تھوڑی ہو اور قابل ذکر نہ ہو۔ ہمارے اصحاب کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کم یا زیادہ دونوں صورتوں میں کیا یہ مکروہ ہے یا حرام۔

اگر کسی کا زیادہ مال حلال ہو تو اس کے ساتھ معاملہ بھی درست ہے اور اس کے مال میں سے کھانا بھی ٹھیک ہے۔ حارث نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے حکمران کی طرف سے ملنے والے انعام کے بارے میں فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ تمھیں جو حلال دے رہا ہے وہ اس کے دیے ہوئے حرام سے زیادہ ہے۔ نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ مشرکین اور اہل کتاب سے لین دین کرتے تھے، باوجودیکہ انھیں معلوم تھا کہ وہ تمام محرمات سے اجتناب نہیں کرتے۔

اور اگر معاملہ مشتبہ ہو جائے تو وہ مشتبہات میں سے ہے اور اس کا چھوڑنا تقویٰ کا تقاضا ہے۔ سفیان رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے اس سے کوئی رغبت نہیں، اسے اختیار کرنے کے مقابلے میں مجھے اس کا ترک زیادہ مرغوب ہے۔

زہری رحمۃ اللہ علیہ اور مکحول رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، جب تک کہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ یقینی طور پر حرام ہے۔ اگر کسی کے مال میں یقینی حرام معلوم نہ ہو مگر اتنا معلوم ہو کہ اس میں شبہہ ہے تو اس کے ہاں کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کی تصریح امام احمد

نے اس روایت میں کی ہے جو انھوں نے حنبل سے نقل کی ہے۔

اسحاق بن راہویہ کی رائے وہی ہے جو ابن مسعود رضی اللہ عنہ، سلمان وغیرہ سے منقول ہے اور وہ رخصت کی رائے ہے۔ اور سود یا جوئے کے بارے میں جب کسی کے حق میں فیصلہ ہو جائے تو اس کے مال میں سے لینا مباح ہے، اس مسئلے میں انھوں نے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ یہ رائے ان سے ابن منصور نے نقل کی ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اس مال کے بارے میں، جس کا حلال اور حرام ہونا مشتبہ ہو، کہتے ہیں کہ اگر وہ مال کثیر ہو تو اس میں سے حرام کے برابر نکالا جائے اور باقی استعمال کیا جائے۔ اگر تھوڑا مال ہو تو سارے کو چھوڑ دے۔ اس لیے کہ اگر مال قلیل ہو اور اس میں سے کوئی چیز لے لے، تو پھر بھی حرام سے بچنا بعید ہے۔ جبکہ زیادہ مال ہو تو اس میں حرام سے آسانی کے ساتھ بچا جا سکتا ہے۔ ہمارے اصحاب میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنھوں نے اسے پرہیز گاری پر محمول کیا ہے نہ کہ تحریم پر۔ انھوں نے قلیل وکثیر دونوں سے حرام کے برابر نکال کر باقی کے استعمال کو مباح قرار دیا ہے۔ یہ حنفیہ وغیرہ کا قول ہے۔ اہل تقویٰ میں سے بھی بعض لوگوں نے اس قول کو قبول کیا ہے جن میں سے ایک بشر الحافی ہیں۔

سلف میں سے کچھ لوگوں نے ایسے شخص کے ہاں کھانے کی بھی اجازت دی ہے جسے یہ تو معلوم ہو کہ اس کے مال میں حرام ہے مگر یہ معلوم نہ ہو کہ جو کچھ کھلا رہا ہے وہی حرام ہے۔ جیسا کہ مکحول اور زہری کے قول میں گزر چکا ہے۔ اسی طرح کا قول فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔

اس کے بارے میں سلف سے کئی آثار منقول ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحت کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ ان سے پوچھا گیا: میرا ایک پڑوسی ہے جو کھلم کھلا سود کھاتا ہے اور حرام مال لینے سے ہچکچاتا نہیں ہے، وہ مجھے اپنے ہاں کھانے پر بلاتا ہے تو میں کیا کروں؟ انھوں نے

جواب دیا: اس کی دعوت قبول کرو۔ یہ تمھارے لیے جائز ہے اور گناہ اسی کے ذمے ہے۔[۶۱]

ایک روایت میں ہے کہ سائل نے کہا: مجھے اس کے مال میں حرام اور خبیث مال کے سوا کوئی چیز معلوم نہیں ہے، تو انھوں نے کہا: اس کی دعوت قبول کرو۔ امام احمد نے اسے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح قرار دیا ہے مگر انھوں نے اس قول کے ساتھ اُس روایت کے ذریعے معارضہ کیا ہے جو انھی سے منقول ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے کہا:

اَلْاِثْمُ حَوَازُّ الْقُلُوْبِ.[۶۲] گناہ دلوں پر اثر کرتا ہے یا ان پر قابو پالیتا ہے۔

بہر حال جن امور کے بارے میں 'اکثر' لوگوں پر یہ بات واضح نہ ہو کہ یہ حلال ہیں یا حرام انھی امور کے بارے میں 'بعض' لوگوں پر واضح ہو جاتا ہے کہ کون سی چیز حلال ہے اور کون سی حرام، کیوں کہ ان کے پاس ان چیزوں کے بارے میں زیادہ علم ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ان مشتبہات کو بعض لوگ جانتے ہیں مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

جو لوگ نہیں جانتے ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ لوگ جو ان کے اشتباہ کی وجہ سے ان میں توقف کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو ان کے بارے میں مشتبہ ہونے کا گمان نہیں کرتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اس پر دال ہے کہ ان کے علاوہ کچھ لوگ ہیں جو ان کو جانتے ہیں اور اُس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں حلال یا حرام ہونے کے لحاظ سے وہ جو بھی ہوں مگر کوئی شخص ان کو اپنے طور پر [صحیح یا غلط] جانتا ہے۔

۶۱- اسے عبدالرزاق نے المصنف ۴۶۷۵، ۴۶۷۶ میں ذکر کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

۶۲- اسے طبرانی نے الکبیر ۸۷۴۷-۸۷۵۰ میں اور ہیثمی نے مجمع الزوائد ۱/ ۱۷۶ میں ذکر کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ طبرانی نے اسے ایسی سندوں سے نقل کیا ہے جس کے راوی ثقہ ہیں۔ الحواز کے بارے میں النہایۃ میں کہا گیا ہے: یہ وہ امور ہیں جو دلوں پر اثر کرتے ہیں یہ وہ خیالات ہیں جو دل میں آتے ہیں اور ان کے بارے میں اطمینان نہ ہونے کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ کہیں یہ گناہ نہ ہوں۔ یہ 'ز' کی تشدید کے ساتھ حازٍّ کی جمع ہے۔ شمر نے اسے حَوّاز یعنی 'وٗ' کی تشدید کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ یعنی اس پر قابو پالیتا ہے اور اس پر غالب آتا ہے۔ ایک روایت میں حزّاز بھی ہے یعنی دو 'زاؤں' کے ساتھ۔ یعنی حز مصدر سے اسم فاعل ہوگا۔ یعنی کاٹنے والا۔

یہ اس بات کی سب سے واضح دلیل ہے کہ وہ مسائل جو حلال وحرام کے درمیان مشتبہ ہیں اور اس وجہ سے ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے ان میں عنداللہ حق پر ایک ہوتا ہے۔ اور دوسرے لوگ اس کا علم نہیں رکھتے بایں معنی کہ وہ عنداللہ اس کے حقیقی مراد تک رسائی نہیں پاسکے۔ اگر چہ اس کے بارے میں اس کا جو عقیدہ ہے وہ اس کے نزدیک کسی دلیل پر مبنی ہے مگر وہ حقیقت میں دلیل نہیں بلکہ شبہہ ہے۔ اس طرح کا آدمی اپنے اجتہاد کی وجہ سے اللہ کے ہاں مأجور ہوگا اور اس کی غلطی قابل معافی ہوگی کیوں کہ وہ اسے غلطی نہیں سمجھ رہا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے اس قول نے کہ:

فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ. [جو مشتبہات سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچالیا اور جو مشتبہات میں پڑ گیا وہ حرام میں مبتلا ہوگیا]۔

ان امور کے بارے میں لوگوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا۔ اور یہ قسمیں ان لوگوں کے لحاظ سے ہیں جس کے لیے اشتباہ پیدا ہوگیا ہو۔ اور یہ وہی ہے جو نہ جانتا ہو۔

جو شخص اس کا علم رکھتا ہے اور وہ اس چیز کی پیروی کرتا ہے جن کی طرف اس کے علم نے اس کی رہنمائی کی ہوتی ہے تو یہ تیسری قسم ہے جسے حدیث میں اس لیے ذکر نہیں کیا گیا کہ اس کا حکم ظاہر تھا۔ یہ قسم تینوں میں سے افضل قسم ہے۔ کیوں کہ اس نے ایک مشتبہ مسئلے میں اللہ کے متعین کردہ حکم کو جان لیا اور اس کی پیروی کی۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم نہ ہو ان کی دو قسمیں ہیں:

ایک وہ جو اِن مشتبہات سے بچتے ہیں، اس لیے کہ یہ مشتبہات ہیں۔ ایسے لوگوں نے اپنے دین اور عزت کو بچالیا۔ اِسْتَبْرَأَ کے معنی یعنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے دین اور عزت کے لیے ہر نقص اور عیب سے برأت طلب کی۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عزت کے لیے براءت طلب کرنا قابل تعریف ہے۔ اسی وجہ سے یہ قول وارد ہے کہ جس چیز سے آدمی نے اپنی عزت بچائی وہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔

دوسرے وہ جو اشتباہ کے باوجود اِن شبہات میں پڑتے ہیں۔ مگر جو آدمی کوئی ایسا کام کرتا ہے جس میں دوسرے لوگوں کو شبہہ نظر آرہا ہو، اور وہ اسے اس وجہ سے کرتا ہے کہ اس کے خیال میں یہ کام حقیقتاً حلال ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حرج نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ اس کے بارے میں اس وجہ سے ہچکچاتا ہے کہ لوگ اس پر اعتراض کریں گے تو اس کا چھوڑنا اس کے لیے عزت کی حفاظت کے طور پر بہتر ہوگا۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسا کہ نبی ﷺ کو کسی آدمی نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کھڑے دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تمھاری ماں صفیہ بنت حُیی ہے۔[۶۳]

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک دن جمعہ کے دن نکلے تو دیکھا کہ لوگ نماز پڑھ کر جارہے ہیں۔ ان کو شرم آئی اور ایک ایسی جگہ میں گھس گئے جہاں کوئی ان کو نہ دیکھ سکے۔ پھر انھوں نے کہا: جو لوگوں سے حیا نہیں کرتے وہ اللہ سے بھی حیا نہیں کرتے۔

لیکن اگر کسی نے اس اعتقاد کے ساتھ اس کام کو اختیار کیا کہ یہ حلال ہے، کسی جائز اجتہاد کی وجہ سے، یا جائز تقلید کی وجہ سے، مگر وہ اپنے اس اجتہاد میں غلطی پر تھا تو اس کا حکم بھی وہی ہے جو اس سے پہلے بیان ہوا۔ اگر اس کا اجتہاد ضعیف ہو یا جائز نہ ہو اور اس کو صرف خواہش نے اس کام پر آمادہ کیا ہو تو اس کا حکم اس شخص جیسا ہوگا جو اشتباہ کے باوجود اس کو اپناتا ہے۔

وہ شخص جو شبہات کے باوجود ان کا ارتکاب کرتا ہے اس کے بارے میں نبی ﷺ نے خبر دی ہے کہ وہ حرام میں پڑ گیا۔ پھر اس کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے:

ایک یہ کہ اس کا مشتبہ چیز کو اپنانا — باوجود یکہ وہ جانتا ہو کہ یہ مشتبہ ہے — تدریج اور تسامح کی وجہ سے اس بات کا ذریعہ بن رہا ہو کہ آدمی ایک ایسے حرام کا ارتکاب کرے گا جس

۶۳- اسے بخاری [۲۰۳۵]، مسلم ۲۱۷۵، ابوداؤد ۴۹۹۴، اور احمد ۶/ ۳۳۷ نے حضرت صفیہؓ سے نقل کیا ہے۔

کی حرمت اس کے نزدیک بھی یقینی ہو۔ جیسا کہ اس حدیث کی صحیحین ہی میں مذکور دوسری روایت میں ذکر ہے:

وَمَنِ اجْتَرَأَ عَلٰى مَا يَشُكُّ فِيْهِ مِنَ الْإِثْمِ أَوْشَكَ أَنْ يُوَاقِعَ مَا اسْتَبَانَ .[64] یعنی جو شخص مشکوک گناہ پر جری ہوتا ہے بعید نہیں کہ وہ اس گناہ میں بھی پڑ جائے جو کھلا گناہ ہو۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو شخص ایسے کام کا اقدام کرتا ہے جو اس کے نزدیک مشتبہ ہے یعنی اسے نہیں معلوم کہ یہ حلال ہے یا حرام ہے، تو یہ قوی امکان ہے کہ وہ حقیقت میں حرام ہی ہو۔ اس طرح وہ حرام کا ارتکاب کرلے گا اور اسے معلوم نہیں ہوگا کہ یہ حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان محرمات کے گرد باڑ لگائی ہے اور اپنے بندوں کو ان کے قریب جانے سے روکا ہے۔ اس مقصد کے لیے کچھ حدود بھی مقرر کی ہیں۔ اس نے ایسے شخص کے بارے میں، جو اپنی بکریوں کو باڑ کے اردگرد اور اس کے قریب چراتا ہے، یہ امکان ظاہر کیا ہے کہ اس کی بکریاں باڑ میں گھس جائیں اور اس میں چر جائیں۔ اسی طرح جو شخص حلال سے تجاوز کرتا ہے اور مشتبہات میں پڑتا ہے تو وہ حرام کے انتہائی قریب ہوجاتا ہے۔ اس کی حالت کے ساتھ یہی مناسب ہوتا ہے کہ وہ خالص حرام میں لت پت ہوجائے اور اس میں گر پڑے۔ اسی میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ محرمات سے فاصلے پر رہنا چاہیے اور اپنے اور گناہ کے درمیان کوئی نہ کوئی رکاوٹ رکھنا چاہیے۔

امام ترمذی اور ابن ماجہ نے عبداللہ بن یزید کی روایت سے نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ أَنْ يَكُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتّٰى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهٖ حَذَرًا مِمَّا بِهٖ بَأْسٌ .[65] ایک آدمی متقین کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ ان چیزوں کو نہ چھوڑے جن میں کوئی حرج نہیں ہے، ان چیزوں سے محتاط رہنے کے لیے جن میں کوئی حرج ہے۔

۶۴- یہ صرف بخاری کی روایت ہے۔ ۲۰۵۱۔

۶۵- اسے ابن ماجہ، اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حسن غریب ہے مگر سند میں یزید الدمشقی آیا ہے جو ضعیف ہے۔

حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں: پوری تقویٰ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے، یہاں تک کہ ذرہ برابر چیز کے بارے میں بھی اس کا خوف رکھے اور بعض ایسی چیزوں کو بھی حرام کا خدشہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ دے جن کے بارے میں اس کا خیال ہوتا ہے کہ یہ جائز ہیں اور اس طرح وہ اپنے اور گناہ کے درمیان میں ایک آڑ پیدا کرے۔

حضرت حسن کہتے ہیں: متقین اس وقت تک تقویٰ پر قائم رہیں گے جب تک کہ وہ بہت سے حلال کو صرف اس وجہ سے چھوڑیں گے کہ وہ حرام میں مبتلا نہ ہوجائیں۔

امام ثوری کہتے ہیں: متقیوں کا نام متقی اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ ان چیزوں سے بھی بچتے ہیں جن سے بچا نہیں جاسکتا۔[66]

حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے کہا: مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میں اپنے اور حرام چیزوں کے درمیان کسی حلال کی ایک آڑ رکھوں جسے میں پھاڑ نہ دوں۔

اور میمون بن مہران کہتے ہیں: کسی آدمی کے لیے حلال اس وقت تک سالم نہیں رہ سکتا جب تک کہ وہ اپنے اور حرام کے درمیان حلال کی کوئی آڑ نہ رکھے۔[67]

حضرت سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں: ایک آدمی ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ اپنے اور حرام کے درمیان حلال کی ایک آڑ نہ رکھے، اور یہاں تک کہ وہ گناہ اور اس کے مشابہ چیزوں کو بھی نہ چھوڑ دے۔[68]

یہاں ہر انسان کو اپنے مرتبے کے حدود میں رہتے ہوئے کوئی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر مشتبہات میں پڑ جانے پر کسی ناپسندیدگی کا

۶۶- ان اقوال کو ابونعیم نے الحلیة [۷/۲۸۴] میں سفیان بن عیینہ کی روایت سے بیان کیا ہے۔

۶۷- اسے ابونعیم نے الحلیة [۷/۲۸۸] میں بیان کیا ہے۔

۶۸- جامع العلوم والحکم، لابن رجب، تحقیق: شعیب الأرناؤوط، ۱/۲۰۹-۲۱۰، طبع: الرسالة، بیروت۔ ہم نے اس کی تخریج احادیث وآثار سے بھی استفادہ کیا ہے۔ آخری روایت کو ابونعیم نے الحلیة [۷/۲۸۸] میں بیان کیا ہے۔

اظہار تک نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ محرمات میں ڈوبے ہوتے ہیں بلکہ کبھی تو ــــ اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ ــــ وہ کبائر بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مشتبہ کو مشتبہ کے درجے میں رکھا جائے اور اسے صریحی اور قطعی حرام کے درجے تک نہ پہنچایا جائے۔ سب سے خطرناک بات یہی ہے کہ احکام شرعیہ میں مراتب کی حدود کو ختم کیا جائے، حالانکہ شارع نے ان کے نتائج و آثار کے درمیان بھی فرق رکھا ہے۔

مکروہات

منہیات کے سب سے ادنیٰ درجے میں مکروہات کی باری آتی ہے۔ ان سے مراد مکروہ تنزیہی ہیں۔ یہ بات معلوم ہے کہ مکروہات میں بعض مکروہ تحریمی ہیں اور بعض تنزیہی۔ مکروہ تحریمی اس کو کہتے ہیں جو حرام کے زیادہ قریب ہو اور مکروہ تنزیہی اس کو کہتے ہیں جو حلال کے زیادہ قریب ہو۔ اور جب مکروہ کا لفظ مطلقاً بولا جاتا ہے تو اس سے مراد مکروہ تنزیہی ہوتی ہے۔ اس کی کئی معروف مثالیں ہیں۔ جو شخص امام نووی رحمہ اللہ کی ریاض الصالحین جیسی کتابیں دیکھے گا ان کو مکروہات کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ جیسے ٹیک لگا کر کھانا، مشکیزے سے منہ لگا کر پینا، کوئی چیز پیتے ہوئے اس میں پھونک مارنا، دائیں ہاتھ سے استنجا کرنا، بغیر عذر کے دائیں ہاتھ سے عضو کو چھونا، ایک جوتے میں چلنا، مسجد میں لڑنا اور آواز اونچی کرنا، جمعہ کے دن امام کے خطبے کے دوران مسجد میں احتبا کرنا[69]، بخار کو گالیاں دینا، مرغ کو گالی دینا، منہ پھاڑ کر باتیں کرنا، اور دعا میں یہ کہنا کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے، یہ کہنا کہ مَاشَاءَ اللّٰہُ وَشَاءَ فُلَانٌ، نماز عشاء کے بعد گفتگو کے لیے جاگتے رہنا، کھانا حاضر ہونے کے وقت نماز کے لیے اٹھنا، جمعہ کے دن کو روزے کے لیے اور اس کی رات کو قیام کے لیے مخصوص کرنا، اور ریحان کو بلا عذر لوٹا دینا وغیرہ۔

مکروہ ــــ جیسا کہ علما فرماتے ہیں ــــ وہ ہیں جن کے ترک کرنے میں اجر ہوتا ہے اور ان کے کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ اس لیے اس شخص پر کوئی سزا لازم نہیں ہوتی جس نے

٦٩۔ گھٹنوں کو کھڑا کر کے کسی کپڑے یا اپنے ہاتھوں کو ان کے گرد لپیٹ کر بیٹھنا۔ عرب اکثر اسی طرح بیٹھا کرتے تھے۔ (مترجم)

مکروہ تنزیہی کا ارتکاب کیا ہو۔ اس کی تھوڑی سی سرزنش کی جائے گی بشرطیکہ وہ ایسے لوگوں میں ہو جس پر سرزنش کرنا کوئی معنی رکھتا ہو، خاص طور پر اس صورت میں جب وہ اس مکروہ کا ارتکاب بار بار کرے۔ مگر ایسے آدمی کے فعل کو شدید منکر قرار دینا تو دور کی بات ہے، اسے منکر کہنا بھی مناسب نہیں۔

اسی طرح یہ بات بھی جائز نہیں ہے کہ لوگ مکروہات کے خلاف تو مسلح جہاد کریں مگر خود صریح حرام میں مبتلا ہوں۔

❖❖❖

16/12/15

۹

اصلاح میں ترجیحات

نظام سے پہلے فرد کی اصلاح

اصلاح کے میدان میں اہم ترین ترجیحات میں سے ایک یہ ہے کہ معاشرے کی تعمیر سے پہلے فرد کی تعمیر کا اہتمام کریں۔ دوسرے الفاظ میں نظام اور اداروں میں انقلاب سے پہلے فرد میں انقلاب لانا ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ اسے ہم قرآن کے الفاظ میں بیان کردیں جس نے فیصلہ ہی کردیا ہے کہ کوئی بھی انقلاب ہو اس کے لیے نفس کی تبدیلی ضروری ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (الرعد ۱۳:۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔

یہ ہر اصلاح، ہر تبدیلی اور ہر اجتماعی تعمیر کی بنیاد ہے۔ فرد پوری عمارت کی بنیاد ہے۔ اس لیے آغاز یہیں سے کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک اچھی اور مضبوط عمارت کا تصور نہیں کیا جاسکتا اگر اس کی اینٹیں بوسیدہ اور خراب ہوں۔

معاشرے کی دیوار میں فرد سب سے پہلی اینٹ ہے۔ اس وجہ سے فرد کی اصلاح اور اس کی ایک حقیقی مسلمان کے طور پر کامل اسلامی تربیت کے لیے جو بھی کوششیں کی جائیں اس کی دوسری چیزوں پر ترجیح ہے۔ کیوں کہ یہ ہر قسم کی اصلاح اور تعمیر کے لیے ایک ضروری تمہید ہے۔ اور اسی کا مطلب نفس کی تبدیلی ہے۔

انسان کی ایک صالح فرد کے طور پر تعمیر انبیا کا کام تھا۔ اور ان کے بعد ان کے خلفا اور

وارثین بھی اسی ذمہ داری پر مامور ہیں۔

انسان کی صحیح تربیت کے لیے سب سے پہلے اس کی بنیاد ایمان پر رکھی جاتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اس کے دل میں درست عقیدے کا پودا لگا دیا جائے۔ یہ عقیدہ دنیا کے بارے میں اور خود انسان کے بارے میں اس کے نظریے کو درست کر دیتا ہے، زندگی کے بارے میں اور اس کے رب کے بارے میں اس کے نظریے کی تصحیح عطا کرتا ہے جو اس کا خالق ہے، جس نے اسے زندگی بخشی ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو اس کے آغاز اور انجام کے بارے میں خبردار کرتا ہے۔ یہ انھیں ان سوالات کا جواب دیتا ہے جو بے دین لوگوں کو ہر وقت پریشان کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ میں کون ہوں؟ میں کہاں سے آیا؟ اور مجھے کہاں جانا ہے؟ میں کس لیے پیدا کیا گیا ہوں؟ زندگی اور موت کیا ہیں؟ زندگی سے پہلے کیا تھا؟ اور موت کے بعد کیا ہوگا؟ زمین کے اس سیارے میں سمجھ بوجھ کی عمر سے لے کر مرنے تک میرا کیا پیغام ہے؟

ایمان اور صرف ایمان ہی ہے جو انسان کو اس کے انجام کے حوالے سے ان بڑے سوالات کا شافی جواب دیتا ہے۔ وہ زندگی کا ایک ہدف، اس کی ایک قیمت اور ایک معنی متعین کر دیتا ہے۔ اس ایمان کے بغیر انسان عالم وجود کا ایک حیران و پریشان ذرہ یا ایک بے وقعت مادہ ہے۔ نہ حجم کے لحاظ سے یہ اس عظیم کائنات کے بڑے مجموعوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت رکھتا ہے اور نہ عمر کے لحاظ سے یہ جیالوجی کے لمبے لمبے زمانوں اور مستقبل کے لا انتہا ادوار کے مقابلے میں کوئی وقعت رکھتا ہے۔ نہ اس کے پاس وہ قدرت ہے جس کے ذریعے وہ کائنات کے ان حوادث کا مقابلہ کر سکے جنھیں وہ ہر وقت دیکھتا رہتا ہے۔ جیسے زلزلے، آسمانی بجلیاں، آندھی اور طوفان اور سیلاب جو ہر چیز کو تہ و بالا کر دیتے ہیں اور بہت سوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ مگر انسان اس کے سامنے عاجز ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہ جاتا ہے، باوجودیکہ اس وقت انسان کے پاس سائنس ہے ارادہ ہے اور ترقی یافتہ ٹیکنالوجی ہے۔

ایمان ہمیشہ نجات کا طوق ثابت ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے انسان کو اندر سے تبدیل کیا

جا سکتا ہے اور اس طرح اس کے باطن کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ انسانوں کو اسی طرح نہیں چلایا جا سکتا جیسا کہ جانوروں کو چلایا جاتا ہے۔ اسی طرح انسان کو اس انداز میں ڈھالا بھی نہیں جا سکتا جیسا کہ لوہے، تانبے یا چاندی وغیرہ سے مختلف چیزیں بنائی جاتی ہیں۔

یہ انسان کی عقل اور دل میں تحرک پیدا کر دیتا ہے۔ پھر جب اسے قانع کیا جاتا ہے تو وہ قانع ہوتا ہے اور جب اسے ہدایت دی جاتی ہے تو یہ ہدایت لیتا ہے۔ جب اسے ترغیب و ترہیب کی جاتی ہے تو اس پر ترغیب و ترہیب کا اثر بھی ہو جاتا ہے۔ ایمان ہی ہے جو انسان میں حرکت پیدا کرتا ہے اس کا رخ سیدھا رکھتا ہے اور اس کے اندر عظیم صلاحیتیں پیدا کرتا ہے جو اس کے بغیر ظاہر نہیں ہو سکتی تھیں۔ بلکہ وہ اسے ایک نیا جنم دے دیتا ہے، اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دیتا ہے۔ اس میں نئی عقل، نیا عزم اور نیا فلسفہ عنایت کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم فرعون کے ساحروں کے بارے میں دیکھتے ہیں۔ وہ جب موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آئے تو انھوں نے فرعون کے جبر و تکبر کو چیلنج کرتے ہوئے بڑی جرأت و شجاعت کے ساتھ اس سے کہا:

فَاقْضِ مَآ أَنْتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَاo (طٰہٰ ۲۰:۷۲)

تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے۔ تو زیادہ سے زیادہ بس اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

اسی طرح ہم نے نبی پاک ﷺ کے صحابہ میں بھی یہ شان دیکھی۔ ان کو ان کے ایمان نے جاہلیت سے اسلام کی طرف لایا۔ انھیں بتوں کی عبادت اور رِعَایَةُ الْغَنَم [بکریاں چرانے] کے بجائے رِعَایَةُ الْأُمَم [قوموں کی قیادت کرنے] کا مقام عطا کیا۔ اب وہ انسانیت کو اللہ کی ہدایت کی طرف دعوت دیتے رہے اور انھیں اندھیرے سے روشنی کی طرف نکالتے رہے۔

نبی ﷺ نے مکہ میں ۱۳ سال گزارے۔ اس دوران آپ کی ساری جدوجہد اسی بنیاد پر تھی اور دعوت و تبلیغ کا سارا دارومدار اسی پر تھا کہ پہلی مسلمان نسل کو ایمان کے ذریعے تربیت دی جائے۔

یہ سارا دور ایسے گزرا کہ اس میں کسی قسم کے قوانین نازل نہیں ہوئے جو معاشرے کو منظم کرتے ہیں اور لوگوں کے گھریلو اور معاشرتی تعلقات کو منضبط کرتے ہیں، یا انحراف کرنے والوں کے لیے راہ راست پر آنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس عرصے میں قرآن اور رسول کا کام یہ تھا کہ انسان کی تربیت کرے اور صحابہ کی اس نسل کی تعمیر کرے۔ اس تربیت اور تنظیم کا مقصد یہ تھا کہ اس کے بعد وہ پورے جہان کی تربیت اور تنظیم کرے۔

اس میں دارارقم بھی اپنی ذمہ داری انجام دے رہا تھا۔ قرآن پاک بھی اس مومن جماعت کی تربیت اور اس کے حسن کردار اور پختگی رفتار میں اپنا عظیم کردار ادا کر رہا تھا، جو رسول اللہ ﷺ پر واقعات اور حالات کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہو رہا تھا، تاکہ رسول اللہ ﷺ اسے لوگوں کے سامنے ٹھیر ٹھیر کے پڑھ کر سنائیں، اس طرح آپ ﷺ کا دل بھی اس پر جما رہے اور ان لوگوں کا بھی جو اس پر ایمان لا چکے ہیں، نیز آپ ﷺ اس کے ذریعے مشرکین کے سوالات کا جواب دیں اور ان کے خیالات پر تنقید کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ٥ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۰۶)

اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھیر ٹھیر کر اسے لوگوں کو سناؤ، اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ٥ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ٥ (الفرقان ۲۵:۳۲-۳۳)

منکرین کہتے ہیں: اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟ ہاں، ایسا اس لیے کیا گیا کہ اس کو اچھی طرح ہم تمھارے ذہن نشین کرتے رہیں اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزا کی شکل دی ہے۔

اس وقت ہمارے کرنے کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ اپنی حالت درست کریں اور اس کے لیے ایک درست آغاز کریں۔ یہ اس طرح ہوگا کہ ہم فرد کی تعمیر کریں۔ ظاہری تعمیر نہیں بلکہ حقیقی تعمیر۔ اس کی عقل، روح، جسم اور اخلاق کی تعمیر۔ متوازن تعمیر، جس میں کمی بیشی نہ ہو۔ ہم اس کو عقلاً علم سے، روحاً عبادت سے، جسماً ورزش سے اور اخلاقاً فضائل سے تعمیر کریں۔ اسے عسکری طور پر سختی سے، معاشرتی طور پر میل جول سے اور سیاسی طور پر سمجھ داری کے ذریعے تربیت یافتہ بنائیں۔ ہم اس کو بیک وقت دین اور دنیا دونوں کے لیے تیار کریں۔ وہ خود بھی نیک بنے اور دوسروں کی اصلاح بھی کرے، تاکہ وہ دنیا اور آخرت میں نقصان سے بچے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورۂ عصر میں فرماتا ہے:

وَالْعَصْرِ ٥ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ٥ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ٥ (العصر ۱۰۳:۱-۳)

زمانے کی قسم! انسان درحقیقت خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

اور یہ کام اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ نظام کائنات کا ایک کلی تصور، زندگی کا ایک واضح فلسفہ، تہذیب و تمدن کا ایک مکمل منصوبہ پیش کیا جائے جس پر یہ امت ایمان رکھتی ہو اور ہمارے بیٹوں اور بیٹیوں کو اس پر یقین کرنے، اس کی حکمتوں کے مطابق کام کرنے، اور اس کے منہج پر چلنے کی تربیت دیتی ہو۔ سارے ادارے: جامع مسجد اور یونیورسٹی، کتاب اور اخبار، ٹی وی اور ریڈیو اس پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ان میں سے ایک ادارہ مشرق کی طرف لے جائے اور دوسرا مغرب کی طرف اور ایک ادارہ کوئی ڈھانچہ بنائے اور دوسرا اسے منہدم کر دے۔ آج کل تو ہم پر کسی قدیم شاعر کی یہ بات صادق آتی ہے کہ

وَهَلْ يَبْلُغُ الْبُنْيَانُ يَوْمًا تَمَامَهٗ   اِذَا كُنْتَ تَبْنِيْهِ وَغَيْرُكَ يَهْدِمُ؟!

کیا وہ عمارت کبھی مکمل ہو سکے گی، جسے آپ تعمیر کرتے رہیں اور کوئی دوسرا اُسے ڈھاتا رہے؟

● جہاد سے پہلے تربیت

یہ وہی چیز ہے جس نے حقیقی داعیوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ تربیت کو جہاد پر مقدم سمجھتے ہیں اور تنظیم کو اقتدار پر۔

تربیت اور تنظیم سے ہماری مراد ایک انسانِ مومن کی تعمیر ہے جو دعوت کا بوجھ اٹھا سکے اور پیغام اسلام کی ذمہ داریوں کو انجام دے سکے۔ وہ نہ مال پر بخل کرے اور نہ جان سے دریغ کرے۔ وہ اللہ کی راہ میں پہنچنے والی مصیبتوں کی کوئی پروانہ کرے۔ اس کے ساتھ وہ علمی نمونہ بھی ہو جس میں اس کے دینی اقدار اور اس کے دعوتی اخلاقیات مجسم ہو کر سامنے آئیں۔ جس میں لوگ چلتا پھرتا اسلام محسوس کریں۔

اس طرح کے انسان کی تعمیر، اس کی تربیت اور اس کی تنظیم ہمیشہ ایک مطلوب امر رہا ہے۔ لیکن اس کی سب سے زیادہ ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب کسی نئے دین کی تاسیس پیش نظر ہو یا کوئی نیا پیغام لے کر ایک نئی اُمت وجود میں آ رہی ہو۔ اسی طرح اس وقت بھی اس کی ضرورت شدید ہوتی ہے جب کوئی دین کمزور ہو جائے اور اس کی علمبردار امت وہن کی شکار ہو جائے اور پھر اس دین کو تجدید اور اس کی علمبردار قوم کو احیا کی ضرورت ہو۔ اس لیے تجدید واحیا اور اصلاح کے لیے ایک ضروری آغاز کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اور وہ آغاز ہے ایک نئی نسل کی تیاری جو اس قوم کے لیے ہراول دستے کا کام دے سکے۔

انسان کی یہ تعمیر اور تنظیم ـــــ ایک حقیقی مسلمان نسل کی صورت میں، جو اس بات کی اہل ہو کہ اصلاح اور انقلاب کی ذمہ داری اس پر ڈال دی جائے ـــــ اس وقت سے پہلے پہلے ضروری ہے جب کوئی تحریک اپنے کارکنوں کو معاشرے میں انقلاب برپا کرنے اور ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے مسلح جہاد کا حکم دے۔

اسی بنا پر مکی سورتوں کا کام پورے تیرہ سال تک یہی رہا کہ اس انسان کی تعمیر کرے اور

ایک ایسی نسل تیار کرے جو ہراول دستے کا کام دے، ایسی کامل تربیت جو اس کے ایمان، اخلاق اور عقل سب پر حاوی ہو۔ اس نسل کی کامل مثال خود رسول اللہ ﷺ ہیں:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ο (الأحزاب ۳۳:۲۱)

درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا۔

مکی دور میں قرآن کا کام یہ تھا کہ عقیدے کی بنیاد مضبوط کی جائے، فضائل کو مستحکم کیا جائے، مکارم اخلاق کی تعلیم دی جائے، صحیح غور وفکر اور درست تحقیق وتفتیش کے لیے طریق کار مقرر کیا جائے، باطل عقائد کو مٹا دیا جائے، برائیوں کی بنیادیں اکھاڑ دی جائیں اور فکر و کردار میں اس کے برے اثرات کا راستہ بند کر کے انسان کا اس کے رب کے ساتھ ایسا تعلق قائم کیا جائے جس کی کڑیاں کبھی نہ ٹوٹ سکیں۔

سورۂ مزّمّل جو قرآن کی 'شروع شروع میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَآيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ο قُمِ الَّيْلَ إِلَّا قَلِيْلًا ο نِّصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ο أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ο إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (المزّمّل ۷۳:۱-۵)

اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات، یا اس سے کچھ کم کر لو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو، اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔

یہ گہری تربیت جو رات کے مدرسے میں دی جا رہی تھی اور قرآن کے نصاب کے ذریعے دی جا رہی تھی یہ اس بھاری کلام کو اٹھانے کی تیاری تھی جس کا انھیں انتظار تھا۔ اس کلام کا بھاری ہونے کی وجہ یہی تھی کہ وہ امانت بڑی بھاری تھی جس سے یہ کلام تعبیر کرتا تھا۔

قرآنی آیتیں اسی طریق کار پر نازل ہوتی رہیں کہ وہ عقائد اور مفاہیم کا بیج بوتی رہیں

اور اقدار وفضائل کو کاشت کرتی رہیں۔ وہ عقل اور دل کو جاہلیت کی نجاست سے پاک کرتی رہیں اور ایمان کے معانی سے ان کی تربیت کرتی رہیں۔ وہ اس میں ایسے مطالبے اور اقدار اُجاگر کرتی رہیں جو ان کو صبر واستقامت، ثابت قدمی، حق کے غلبے کے لیے قربانی اور باطل کے خلاف جہاد پر آمادہ کریں۔ وہ عقل کو آباواجداد یا گم راہ لیڈروں کی اندھی تقلید سے پاک کرتی رہیں۔ اس قسم کے مضامین پر مشتمل آیتیں نازل ہوتی رہیں قبل اس کے کہ مسلح جہاد اور شرک کے علمبرداروں کے خلاف خون ریز کش مکش کا حکم دینے والی ایک بھی آیت نازل ہوتی۔

بلکہ بعض صحابہ مار پیٹ اور زخم کھا کر آپ ﷺ کے پاس آتے اور آپ ﷺ سے شکایت کرتے رہتے کہ یہ ہمارے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ وہ یہ مطالبہ کرتے کہ انھیں اپنے دفاع کے لیے اپنے اور دین کے دشمنوں کے مقابلے میں تلوار اٹھانے کی اجازت دی جائے۔ مگر نبی ﷺ ان کو وہی بات کہتے تھے جو قرآن نے ان الفاظ میں نقل کی ہے:

كُفُّوٓا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ۝ (النساء ۴:۷۷)

اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم جہاد کی اہمیت کم کررہے ہیں۔ وہ تو اسلام کا چوٹی کا عمل ہے، مگر ہماری گفتگو ترجیحات کے بارے میں ہے اور یہاں ترجیح تربیت اور تنظیم کو حاصل ہے۔

حسن تربیت میں سے یہ بھی ہے کہ نفس کو جہاد کا وقت آنے کے لیے تیار کیا جائے، جیسا کہ سورۂ مزمل میں حکم دیا گیا ہے:

عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَاٰخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ (المزمل ۷۳:۲۰)

اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں، اور کچھ اور اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔

جس جہاد کو مؤخر کیا گیا ہے وہ صرف وہی جہاد ہے جو مسلح ہو اور تیر وتفنگ کے ساتھ ہو۔ رہا دعوت وبیان یا قرآن کا جہاد تو وہ ہر وقت مطلوب اور پہلے ہی دن سے جاری ہے۔ سورۂ فرقان جو ایک مکی سورت ہے اس میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرماتے ہیں:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيرًا. (الفرقان ۲۵:۵۲)

پس تم کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے خلاف زبردست جہاد کرو۔

اسی طرح صبر وثبات کا جہاد اور دعوت الی اللہ کے راستے میں تکلیفیں اٹھانے کا جہاد تھا جسے سورۂ عنکبوت کی ابتدائی آیات نے اجاگر کیا ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوٓا أَنْ يَقُولُوٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِينَ ...... وَمَنْ جٰهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ. (العنکبوت ۲۹:۲-۶)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ’ہم ایمان لائے‘ اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمایش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون!..... اور جو شخص بھی مجاہدہ کرے گا اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا۔ اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے۔

ہم جس تربیت کی بات کررہے ہیں وہ اسی نوع میں داخل ہے اور یہ بھی جہاد ہی ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے سنت نبوی میں جہاد کے تیرہ مراتب بیان کیے ہیں۔ ان میں سے چار مراتب نفس کے خلاف جہاد کے بارے میں ہیں، دو شیطان کے خلاف جہاد کے بارے میں، تین ظلم وبدعت اور منکرات کرنے والوں کے خلاف جہاد کے بارے میں اور چار مراتب کفار کے خلاف جہاد کے بارے میں ہیں۔ کفار کے خلاف جہاد کے مراتب’ جہاد بالقلب، باللسان،

بالمال اور بالنفس یا بالید ہیں۔ ان میں سے آخری مرتبے کو بعض اوقات موٴخر کیا جاتا ہے۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چونکہ افضل جہاد یہ ہے کہ حق بات کہی جائے خواہ اس کے راستے میں کتنی سخت رکاوٹیں موجود ہوں، مثلاً یہ کہ آپ یہ کلمہ حق ایسے شخص کے سامنے ادا کریں جس کی طرف سے سزا اور تکلیف کا خطرہ ہو، اس وجہ سے انبیا علیہم الصلاۃ والسلام کا اس میں بڑا حصہ تھا خصوصاً ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس سلسلے میں جہاد کا پورا پورا حق ادا کیا۔

اور چونکہ نفس سے باہر خدا کے دشمنوں کے خلاف جہاد انسان کے اپنے نفس کے خلاف اللہ کی خاطر جہاد کی فرع ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللّٰهِ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَانَهَى اللّٰهُ عَنْهُ۔[1]

مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دے۔

اس وجہ سے نفس کے خلاف جہاد خارجی دشمنوں کے خلاف جہاد پر مقدم اور اس کے لیے بنیاد ہے۔ اب اگر ایک شخص پہلے اپنے نفس کے خلاف جہاد نہیں کرتا — کہ وہ کام کرے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے اور وہ کام چھوڑ دے جن سے اس کو روکا گیا ہے، اور ان کے خلاف اللہ کی خاطر جنگ کرے — اس کے لیے یہ کیسے ممکن ہو گا کہ وہ خارجی دشمن کے خلاف جہاد کر سکے اور اس کے ساتھ انصاف بھی کر سکے درآنحالیکہ اس کے پہلو میں جو دشمن چھپا ہے وہ اس پر غالب اور مسلط ہے۔ اس کے خلاف اس نے کوئی جہاد نہیں کیا اور اللہ کی خاطر اس سے کبھی نہیں لڑا۔ بلکہ اس کے لیے تو بیرونی دشمن کی طرف جانا بھی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اپنے نفس

۱- اس کو احمد ۶/ ۲۱ نے فضالہ بن عبید سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوبَ. مہاجر وہ ہے جو خطاؤں اور گناہوں کو چھوڑ دے۔ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیے: الإحسان ۴۸۶۲۔ اسے حاکم نے بھی ذکر کیا ہے اور اسے صحیح علی شرط الشیخین کہا ہے۔ ذہبی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

سے نکلنے ہی کے لیے جہاد نہ کرے۔

یہ دو دشمن تو ایسے ہیں جن کے خلاف جہاد کی آزمائش میں تو انسان پھنسا ہوا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک تیسرا دشمن بھی ہے، جس کے خلاف جہاد کیے بغیر ان دونوں سے جہاد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ان دونوں کے سامنے کھڑا ہے اور ان کے خلاف جہاد کے بارے میں انسان کی حوصلہ شکنی کرتا رہتا ہے، اسے پسپا کرتا ہے، اسے خوف زدہ کرتا ہے اور مسلسل اس کے دل میں یہ خیال ڈالتا رہتا ہے کہ ان دونوں کے خلاف جہاد میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، اسے کون کون سی سہولتوں سے محروم ہونا پڑے گا، اسے کون کون سی لذتیں چھوڑنی پڑیں گی، اس بنا پر اس تیسرے دشمن کے خلاف جہاد کے بغیر ان دونوں کے خلاف جہاد نہیں کر سکے گا۔ معلوم ہوا کہ اس کے خلاف جہاد ان پہلے والوں کے خلاف جہاد کی اصل ہے۔

یہ تیسرا دشمن شیطان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا. (فاطر ۳۵:۶)

یقیناً شیطان تمھارا دشمن ہے، تم بھی اس سے دشمنی کرو۔

اس کو دشمن بنانے کا حکم اس بات پر تنبیہ ہے کہ اس کی دشمنی اور اس کے خلاف جنگ میں اپنی پوری قوت صرف کرو۔ یہ ایسا دشمن ہے جو کبھی تھکتا نہیں ہے اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی انسان کے خلاف دشمنی سے کوتاہی نہیں کرتا۔

یہ تین دشمن ہیں جن کے خلاف جہاد اور جنگ کا انسان کو حکم دیا گیا ہے۔ وہ اس دنیا میں ان کے خلاف جنگ کے ذریعے آزمائش میں ہے۔ یہ دشمن اس پر مسلط ہی اسی مقصد کے لیے ہیں کہ اس کی آزمائش کی جائے اور اس کا امتحان لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو آپس میں بھی ایک دوسرے کے لیے فتنہ و آزمائش بنایا ہے تاکہ وہ ان کے حالات جانچے۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے دوست ہوتے ہیں ان کو شیطان اور اس حواریوں کے ذریعے آزمایا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ ان کے خلاف جہاد کرو جیسا کہ جہاد کا حق ہے۔ اسی طرح اس نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔ حق کے ساتھ ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے، اسے یاد رکھا جائے اور بھلایا نہ جائے، اس کا شکر کیا جائے اس کی ناشکری نہ کی جائے۔ کما حقہ جہاد یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کے خلاف جہاد کرے تاکہ وہ اپنے دل، اپنی زبان اور اپنے اعضا کو اللہ کے سپرد کرے۔ اس طرح وہ سارا کا سارا اللہ کا ہو جائے گا اور اللہ کے ذمے ہو جائے گا۔ نہ اپنے نفس کے لیے ہوگا اور نہ اپنے نفس کے ذمے ہوگا۔

انسان کو چاہیے کہ وہ شیطان کے خلاف جہاد کرے: اس کے وعدوں کو جھٹلا کر، اس کی نافرمانی کر کے اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں کا ارتکاب کر کے۔ کیوں کہ وہ لوگوں سے مختلف وعدے کرتا ہے، ان کو غرور دلاتا ہے، ان کو فقر سے ڈراتا ہے، بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور تقویٰ و ہدایت سے، عفت اور صبر سے اور تمام ایمانی اخلاق سے روکتا ہے۔ پس جس نے اس سے جہاد کیا: اس کے وعدوں کو جھٹلا کر اور اس کے حکم کو نہ مان کر، اس میں ان دونوں جہادوں کے بدلے میں وہ قوت پیدا ہو جائے گی اور اسے وہ اختیار اور اقتدار حاصل ہوگا جس کے ذریعے وہ اللہ کے خارجی دشمنوں سے بھی جہاد کر سکے گا، دل سے بھی، زبان سے بھی اور ہاتھ اور مال سے بھی، تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

جب یہ معلوم ہو گیا تو اب جہاد کے چار مراتب ہیں: نفس کے خلاف جہاد، شیطان کے خلاف جہاد، کفار کے خلاف جہاد اور منافقین کے خلاف جہاد۔

● نفس کے خلاف جہاد کے بھی چار مراتب ہیں: ایک یہ ہے کہ ہدایت اور دین حق کی تعلیم پر مجبور کر کے اس کے خلاف جہاد کرے، کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں اور دنیا و آخرت میں سعادت بھی اس کے علاوہ ممکن نہیں۔ اگر ان چیزوں کا علم ہی آدمی حاصل نہ کر سکا تو وہ دنیا

اور آخرت کی سعادت سے محروم ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ سیکھنے کے بعد اسے عمل پر مجبور کر کے اس کے خلاف جہاد کیا جائے۔ کیوں کہ عمل کے بغیر صرف علم اگر نقصان نہ دے تو نفع بھی نہیں دیتا۔ تیسرا یہ کہ اسے دعوت پر مجبور کر کے اس کے خلاف جہاد کیا جائے۔ ان لوگوں کو تعلیم دیں جو علم کی دولت سے محروم ہیں۔ اگر یہ کام نہیں کریں گے تو ہمارا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو

يَكْتُمُونَ مَآ أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْهُدٰى وَالْبَيِّنٰتِ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَ اللّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ (البقرة ۲:۱۵۹)

[ان ہدایات اور بینات کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے نازل کر دیے ہیں، اور اسے چھپاتے بھی اس وقت ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کتاب میں خوب واضح کیا ہے]

ایسے شخص کو اس کا علم نہ کوئی فائدہ دیتا ہے اور نہ اسے اللہ کے عذاب سے بچاتا ہے۔ چوتھا یہ کہ دعوت الی اللہ کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات پر مجبور کر کے اس کے خلاف جہاد کیا جائے۔ وہ لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف اللہ ہی کی خاطر برداشت کرے۔ اگر اس نے یہ چار مراتب پورے کر لیے تو وہ ربانیین میں شمار ہوگا۔ سلف کا اس بات پر اجماع ہے کہ کسی عالم کو اس وقت تک ربانی نہیں کہہ سکتے جب تک کہ وہ حق کو جان نہ لے، اس پر عمل نہ کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم نہ دے۔ جس نے سیکھا، عمل کیا اور اس کی تعلیم دی تو وہ ملکوت السماوات میں عظیم شمار ہوگا۔

● شیطان کے خلاف جہاد کے دو مرتبے ہیں: ایک جہاد ان شبہات کو رفع کرنا ہے جو شیطان اس کے دل میں ڈالتا ہے اور جو ایمان کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ دوسرا ان غلط ارادوں اور خواہشات کو دفع کرنا جنھیں شیطان اس کے لیے خوشنما بناتا ہے۔ ان میں پہلی قسم کا جہاد یقین کے اسلحے سے ہوگا اور دوسرا صبر کے اسلحے سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيٰتِنَا يُوقِنُونَ.

(السجدۃ ۳۲:۲۴)

اور جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ امامت فی الدین صبر اور یقین کی دولت کے بغیر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ صبر خواہشات اور برے ارادوں کو دفع کرتا ہے اور یقین شکوک وشبہات کے پردے چاک کردیتا ہے۔

● کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کے چار مراتب ہیں: دل سے، زبان سے، مال سے اور جان سے۔ کفار کے خلاف جہاد ہاتھ کے ساتھ مخصوص ہے اور منافقین کے خلاف جہاد زبان کے ساتھ۔

● ظلم وجبر اور بدعات ومنکرات کے خلاف جہاد کے تین مراتب ہیں: ایک ہاتھ سے، جب قدرت ہو، اگر اس کی قدرت نہ ہو تو جہاد باللسان کی طرف آئے گا، اور اگر اس سے بھی عاجز ہو تو پھر دل سے جہاد کرے گا۔ یہ جہاد کے تیرہ مراتب ہوگئے۔ اور نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِالْغَزْوِ، مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنَ النِّفَاقِ.[2]

جو اس حال میں مرا کہ اس نے نہ جہاد کیا نہ اپنے دل میں اس کا خیال لایا تو وہ نفاق کی ایک حالت میں مرا۔

● تربیت کی ترجیح کیوں!

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جہاد پر تربیت کی یہ ترجیح کیوں ہے؟ اس کو ہم چند نکات یا اسباب کی صورت میں واضح کرسکتے ہیں:

۲- اس حدیث کو امام مسلم نے کتاب الإمارۃ [۱۹۱۰] میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: زاد المعاد ۳/۵-۱۱، طبع: مؤسسة الرسالة، تحقیق: شعیب الارناؤوط

● پہلی بات یہ ہے کہ اسلام میں جہاد محض ایک جنگ نہیں ہے بلکہ یہ ایک خاص نیت کے ساتھ ایک خاص مقصد کے لیے جنگ ہے۔ یہ 'فی سبیل اللہ' جہاد ہے۔ نبی ﷺ سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو حمیت یعنی قومی عصبیت کے لیے جنگ کرتا ہے، اور اس شخص کے بارے میں جو اس لیے جنگ کرتا ہے کہ اس کا مرتبہ اونچا ہو یعنی اسے بہادر سمجھا جائے، اور اس شخص کے بارے میں جو غنیمت کے لیے جنگ کرتا ہے۔ پوچھا گیا کہ ان میں سے کون اللہ کی راہ میں ہے؟ تو نبی ﷺ نے فرمایا:

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ. جو شخص اس مقصد کے لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو وہ اللہ کی راہ میں ہے۔●

ہر دنیوی محرک سے پاک اس قسم کا جہاد بلا وجہ حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے طویل تربیت کی ضرورت ہے تاکہ آدمی کا دین اللہ کے لیے خالص ہو اور اللہ تعالیٰ بھی اسے خالص اپنے دین کے لیے چن لے۔

● دوسری بات یہ ہے کہ ایک مسلمان مجاہد دنیا میں جہاد کے جس پھل کی امید رکھتا ہے وہ فتح ونصرت اور اقتدار ہوتا ہے اور یہ اقتدار اس وقت تک اپنا پھل نہیں دیتا جب تک کہ وہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو مومنین صادقین ہوں، اقتدار کے مستحق ہوں اور اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ (الحج ۲۲:۴۰-۴۱)

اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقت ور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔

● اس حدیث کو احمد اور صحاح ستہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۶۴۱۷۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا. (النور ۲۴:۵۵)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے، اور ان کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

وہ لوگ جو تربیتی پختگی سے پہلے فتح اور اقتدار حاصل کرتے ہیں وہ اصلاح کے مقابلے میں فساد زیادہ کرتے ہیں۔

● تیسری بات: اللہ کی سنت ہے کہ یہ اقتدار اس سے پہلے موجود نہیں ہوتا کہ اس کے علمبردار آزمایش کی بھٹی میں پگھلائے جائیں اور مشکلات اور تکلیفیں ان کو صیقل بنادیں تاکہ اللہ ان کے سینوں کو آزمائے اور ان کے دل کے خیالات کی چھانٹی کرلے اور خبیث کو طیب سے الگ کرلے۔ یہ عملی تربیت کا ایک رنگ ہے جو ہر دور میں انبیا اور دوسرے داعیان کا طریق کار رہا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ ایک مومن کے لیے آزمایش اور اقتدار میں سے کون سی چیز بہتر ہے؟ انھوں نے جواب دیا: کیا آزمایش سے پہلے اقتدار ممکن بھی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی پہلے آزمایا اور پھر اقتدار عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ (یوسف ۱۲:۵۶)

اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ

اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے۔

وہ اقتدار جو آسانی سے حاصل ہو اور اس کے ثمرات قریب میں حاصل ہوں اس کے بارے میں خطرہ ہوتا ہے کہ اسے لوگ ضایع کردیں یا اس کے ثمرات میں حد سے آگے بڑھیں۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ہوگا اگر وہ اس کے لیے اپنی جان، مال اور آرام و راحت کو قربان کردیں، اس کے راستے میں انھیں تکالیف اٹھانی پڑیں اور ان کو سختیاں جھیلنی پڑیں، یہاں تک ان کو ہلا کر رکھ دیا جائے اور آخرکار اللہ کی نصرت آجائے۔

فکری جنگ کی ترجیح

اصلاح کے میدان میں اس طرف بھی نظر پھیرنے کی ضرورت ہے کہ ہر اس چیز کو مقدم رکھا جائے جس کا تعلق فکر کی درستی، نظریے کی صحت اور عمل کے نتیجہ خیز ہونے کے ساتھ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ہر مطلوبہ اصلاح کے لیے ایک قوی بنیاد ہے۔ کیوں کہ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کہ درست طریق کار کے ساتھ صحیح عمل کیا جائے اور اس کی بنیاد جس فکر پر ہے وہ درست نہ ہو۔ شاعر کہتا ہے ع: مَتٰی یَسْتَقِیْمُ الظِلُّ وَالْعُوْدُ أَعْوَجُ ؟ اگر لکڑی ٹیڑھی ہو تو اس کا سایہ کیسے سیدھا ہو سکتا ہے؟

جس کا کسی معاملے میں تصور ہی غلط ہو تو اس سے جو توقع کی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ اس معاملے میں اس کا کردار بھی غلط ہی ہوگا۔ کیوں کہ کردار حسن و قبح میں اپنے تصور کا تابع ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے فکری معرکہ جو ٹیڑھے افکار کو سیدھا اور غلط مفاہیم کو درست کرتا ہے وہ ترجیح رکھتا ہے اور اس کو دوسروں پر مقدم رکھنے کا حق ہے۔ یہ قرآن کے ذریعے جہاد کبیر کی ایک قسم ہے۔ جو سورۂ فرقان میں مذکور ہے جو مکی سورت ہے۔ اسی طرح یہ جہاد باللسان بھی ہے جسے حدیث نبوی نے بیان کیا ہے:

جَاهِدُوا الْمُشْرِكِيْنَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ [۳] مشرکین سے جہاد کرو اپنے مال، جان اور زبان کے ساتھ۔

۳- اس حدیث کو احمد ۳/ ۱۲۴، ۱۵۳، ابوداؤد ۲۵۰۴، نسائی ۶/ ۷، دارمی ۲: ۲۱۳، ابن حبان ۱۱/ ۴۷۰۸، اور حاکم ۲/ ۸۱ نے نقل لیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح علی شرط مسلم کہا ہے اور ذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔

● مسلمانوں کا باہمی فکری معرکہ

فکری معرکے کے دو بنیادی میدان ہیں:

● ایک مسلمان حلقے کے باہر، یعنی الحاد و دہریت کے خلاف، عیسائی مشنریوں اور مستشرقین کے خلاف جو اسلام پر کھلم کھلا حملہ آور ہیں اور عقیدے، قانون، ثقافت، تہذیب کے خلاف میدان میں ہیں۔ وہ اسلام کی بنیاد پر اٹھنے والی کسی بھی تحریک اور بیداری کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔

● دوسرا خود مسلمان حلقے کے اندر، جس کا مقصد مسلمان مذہبی تنظیموں کے لیے رخ کی درستی، ان کے سفر کو صحیح راستے پر جاری کرنے اور ان کی حرکت کو غلطی سے بچانے کی کوشش کرنا ہے تاکہ وہ ایک صحیح ہدف کے لیے صحیح راستے پر اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ ہم اپنی گفتگو اسی حد تک محدود رکھیں گے۔ کیوں کہ داخلی اصلاح اصل بنیاد ہے اس کو ترجیح حاصل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں کئی قسم کے دھارے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

● خرافاتی دھارا

خرافاتی رخ یا دھارا وہ ہے جو ایسی بنیادوں یا خواص پر قائم ہے جن میں وہ منفرد ہوتا ہے۔ ان میں سے چند خواص یہ ہیں:

ا- عقیدے میں اوہام

ب- عبادت میں بدعت

ج- فکر میں جمود

د- فقہ میں تقلید جامد

ہ- کردار میں منفی تأثر

و- سیاست میں مداہنت اور ہم نوائی

● حرفی دھارا

ایک رخ اور دھارا حرفی ہے۔ یہ دھارا اگرچہ دین کے معاملے میں بڑا سخت ہے اور اس کے دفاع میں شدت سے کام لیتا ہے، مگر اس کے کچھ خصائص بھی ہیں جو اس کے پیروکاروں میں غالب ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے ان کو بھی ایک تفرد حاصل ہے۔ ان کے چند خصائص یہ ہیں:

ا- عقیدے میں جھگڑالو پن

ب- عبادت میں شکل پرستی

ج- فقہ میں ظاہریت

د- اہتمام میں جزویت

ہ- روح میں خشک مزاجی

و- دعوت میں کھردرا پن

ز- اختلاف میں تنگ نظری

● انکار و تشدد کا دھارا

ایک دھارا ایسا ہے جو پورے معاشرے اور اس کے تمام اداروں سے انکار کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس کے بھی اگرچہ بعض افراد جرأت اور اخلاص میں ثانی نہیں رکھتے مگر اس دھارے کی بھی کچھ خصوصیات ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

ا- دین پر عمل کرنے میں شدت اور حتمیت

ب- فرد کی اتنی اہمیت، جو اسے معاشرے پر فوقیت دینے کا ذریعہ بنے

ج- اپنے علاوہ سب پر بدگمانی

د- دین کے فہم اور زمینی حالات اور کائناتی و معاشرتی حقائق کی سمجھ میں افق کی تنگی

ہ- وقت سے پہلے چیز کے حصول میں جلد بازی

و- کسی قسم کے تحفظات کے بغیر کفر کے فتوے میں جلد بازی

ز- قوت کو اہداف کے حصول کا ذریعہ سمجھنا

● اعتدال پسند دھارا

ایک اعتدال پسند دھارا ہے جو دین کے فہم، زندگی کی ضروریات اور دینی اقتدار کے لیے توازن اور اعتدال پر قائم ہے۔ اس کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر وہ دوسروں سے ممتاز ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ درج ذیل مبادی پر توجہ مرکوز کرتا ہے:

ا- دین کی ایسی سمجھ جس میں جامعیت بھی ہو، توازن بھی اور گہرائی بھی

ب- بغیر کسی لاپروائی یا خوف زدگی کے، زندگی کے حقائق کی سمجھ

ج- اللہ کی سنتوں اور اس کے ان قوانین کی سمجھ جو بدلتے نہیں، خصوصاً انسانی معاشرت کے بارے میں اللہ کی سنت کی سمجھ

د- مقاصد شریعت کی سمجھ اور ان کے ظاہر پر جمود اختیار کرنے سے اجتناب

ہ- ترجیحات کی سمجھ جو موازنات کی سمجھ سے تعلق رکھتی ہے۔

و- اختلاف کی سمجھ اور دوسری اسلامی تنظیموں کے ساتھ اختلاف کے آداب کا لحاظ (متفقات میں تعاون اور مختلفات میں تسامح)

ز- سلفیت اور جدیدیت (یا اصالت و معاصرت) کا اجتماع

ح- شریعت کے مسلّمات اور زمانے کی تبدیلیوں میں توازن

ط- اس بات پر ایمان کہ فکری، نفسیاتی اور اخلاقی تبدیلی ہی تہذیبی انقلاب کی بنیاد ہوتی ہے

ی- اُمت کی نشأۃ ثانیہ اور انسانیت کو جدید معاشی فلسفوں کی چنگل سے چھڑانے کے لیے

اسلام کو ایک کامل تہذیبی پروگرام کے طور پر پیش کرنا

ک- فتویٰ میں تیسیر اور دعوت میں تبشیر کا طریق کار اپنانا

ل- اسلام کے سیاسی اور معاشرتی اقدار، جیسے: آزادی، احترام، شوریٰ، عدل اجتماعی، اور حقوق انسانی کو اُجاگر کرنا

م- دوسروں یعنی غیر مسلم مخالفین یا روحانیت سے محروم اور عقلیت پرست مسلمانوں کے ساتھ اچھے طریقے سے مکالمہ

ن- مسلمانوں کے مقدسات اور ان کے ممالک کے دفاع کے لیے جہاد کو ذریعہ بنانا

یہ وہ دھارا ہے جس پر ہم یقین رکھتے ہیں اور اس کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ اسلام کی اصل تعبیر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے، جیسا کہ اس کے رسول ﷺ نے اپنی سنت وسیرت میں اس کی طرف ہدایت دی ہے، جیسا کہ اسے خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اسے عملی کر دکھایا ہے اور جیسا کہ ان کے تابعین باحسان اور امت کے خیر القرون نے اسے سمجھا ہے۔

● اعتدال پسند دھارے کا فرض

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ دھارا اُمت کی امیدوں کا مرکز ہے جس کی طرف کل کے لیے نگاہیں اٹھتی ہیں اور اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی دعوت کو نمایاں کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کوششیں صرف کرے۔ وہ اپنے کارکنان کی تربیت کرے، اپنے مدمقابل کو قانع کرے، اپنے مخالفین کے ساتھ مکالمہ کرے اور اس جال سے بچ نکلنے کی کوشش کرے جو اُس کے لیے نصب کیا گیا ہے اور جس کے ذریعے اسے ایسے کاموں میں مبتلا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو انھیں ناپسند ہے اور جس کا وہ ارادہ نہیں رکھتا۔

اب یہ بات بے شمار دلائل سے ثابت ہو چکی ہے کہ داخلی اور خارجی مخالف طاقتیں اس

دھارے سے دوسروں کی نسبت زیادہ خوف کھاتی ہیں، بلکہ اسے ناپسند کرتی ہیں اور اس کے ساتھ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دشمنی رکھتی ہیں۔

اس سے پہلے وہ تشدد اور انتہاپسندی کے دھارے سے لوگوں کو ڈراتے تھے مگر اب ایک اور ترانہ گایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ’اعتدال پسند اسلام سے بچ کر رہو، کیوں کہ یہ دوسروں کی نسبت زیادہ خطرناک ہے‘۔

دوسرے دھاروں کی طبعی عمر اتنی زیادہ نہیں ہوتی اور وہ زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتے۔ مگر یہ دھارا مسلسل جاری رہتا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا اعتدال محفوظ نہیں ہوتا۔ اس کا آغاز اعتدال سے ہوتا ہے اور پھر انتہاپسندی پیدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں انتہاپسندی خود اسلام میں چھپی ہوئی ہے۔

یہیں سے انھوں نے لوگوں کو ’پیش قدمی کرنے والے اسلام‘ سے ڈرانا شروع کیا ہے اور اسے وہ ’سبز خطرہ‘ کا نام دیتے ہیں۔ وہ اس کو ’سرخ خطرے‘ کی جگہ اپنا نیا دشمن گردانتے ہیں، وہ سرخ خطرہ جو پورے یورپ میں اشتراکیت کے زوال کے ساتھ زوال پذیر ہوا۔ لیکن اس بات کا خود ان کے منصف مزاج لوگوں نے جواب دیا ہے اور انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلامی خطرہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ یہ محض وہم ہے۔

اعتدال پسند دھارے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود اسلامی ممالک میں مغرب کے آلہ کار اور ان کے شاگردوں کا سامنا کرے جن کے نام تو مسلمانوں کے ہوتے ہیں مگر وہ پوری قوت سے اسلام کے تہذیبی پروگرام کی مخالفت کرتے ہیں اور امت اور دین کے دشمنوں کی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں رسول کریم ﷺ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ متفق علیہ حدیث میں فرماتے ہیں کہ یہ لوگ: دُعَاةٌ عَلَى أَبْوَابِ جَهَنَّمَ، مَنْ أَجَابَهُمْ إِلَيْهَا قَذَفُوهُ فِيهَا [جہنم کے دروازوں میں کھڑے اس کی طرف دعوت دینے والے ہیں،

جس نے ان کی پیروی کی وہ اسے جہنّم میں پھینک دیں گے] کسی نے کہا: یارسول اللہ! ان کی کوئی صفت بیان کیجیے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

هُمْ مِنْ جَلْدَتِنَا وَيَتَكَلَّمُونَ بِأَلْسِنَتِنَا .وہ ہم ہی میں ہوں گے اور ہماری ہی زبان بولتے ہوں گے۔[4]

اس بنا پر ان لوگوں کا مقابلہ ضروری ہے۔ یہ امت میں فساد برپا کرتے ہیں، اسے اپنی حقیقت اور اپنے اصل نصب العین سے برگشتہ کرتے ہیں، اس کو میٹھے شہد اور بھوک دلانے والی مرغن غذاؤں کی صورت میں زہرِ ہلاہل پلاتے ہیں۔ وہ اخبارات ورسائل کے ذریعے، ریڈیو، ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعے نوجوان نسل کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہماری نئی نسل کی عقل وفکر کا وہی حشر کررہے ہیں جو مہلک وبائیں جانداروں کے جسم کے ساتھ کرتی ہیں۔

ہماری قوم کے یہ 'مستغربین' استعماری افکار رکھتے ہیں۔ یہ کام وہ اس وقت سے کررہے ہیں جب استعمار نے اپنا بوریا بستر گول کرکے ہمارے ملکوں سے رحلت کی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مستشرقین اور عیسائی مشنریوں کے برے سے برے افکار اپنے ذہنوں میں پالتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنھوں نے ہماری تہذیب کے لیے ایک دن بھی اپنے دل میں اخلاص پیدا نہیں کیا۔ اگر کسی نے اخلاص کیا بھی ہے تو اسے اس تہذیب کے صحیح فہم کے لیے مواد فراہم نہیں ہوسکا اور اسے اس تہذیب کے اصل سرچشموں اور اصل ورثے سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا جن میں سب سے اہم زبان ہے۔

ہمارا اصل معرکہ جو خود ہمارے ممالک میں ہمیں درپیش ہے ان لوگوں کے خلاف ہونا چاہیے جو حقیقتاً حد سے آگے بڑھنے والے ہیں، خواہ وہ سیکولر طبقہ ہو یا وہ مارکس ازم کے بقایا میں سے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اب لبرل ازم کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے اور انھوں نے اپنے قلم، زبان اور ہر قسم کے اسلحے کو اسلامی بیداری اور امت کی نشاۃ ثانیہ کے خلاف جنگ میں جھونک دیا ہے۔

۴۔ متفق علیہ بروایت حضرت حذیفہؓ، دیکھیے: اللؤلؤ والمرجان۔

وہ اس کے داعیوں کے بارے میں تشویش پیدا کرتے ہیں اور لوگوں کو ان سے متنفر کرنے کے لیے نئی نئی اصطلاحات وضع کرتے ہیں، جیسے: سیاسی اسلام اور بنیاد پرستی وغیرہ۔ یہ لوگ اسلام پسندوں اور حکمران طبقوں کے درمیان اختلاف پیدا کرتے ہیں اور ملکی قوت کو ایسے خون ریز جھگڑوں میں ضایع کرتے ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ وہ نئی صورت میں نئے نام سے پھر شروع ہوجائیں۔

معرکے کو اس رخ پر لے جانے کے لیے جو بھی کوشش کی جائے گی اور خود اسلام پسندوں کے درمیان میں جو بھی دشمنی پیدا کی جائے گی ـــــ جن کے درمیان یا تو فقہی اور فروعی مسائل میں اختلاف ہوتا ہے، یا بعض عقائد میں، یا ترجیحات عمل میں، یا پھر مختلف جزوی مسائل کے حوالے سے نقطہ نظر میں ـــــ تو یہ ایک خطرناک قسم کی غفلت ہوگی۔ یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ ہم نے اپنے اصل دشمن کو نہیں پہچانا جو ہم سب کا مشترکہ دشمن ہے اور وہ ہمیں ایک دوسرے سے ٹکرانا چاہتا ہے۔ وہ پہلے ان کو الگ الگ کرنا چاہتا ہے اور پھر آخری فیصلہ کن وار میں ان سب کو نشانہ بنائے گا۔ اسلام پسندوں میں اگر کوئی یہ کام لاعلمی میں کرتا ہے تو یہ 'ایک' مصیبت ہے کیوں کہ اس مسئلے سے لاعلمی بھی ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ اور ان میں سے کوئی یہ جانتے ہوئے اس طرح کا کام کرتا ہے تو یہ زیادہ بڑی مصیبت ہے اور اس کا خطرہ بھی بڑا ہے۔ کیوں کہ یہ اسلام کے ساتھ، اس کی امت اور اس کی بیداری کے ساتھ خیانت تصور کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ شاعر پر رحم کرے جو کہتا ہے:

إِذَا كُنْتَ لَاتَدْرِي فَتِلْكَ مُصِيبَةٌ وَإِنْ كُنْتَ تَدْرِي فَالْمُصِيبَةُ أَعْظَمُ

اگر تم نہیں جانتے تو یہ ایک مصیبت ہے، لیکن اگر تم جانتے ہو [اور پھر بھی میرے ساتھ یہ سلوک کرتے ہو] تو یہ زیادہ بڑی مصیبت ہے۔

میرے خیال میں اعتدال پسند دھارے پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس کے لیے اسے بھرپور کوشش، انتہائی بے چینی اور جہاد کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ ذمہ داری یہ

ہے کہ مسلمانوں کی یعنی اسلام پسند حلقوں کی صفوں میں اتحاد پیدا کرے اور اس کے لیے ان بنیادوں کو سامنے رکھے جن پر سب کے درمیان اتفاق ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کو اسلامی عقیدے کے چھے ارکان: یعنی اللہ پر، فرشتوں پر، کتابوں پر، رسولوں پر، قیامت کے دن پر اور تقدیر پر ایمان لانے پر مجتمع کرے۔ اس کے بعد عمل کے پانچ ارکان: یعنی کلمہ شہادت، اقامت نماز، ادائیگیِ زکوٰۃ، رمضان کے روزے، اور بیت اللہ کا حج پر اکٹھا کرے۔ پھر بنیادی فضائل اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو اپنانے اور بنیادی برائیوں اور محرمات، خصوصا ہلاکت خیز کبائر سے اجتناب کی دعوت دے۔

ہمارے لیے اتنا کافی ہوگا کہ ہم ان کلیات پر اجمالی طور پر مل بیٹھیں، کوئی بات نہیں اگر ہم اس کے جزئیات اور تفصیلات میں نہ جائیں، کوئی بات نہیں اگر ہم فروع میں اختلاف کریں اور ہمارے جزوی نقطہ ہائے نظر میں اختلاف ہو یا ہمارے اجتہادات ایک دوسرے سے الگ الگ ہوں۔ یہ ایسے اختلافات ہیں جو دین کے مزاج اور انسانی فطرت کا تقاضا ہیں۔ بلکہ کائنات اور زندگی کے حقائق بھی ان کی تائید کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب الصحوۃُ الإسلامیۃُ بینَ الاختلافِ المشروعِ والتفرقِ المذمومِ میں اس کی وضاحت کی ہے۔

میں نے اپنی ایک سے زائد کتابوں میں ذکر کیا ہے کہ اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ اسلام کے لیے کام کرنے والی جماعتوں میں تعدد ہو، بشرطیکہ ان کا تعدد تنوع اور تخصص کی بنیاد پر ہو، نہ کہ مخالفت اور منافرت کی بنیاد پر۔ تنوع کی بنیاد پر اگر تعدد ہوگا تو یہ مزید ترقی اور نشو نما کا ذریعہ بنے گا اور اگر یہ تعدد مخالفت اور منافرت کا تعدد ہوگا تو یہ آپس میں ایک دوسرے کو کھا کر ختم ہو جائیں گے۔

اب ایسی فکری اور عملی کوششوں کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کو خدمت دین کے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیں۔ تاکہ اسلام کی دعوت کامیابی سے ہمکنار ہو، اس کی شریعت حکمران بن جائے، اور اس کی امت ایک ہو جائے۔ تاکہ امت کے مختلف ٹکڑے ایک ہوں، ان کے

اندر اعتماد کی فضا پیدا ہو، رواداری اور حسنِ ظن کی روح پروان چڑھے اور نفس کو خود پسندی، غرور و تکبر، دوسروں پر الزامات اور ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کی آفات سے پاک کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ [5] آدمی کے لیے اتنی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔

میری رائے میں یہ کام آج کے دور میں اسلامی تنظیموں کی سطح پر سب سے اہم اور سب سے مقدم ترجیحات میں شامل ہے۔ اگر اسلام پسند حلقے تقسیم و تشتت کے اس خطرے سے متنبہ نہیں ہوتے جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں تو عن قریب وہ ایک دوسرے کو کھا جائیں گے اور مخالف اسلام قوتوں کے خونی پنجے اور ان کے تیز دانت ان کو پھاڑ کھانے کے لیے آ موجود ہوں گے۔ یہ دھارے اور تنظیمیں یکے بعد دیگرے نشانہ بنتی رہیں گی یہاں تک کہ سب ختم ہو جائیں۔

اگر ہم میں اتنا دم خم نہیں ہے کہ مشرق سے لے کر مغرب تک پوری امت کو اکٹھا کر لیں تو کم از کم ہم یہ کوشش ہی کر لیں کہ اسلامی بیداری کے لیے برپا بڑی بڑی تنظیموں کی قوت کو منظّم کر لیں جن کے درمیان مکالمہ اور مفاہمت کا امکان موجود ہے۔ اور یہ اس طرح ممکن ہوگا کہ ہم اپنے اندر کی سختی کو کچھ قابو کریں، آپس میں کسی انتہا پر نہ رہیں، فکری میدان میں ایک دوسرے کے قریب ہوں اپنے نقطہ ہائے نظر کو منظّم کریں بنیادی اور انجام کے لحاظ سے اہم مسائل پر یکجائی اختیار کریں۔ جو چیزیں متفق علیہ ہیں ان میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور جن امور میں اختلاف ہے ان کے بارے میں تسامح سے کام لیں۔ یہ مفاہمت، تعاون اور اجتماع ایک دینی فریضہ اور زندہ رہنے کے لیے ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں ایک فکر آپس میں جمع نہیں کر سکتی تو کم از کم مشترکہ مصائب ہی ہمیں ایک کر لیں، جیسا کہ شوقی کہتا ہے:

فَإِنْ يَكُ الْجِنْسُ يَا ابْنَ الطَّلْحِ فَرَّقَنَا إِنَّ الْمَصَائِبَ يَجْمَعْنَ الْمُصَابِينَ!

۵-اسے امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

اے ابن طلحہ! اگر ہمیں جنس نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے تو کوئی بات نہیں، مصائب مصیبت زدگان کو آپس میں ملا دیتی ہیں۔

● شریعت کا نفاذ یا تربیت و آگاہی

ترجیحات کے حوالے سے جن باتوں میں خلل پیدا ہوا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ اسلامی حلقے میں کام کرنے والے زیادہ تر لوگ اور خاص طور پر تشدد پسند اپنی پوری توجہ اس بات کی طرف کیے ہوئے ہیں جسے وہ 'اسلام کا عملی نفاذ' کہتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد شریعت کا قانونی پہلو ہوتا ہے۔ بطور خاص سزائیں: مثلاً حدود، قصاص اور تعزیرات وغیرہ۔

یہ پہلو تو اسلام کا ایک جز ہے، اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ اس سے غفلت اور اعراض جائز نہیں ہے۔[6]

مگر اس کے مطالبے میں مبالغہ اور ہر مقام پر اسی کو موضوع بحث بنانا اور اسے دین کا سرا، اس کا عمود اور بلند ترین چوٹی قرار دینا ایک ایسی حرکت ہے جس کے اسلامی فکر اور اسلامی عمل پر برے اثرات پڑتے ہیں۔ دوسری طرف عام لوگ بھی اس سے غلط طور پر متاثر ہوتے ہیں اور اسلام اور اس کی شریعت کے دشمن تو اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ صرف قوانین سے معاشرے نہیں بنتے، نہ ان سے قومیں وجود میں آتی ہیں۔ معاشرے اور قومیں جو بنتی ہیں تو تربیت اور علم سے بنتی ہیں۔ پھر قوانین ان کی تنظیم اور حفاظت کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ فی الحال ہمارا فرض یہ بنتا ہے کہ اس مسئلے کو اتنی ہی اہمیت دیں جتنی اہمیت فکری اور عملی طور پر حقیقت میں اس کی ہے۔ اس کام کے لیے ایسے مواقع پیدا کیے جائیں جن میں صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور نوجوانوں کی تیاری میں مدد ملے اور ایک کامل اسلامی نظامِ

٦- دیکھیے ہماری کتاب: ملامحُ المجتمع المسلمِ الذي ننشده، فصل: التشریع و القانون، ص ۱۵۷-۱۸۸۔

تعلیم و تربیت کا مطالبہ کیا جائے جو ماں کے گود سے لے کر یونیورسٹی سے فراغت تک بچے کی نگرانی اور اس کی مکمل نگہداشت کرے۔ اس کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوگی ان میں سے چند یہ ہیں: مناسب طریق کار اور دلچسپ اسلوب اختیار کرنا، سمعی و بصری آلات کو بروئے کار لانا، جدید ٹیکنالوجی سے مدد لینا، جس کے ذریعے انسانی زندگی کے لیے دین کی ضرورت کا احساس پیدا ہو، اسلام کی جامعیت اور اس کے احکام کی صحت کا یقین ہو جائے۔ اس کی کتاب کا اعجاز، اس کے رسول کی عظمت، اس کی تہذیب کا توازن اور اس کی امت کا دوام ان کے دلوں میں اجاگر ہو جائے۔

یہ تربیت صرف دینی تعلیم یا اسلامی نظام تعلیم ہی میں مطلوب نہیں ہے، بلکہ یہ بغیر کسی جعلی پن کے تمام سائنسی اور ادبی علوم کے نصاب میں ضروری ہے۔ اس کی ضرورت کو سائنس اور معاشرتی اور ادبی علوم میں محسوس کیا جانا چاہیے۔ تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ اس کا احساس عمومی فضا میں بھی ہونا چاہیے تاکہ یہ ایک مسلمان نسل کی تیاری میں مددگار ثابت ہو۔ ایسی نسل جو اللہ پر ایمان رکھتی ہو، اپنے دین اور اپنی امت پر فخر کرتی ہو۔ وہ روحانی، عقلی، جسمانی اور وجدانی طور پر اپنے اندر کمال رکھتی ہو۔ وہ اپنے رب کے ساتھ مخلص، اپنے ملک کا خادم، دوسروں کے ساتھ رواداری پر عمل پیرا اور پوری انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کرنے والی ہو۔

یہ بھی ضروری ہے کہ درآمدہ لادینی فلسفوں اور پروگراموں کا راستہ روکا جائے جو دینی روح سے خالی اور اللہ کے وجود، انسان کے مقام، زندگی کی حقیقت، اس جہاں کی وجہ پیدائش اور دین و دنیا کے تمام معاملات میں اسلامی فلسفے کے خلاف ہیں۔

اس کے ساتھ کچھ اور مناسب مواقع ذرائع ابلاغ اور ان میں مہارت کے لیے بھی فراہم ہونے چاہییں جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک مؤثر ہتھیار بن گیا ہے۔ اور اب یہی ذہن سازی کا کام کرتے ہیں، لوگوں کے میلانات پیدا کرتے ہیں، ایک خاص ذوق پروان چڑھاتے ہیں اور زیادہ تر لوگوں کے لیے فکری اور نفسیاتی رخ متعین کرتے ہیں۔

یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ اس میدان کو ان لوگوں کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے جو اسلام پر اس لحاظ سے ایمان نہیں رکھتے کہ یہ ایک مسلمان فرد اور مسلمان معاشرے کے لیے فکر، کردار اور میل جول میں اعلیٰ ترین ماخذ ہے۔

ضروری ہے کہ ہم دو بنیادی اور کامل محوروں پر کام کریں:

● ایک یہ کہ ہم ہر میدان میں اور ہر سطح پر مسلمان ماہرین ابلاغ تیار کریں جو اسلام کی صحیح نمائندگی کرسکیں اور اپنے دور کے عظیم امکانات کے بھی درست ترجمان بن سکیں۔

اس میں ان لوگوں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جو موسیقی، اداکاری، اور ڈرامے جیسے فنون میں مہارت رکھتے ہیں۔

اس مقام پر ہمیں ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہوگی جو مواد تیار کریں، ایسے لوگوں کی بھی جو اسے مکالمات میں تبدیل کریں اور ایسے لوگوں کی بھی جو اسے تمثیلاً پیش کرسکیں اور اس کی اداکاری کرسکیں۔ اسی طرح اسے عملی شکل دینے والے اور تدوین وتہذیب کرکے آخری شکل دینے والے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی۔

یہ سب چیزیں آسان نہیں ہیں، اس میں بہت سی شرعی اور عملی مشکلات ہیں، جن کو ختم کرنے کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے، اگرچہ اس کے لیے ہمیں مرحلہ وار ہی کام کرنا پڑے۔ بہرحال اس کے لیے ہمیں ایسا منصوبہ تشکیل دینے کی ضرورت ہے جس کے اہداف مقرر ہوں، جس کے وسائل واضح ہوں اور جس کے مراحل معلوم ہوں، تاکہ کمی کوتاہی کو بروقت دور کیا جاسکے اور عمارت کو مضبوط کیا جاسکے۔[۷]

● دوسرا کام یہ ہے کہ موجودہ ماہرین ابلاغ اور فن کاروں کو اپنے ساتھ ملائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں ایسے لوگ ہیں جو صوم وصلوٰۃ کے پابند ہوتے ہیں مگر وہ اپنی تعلیم وتربیت کے نتیجے میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کررہے ہیں وہ نہ اسلام کے خلاف ہے اور نہ ان پر اللہ کا

۷۔ دیکھیے ہماری کتاب: ملامحُ المجتمع المسلمِ الذي ننشدہ، فصل: اللھو والفنون۔

غضب نازل کرنے والا ہے۔ بعض اوقات ان میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کو یہ بات تو معلوم ہوتی ہے مگر وہ جو زندگی گزارتے ہیں اور جن عادات کے وہ عادی ہوتے ہیں اس کا ان پر غلبہ ہوتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ان لوگوں پر محنت کریں تاکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور اپنے رب کی طرف لوٹ کر اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کے قافلے میں شامل ہوجائیں۔

مجھے پچھلے چند سالوں سے معلوم ہوا ہے کہ متعدد فن کاروں نے اپنے کام سے توبہ کی ہے اور فن کاراؤں کی بھی ایک بڑی تعداد اپنے رب کی طرف لوٹ آئی ہے۔ مگر ان میں سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے، جنھوں نے اپنے دین کو بچالے جانے، اپنی نجات کی خاطر اداکاری بھی چھوڑ دی ہے اور اپنے سابقہ دوستوں سے میل جول سے بھی ہاتھ کھینچ لیے ہیں۔

ان کے لیے اس سے بہتر یہ تھا کہ اس مشکل معرکے میں ڈٹے رہتے اور اس پر مشقت میدان کو اپنے قابو میں رکھتے۔ ضرورت تھی کہ وہ بھی وہی بات کہتے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام لانے کے بعد کہی تھی:

وَاللّٰہِ لَایَبْقٰی مَکَانٌ کُنْتُ أَعْلَنْتُ فِیْهِ الْجَاهِلِیَّةَ إِلَّا أَعْلَنْتُ فِیْهِ الْإِسْلَامَ. خدا کی قسم! کوئی جگہ نہ رہے گی جس میں میں نے جاہلیت کی پکار بلند کی ہو مگر اب میں ضرور وہاں اسلام کی پکار بلند کروں گا۔

یہ کام سب کے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور مشکلات پر قابو پائے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔

❖❖❖

۱۰

ترجیحات اور ہمارا دینی ورثہ

ترجیحات اور ہمارا ورثہ

جو شخص اس امت کے وسیع وعریض ورثے کے آفاق کو دیکھ چکا ہو اسے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمارے علمائے کرام ترجیحات کے مسئلے کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے اور اس میں پیدا ہونے والے خلل کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ ان کے اس اہتمام کے واقعات متفرق صورت میں مختلف مصادر میں موجود ہیں جنھیں اپنے متعلقہ مقامات میں ذکر کیا جاتا ہے۔

● حالت احرام میں مکھی کے قتل کا سوال

شاید اس اہتمام کے بارے میں جو پہلا واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت کے ساتھ مروی ہے۔ ابونعیم کہتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ میں اس وقت ان کے پاس بیٹھا تھا۔ آدمی نے آکر مچھر کے خون کے بارے میں —— اور ایک روایت میں ہے کہ احرام کی حالت میں مکھی کے قتل کے بارے میں —— سوال کیا۔ انھوں نے کہا: تمھارا تعلق کہاں سے ہے؟ اس نے کہا: میں عراق سے ہوں۔ انھوں نے لوگوں کو مخاطب کرکے کہا: واہ! یہ دیکھو، یہ مچھر کے خون کے بارے میں پوچھ رہا ہے، حالانکہ یہی لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لخت جگر کو قتل کردیا تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ هُمَا –يَعْنِي الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ– رَيْحَانَتَيَّ مِنَ الدُّنْيَا. یہ دونوں یعنی حسن اور حسین میرے لیے دنیا کی کلی ہیں۔

اور ایک روایت میں آیا ہے کہ انھوں نے کہا: اہل عراق ہم سے مکھی کے بارے میں

پوچھتے ہیں حالانکہ انھوں نے رسول اللہ کی بیٹی کے لخت جگر کو قتل کر دیا ہے۔[1]

حافظ ابن حجر فتح الباری میں اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات اس حیرت کے اظہار میں کہی کہ اہل عراق ایک معمولی چیز کے بارے میں تو فتویٰ پوچھتے ہیں مگر بڑے معاملے سخت کوتاہی کرتے ہوئے بھی نہیں چوکتے۔[2]

اور ابن بطال کہتے ہیں: اس حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدمی کے لیے جو معاملہ دینی حوالے سے زیادہ ضروری ہو اسے مقدم کرے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص پر نکیر فرمائی جو مچھر کے خون کے بارے میں پوچھ رہا تھا مگر اس نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے قتل میں مددگار بن کر جس گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا تھا اس پر استغفار وہ بھول رہا تھا۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس پر ڈانٹا۔ پھر صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر اس لیے کیا کہ ان کا مقام زیادہ بلند تھا اور آپ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے زیادہ قریب تھے۔[3]

یہ نکیر صرف ایک مخصوص سائل پر نہیں ہے بلکہ اصل نکیر لوگوں کے ایک طرز فکر پر ہے جو معمولی معمولی چیزوں کے بارے میں تو بڑی باریک بینی سے کام لیتے ہیں۔ اس میں اپنے آپ کو بھی مشغول کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی ایک لایعنی کام میں لگا دیتے ہیں، مگر جب بڑے معاملات پیش آتے ہیں تو اس کے بارے میں بالکل لاپروائی کرتے ہیں۔

جو واقعہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو پیش آیا تھا اسی طرح کا ایک واقعہ ان کے بیٹے سالم کو بھی ایک عراقی کے ساتھ پیش آیا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ لوگ بہت چھوٹے چھوٹے امور کے بارے میں سوالات کیا کرتے تھے، جبکہ قتل وقتال اور خون ریزی جیسے بڑے معاملات کو

۱- اسے احمد نے اپنی روایت کے ساتھ نقل کیا ہے [۵۶۷۵، ۵۵۶۸] شیخ شاکر نے اسے دو مقامات پر صحیح قرار دیا ہے۔ بخاری نے بھی اسے دو مقامات پر نقل کیا ہے، کتاب المناقب [۳۷۵۳]، کتاب الأدب [۵۹۹۴]، البخاری مع الفتح۔

۲- فتح الباری ۷/ ۹۵، طبع: دار الفکر۔

۳- فتح الباری ۱۰/ ۴۲۷، طبع: دار الفکر۔

انھوں نے ساقط کر دیا تھا۔ حالانکہ اس سے ایک متفق علیہ حدیث میں سخت ممانعت آئی ہے۔ فرمایا:

لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ. میرے بعد کافر نہ بنو کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

امام مسلم نے کتاب الفتن میں حضرت سالم بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: اے اہل عراق! میں تم سے کسی صغیرہ کے بارے میں نہیں پوچھوں گا، بلکہ تم پر ایک گناہ کبیرہ ثابت کرتا ہوں۔ میں نے اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے سنا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرما رہے تھے:

إن الْفِتْنَةَ تَجِيءُ مِنْ هَا هُنَا. فتنہ یہاں سے اٹھتا ہے۔

یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ نے مشرق کی طرف اشارہ کیا اور پھر فرمایا:

من حَيْثُ يَطْلُعُ قَرْنَا الشَّيْطَانِ! جہاں سے شیطان کے سینگ نکلتے ہیں۔

تم لوگ اسی طرح ایک دوسرے کی گردنیں مارتے رہوگے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس شخص کو قتل کیا تھا وہ غلطی سے قتل کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا (طٰهٰ ۲۰:۴۰)

تو نے ایک جان کو قتل کیا تھا، ہم اس غم سے تو تمھیں نجات دے دی مگر پھر کئی آزمائشوں میں ڈالا۔

ترجیحات کے حوالے سے ہمارے ورثے میں ایک قابل ذکر چیز وہ دل ہلا دینے والا خط ہے جو حافظ ابن عساکر نے محمد بن ابراہیم بن ابی سکینہ کی روایت سے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے حالات میں نقل کیا ہے۔ محمد بن ابراہیم کہتا ہے کہ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے طرسوس میں مجھے کچھ اشعار لکھوائے اور مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا کہ میں یہ اشعار فضیل بن عیاض کو جا کر سناؤں۔ یہ ۱۷۰ھ اور ایک روایت میں ۱۷۷ھ کا واقعہ ہے۔ اشعار یہ ہیں:

يَا عَابِدَ الْحَرَمَيْنِ لَوْ أَبْصَرْتَنَا لَعَلِمْتَ أَنَّكَ فِي الْعِبَادَةِ تَلْعَبُ
مَنْ كَانَ يَخْضِبُ خَدَّهُ بِدُمُوْعِهِ فَنُحُوْرُنَا بِدِمَائِنَا تَتَخَضَّبُ
أَوْ كَانَ يُتْعِبُ خَيْلَهُ فِي بَاطِلٍ فَخُيُوْلُنَا يَوْمَ الصَّبِيْحَةِ تَتْعَبُ
رِيْحُ الْعَبِيْرِ لَكُمْ وَنَحْنُ عَبِيْرُنَا رَهَجُ السَّنَابِكِ وَالْغُبَارُ الْأَطْيَبُ
وَلَقَدْ أَتَانَا مِنْ مَّقَالِ نَبِيِّنَا قَوْلٌ صَحِيْحٌ صَادِقٌ لَّايَكْذِبُ
لَايَسْتَوِيْ غُبَارُ خَيْلِ اللهِ فِيْ أَنْفِ امْرِئٍ وَّدُخَانُ نَارٍ تَلْهَبُ
هٰذَا كِتَابُ اللهِ يَنْطِقُ بَيْنَنَا لَيْسَ الشَّهِيْدُ بِمَيِّتٍ لَّايَكْذِبُ

اے حرمین کے عبادت گزار! اگر آپ ہمیں دیکھیں گے تو یقیناً جان لیں گے کہ آپ تو عبادت نہیں کر رہے، کھیل رہے ہیں۔ اگر کسی کا رخسار اس کے آنسوؤں سے تر ہے تو ہمارے سینے ہمارے خون سے رنگیں ہیں۔ اگر کسی کے گھوڑے باطل کے راستے میں تھکے ہوئے ہیں تو ہمارے گھوڑے جنگ کے دنوں میں تھکتے ہیں۔ عطریات کی خوشبو آپ کے لیے ہے، اور ہماری خوشبو گھوڑوں کی کھروں سے اڑنے والی مٹی اور پاکیزہ گرد و غبار ہے۔ ہمارے پاس اپنے نبی ﷺ کا یہ قول پہنچ چکا ہے جو ایک صحیح اور سچا قول ہے اور جس میں جھوٹ کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کے [راستے میں لڑنے والے] گھوڑوں کی [کھروں سے اُڑنے والی] غبار اور بھڑکتی ہوئی آگ کا دھواں ایک شخص کی ناک میں جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ اللہ کی کتاب بھی ہمارے درمیان گواہی دے رہی ہے کہ شہید کبھی مرا نہیں کرتے۔

محمد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے مسجد حرام میں ملا اور یہ خط ان کو دے دیا۔ انھوں نے اسے پڑھا تو آنکھوں میں آنسو آئے اور کہا: ابوعبدالرحمٰن نے سچ کہا ہے اور میرے ساتھ بھلائی کی ہے۔ پھر اس نے مجھے کہا: کیا تم حدیث میں دلچسپی رکھتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ انھوں نے کہا: تم نے اس کا خط مجھ تک پہنچایا ہے لہٰذا اس کے کرایے میں یہ حدیث لکھ لو۔ پھر فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے یہ حدیث لکھوائی: ہمیں منصور بن المعتمر نے

ابو صالح کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی بات روایت کی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: یارسول اللہ! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جس کے ذریعے مجھے مجاہدین فی سبیل اللہ کا ثواب ملے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

هَلْ تَسْتَطِيْعُ أَنْ تُصَلِّيَ فَلَاتَفْتُرَ، وَتَصُوْمَ فَلَا تُفْطِرَ؟ کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ ہمیشہ رات کو نماز پڑھو اور کبھی اُکتا نہ جاؤ؟

آدمی نے کہا: یارسول اللہ! میں تو اس کام کے کرنے سے بہت کم ہمت ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ طُوِّقْتَ ذٰلِكَ مَا بَلَغْتَ الْمُجَاهِدِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ. أَوْمَا عَلِمْتَ أَنَّ فَرَسَ الْمُجَاهِدِ لَيَسْتَنُّ فِيْ طُوَلِهٖ، فَيُكْتَبُ لَهٗ بِذٰلِكَ الْحَسَنَاتِ. اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر تجھے اس کی طاقت دی جائے [اور تم یہ عبادت کرو] تب بھی تم مجاہدین فی سبیل اللہ کے درجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ مجاہد کے گھوڑے کو سیدھا دوڑا دیا جاتا ہے جتنا یہ دوڑ سکے اس کے برابر اس کے لیے حسنات لکھ دی جاتی ہیں۔

ایک بار الجزائر میں فکر اسلامی کے حوالے سے ایک کانفرنس میں اس واقعے کا تذکرہ ہوا تو ایک بہت بڑے آدمی نے اس پر اعتراض کیا اور اس بات سے انکار کیا کہ اس واقعے کی کوئی صحیح بنیاد ہو۔ کیوں کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کے عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جیسے آدمی حرمین میں عبادت کو کھیل کہیں۔ •

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ بالکل صحیح ہے۔ اسے ابن عساکر نے عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں سند کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ابن کثیر نے بھی اسے اپنی تفسیر میں سورۂ آل عمران

• عبداللہ بن مبارک کا مقصد یہ تھا کہ آپ جس طریقے سے عبادت کر رہے ہیں وہ کھیل ہے نہ کہ خود بیت اللہ میں عبادت۔ (مترجم)

کے آخر میں ذکر کیا ہے اور اس کی تائید کی ہے۔[4]

اسی طرح اسے حافظ ذہبی نے اپنے انسائیکلو پیڈیا سِيَرُ أعلامِ النُّبلاءِ میں ابن مبارک کے حالات میں نقل کیا ہے۔[5]

اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اسلام کے اصول یا اس کی نصوص کے خلاف ہو۔ بلکہ ابن مبارک ؒ نے تو اپنے اشعار میں خود کتاب وسنت سے استدلال کیا ہے۔ اسی طرح فضیل بن عیاض جیسے عابد وزاہد نے اس کی تائید کی ہے، اسی لیے تو انھوں نے خط لانے والے کو حدیث لکھوائی۔

ہمارے بزرگ شیخ البہی الخولی نے اپنی مشہور کتاب تذکرة الدعاة میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے اور اس پر یہ تعلیق کی ہے: ابن مبارک ؒ نے یہ خط اپنے دوست فضیل بن عیاض ؒ کو ایسے وقت میں لکھا تھا جب جہاد فرض عین نہیں تھا، اس کے باوجود انھوں نے عبادت بلا جہاد کو کھیل سے تعبیر کیا ہے حالانکہ یہ عبادت روئے زمین کے مقدس ترین حصے پر کی جارہی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر جہاد فرض عین ہوتا اور دوسری طرف عبادت کسی ایسے مقام پر ہوتی جس کو مسجد حرام جیسا تقدس حاصل نہ ہوتا تو ابن مبارک ؒ کے احساسات کیا ہوتے۔[6]

● میل جول یا گوشہ نشینی

اسی حوالے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ آیا مسلمان کے لیے فتنے، فساد اور گناہوں کے دور میں معاشرے میں گھل مل کر رہنا اور اس کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا بہتر ہے یا عزلت اختیار کر کے اپنی فکر کرنا؟

صوفیا کی اکثریت نے تو دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ رہے وہ جمہور علمائے ربانیین جو جہاد

۴- دیکھیے: تفسیر ابن کثیر، طبع عیسیٰ الحلبی ۱/۴۴۷۔

۵- دیکھیے: سیر أعلام النبلاء ۸/۳۶۴-۳۶۵۔

۶- دیکھیے: تذکرة الدعاة، ص ۲۱۲۔

کے راستے پر عمل پیرا ہیں تو انھوں نے انبیا کے طریق کار کو اپنایا ہے اور وہ ہے لوگوں سے میل جول رکھنا، مجاہدہ کرنا اور لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کرنا۔

حضرت ابن عمر ؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ:

اَلْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلَىٰ أَذَاهُمْ خَيْرٌ مِّنَ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ وَلَا يَصْبِرُ عَلَىٰ أَذَاهُمْ.[7] وہ مسلمان جو لوگوں سے خلط ملط ہوتا ہے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرتا ہے اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے میل جول بھی نہیں رکھتا اور ان کے ایذاؤں پر صبر بھی نہیں کرتا۔

امام ابو حامد الغزالی ؒ کی کتاب احیاء العلوم میں ایک پورا باب اسی مسئلے کے لیے مخصوص ہے کہ عزلت اور خلطت میں کیا فوائد یا نقصانات ہیں اور ان میں کن آفات سے بچنا چاہیے۔

اس میں ایک بحث دنیا اور اس کے ساز وسامان کے حوالے سے ہے کہ اس کے بارے میں کیا طرز عمل اختیار کیا جائے، کیا آدمی اس کے ہنگاموں اور اس کے مختلف میدانوں میں داخل ہو جائے، دنیا داروں کے ساتھ مزاحم ہو جائے اور حدود کا خیال رکھتے ہوئے اس کے طیبات سے مستفید ہو جائے، یا اس سے منہ موڑے، اس سے بے رغبتی اختیار کرے اور اس کے زیب وزینت اور مال ودولت سے ہاتھ اٹھا لے؟

چنانچہ اکثر صوفیا نے تو دوسرا انتخاب کیا ہے۔ مگر امت کے محققین علمائے ربانیین نے پہلا انتخاب کیا ہے۔ یہی وہ طریق کار جسے حضرت یوسف، داؤد اور سلیمان ؑ جیسے انبیا اور حضرت عثمان ؓ، حضرت عبد الرحمن بن عوف ؓ، طلحہ بن زبیر ؓ اور سعد ؓ جیسے صحابہ کرام نے اپنایا تھا۔

علامہ ابن الجوزی ؒ (متوفی ۵۹۷ھ) نے ان صوفیا کی تردید کی ہے جنھوں نے مال کو

۷- اسے احمد، بخاری [فی الأدب المفرد] ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۶۶۵۱۔

علی الاطلاق مذموم ٹھیرایا ہے اور اسے شر اور آفت قرار دیا ہے، اور جنھوں نے ہر اس شخص پر نکیر کی ہے جو مال کا مالک بنے یا اسے کمائے، اگرچہ حلال ہی طریقے سے ہو۔ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب تلبیس إبلیس میں اس مسئلے پر کتاب وسنت، سیرتِ صحابہ اور شرعی قواعد سے استدلال کیا ہے۔

● ممنوع کا ترک یا مامور پر عمل

اس سلسلے میں ایک بحث یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ممنوع اور حرام اشیا کو چھوڑ دینا زیادہ اہم اور افضل ہے یا اوامر اور طاعات پر عمل۔

بعض کہتے ہیں کہ ممنوع اشیا کا ترک زیادہ اہم ہے اور ان کو جاری رکھا جائے تو یہ زیادہ خطرے کا باعث ہے۔ ان کا استدلال اس حدیث صحیح سے ہے جو بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کی ہے، جسے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی أربعین میں بھی ذکر کیا ہے۔ ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی الجامع میں اس کی تشریح کی ہے۔ حدیث یہ ہے:

إِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوْهُ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ.[8] جب میں تمھیں کسی چیز سے روکوں تو اس سے اجتناب کرو اور جب تمھیں کسی چیز کا حکم دوں تو اسے ممکن حد تک ادا کرو۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات نکل آئی کہ نہی والے احکام زیادہ ضروری ہیں، بہ نسبت امر والے احکام کے۔ کیوں کہ نہی میں کسی طرح کی رخصت نہیں دی گئی ہے جب کہ امر استطاعت کے ساتھ مقید کر دی گئی ہے۔ یہ رائے امام احمد سے بھی مروی ہے۔

بعض لوگوں کا یہ قول اسی قبیل سے ہے کہ نیک اعمال تو نیک وبد ہر شخص کرتے ہیں مگر معاصی کو صرف وہی لوگ ترک کرتے ہیں جو صدیق ہوتے ہیں۔[9]

۸- بخاری ۷۲۸۸، مسلم ۱۳۳۷۔

۹- یہ بات سہل بن عبداللہ تستری کے اقوال میں مذکور ہے۔ دیکھیے: الحلیة، ابونعیم، ۱۰/ ۲۱۱۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ.[10] محارم سے بچو، تم سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَسْبِقَ الدَّائِبَ الْمُجْتَهِدَ، فَلْيَكُفَّ عَنِ الذُّنُوْبِ. جو چاہتا ہے کہ بڑے بڑے کام کرنے والے اور اس میں جان کھپانے والوں سے آگے بڑھ جائے تو اسے چاہیے کہ گناہوں سے بچے۔

یہ روایت ان سے مرفوعاً بھی وارد ہوئی ہے۔[11]

حضرت حسن فرماتے ہیں: عابدین کے اعمال میں سے اللہ کی منع کردہ امور سے باز آنا ہی وہ عمل ہوتا ہے جس پر انھیں سب سے زیادہ عبادت گزار کہا جاتا ہے۔

اس میں یہ بات ظاہر ہے کہ طاعات پر عمل کے مقابلے میں محرمات سے اجتناب کی جو فضیلت ذکر کی گئی ہے اس میں طاعات سے مراد وہی طاعات ہیں جو نوافل کی جنس سے ہوں۔ اس لیے کہ جو افعال واجبات کی جنس سے ہیں ان پر عمل کرنا بالاتفاق نواہی کو ترک کرنے سے افضل ہے۔ کیوں کہ اعمال صالحہ بذاتِ خود مقصود ہوتے ہیں جب کہ حرام اشیا کا نہ ہونا مطلوب ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان میں نیت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس کے برعکس اعمال صالحہ میں نیت ضروری ہوتی ہے۔ اس بنا پر مطلقاً اعمال صالحہ کا ترک تو بعض اوقات کفر ہوتا ہے جیسے

۱۰- یہ ایک حدیث کا حصہ ہے جسے احمد ۲/ ۳۱۰، ترمذی ۲۳۰۵، ابن ماجہ ۴۲۱۷، بیہقی ۸۱۸، اور الحلیة ۱/ ۳۶۵ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے غریب کہا ہے مگر اس کی ایک اور سند ہے جس سے اس کی تقویت ہوتی ہے اور وہ ابن ماجہ کی محولہ بالا روایت ہے۔ اسے بوصیری نے مصباح الزجاجة میں حسن کہا ہے۔

۱۱- اسے ابویعلیٰ ۴۹۵۰ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں سوید بن سعید اور یوسف بن میمون آئے ہیں اور یہ دونوں ضعیف ہیں۔

توحید کا ترک، یا ارکانِ اسلام کا ترک۔ جبکہ ممنوعات پر عمل کرنا فی نفسہٖ کفر نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ

لَرَدُّ دَانِقٍ حَرَامٍ أَفْضَلُ مِنْ مِئَةِ أَلْفٍ تُنْفَقُ فِي سَبِيلِ اللهِ. ایک دانق کے برابر حرام سے ہاتھ کھینچنا اس سے بہتر ہے کہ اللہ کی راہ میں ایک لاکھ خرچ کیے جائیں۔

اور بعض سلف سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: اللہ کے ناپسندیدہ ایک دانق کو چھوڑنا اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ محبوب ہے کہ آدمی پانچ سو حج ادا کرے۔

میمون بن مہران کہتے ہیں: زبان سے اللہ کا ذکر بھی اچھا ہے، مگر اس سے زیادہ اچھا یہ ہے کہ بندہ اسے گناہ کے وقت یاد کرے اور اس سے باز آجائے۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اگر میں ایک درہم جو مشتبہ ہو، چھوڑ دوں یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ایک لاکھ اس کی راہ میں خرچ کروں، وہ ایک ایک لاکھ بڑھاتے رہے یہاں تک کہ بات چھ لاکھ تک پہنچ گئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: تقویٰ یہ نہیں ہے کہ آدمی رات کو نمازیں پڑھے، دن کو روزے رکھے اور کبھی ان کے درمیان آمیزش کرے، بلکہ اصل تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اللہ کے لازم کردہ افعال کو ادا کرے اور اس کی حرام کردہ چیزوں کو چھوڑ دے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی عمل ہوگا تو وہ بھلائی پر بھلائی ہوگی، او کما قال۔

انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ پانچ نمازوں کے علاوہ کوئی نماز نہ پڑھوں، سوائے وتر کے، اور یہ کہ میں زکوٰۃ دوں اور اس کے علاوہ ایک درہم بھی خرچ نہ کروں، اور یہ کہ میں رمضان کے روزے رکھوں اور اس کے سوا کوئی روزہ نہ رکھوں، اور یہ کہ میں زندگی میں ایک حج ادا کروں اور اس کے بعد کوئی حج نہ کروں، اور پھر میں اپنے اضافی رزق کا رخ کروں اور اسے ان اشیا کے ساتھ ملاؤں جو اللہ نے میرے لیے حرام کی ہیں اور اس سے ہاتھ کھینچوں۔

ان سب کا حاصل کلام یہ ہے کہ حرام چیزوں سے اجتناب، خواہ وہ کتنے ہی کم ہوں، اس سے افضل ہے کہ آدمی نفل عبادتیں کرے۔ کیوں کہ حرام سے اجتناب فرض ہے اور یہ نفل۔

اور متاخرین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

إِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوهُ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ.

جب میں تمھیں کسی چیز سے روکوں تو اس سے اجتناب کرو اور جب تمھیں کسی چیز کا حکم دوں تو اسے ممکن حد تک ادا کرو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حکم کو ماننا عمل کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، اور عمل کا وجود کچھ شرائط اور اسباب سے مشروط ہوتا ہے جن میں سے بعض پر کبھی عمل کرنے کی استطاعت نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے اس کو استطاعت کے ساتھ مقید کردیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیا ہے اور اسے استطاعت کے ساتھ مقید کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاتَّقُوا اللهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ. (التغابن ۶۴:۱۶)

[جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو]

حج کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلاً. (آل عمران ۳:۹۷)

لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔

رہا ممنوع امور کا معاملہ تو ان میں عدم مطلوب ہوتا ہے اور وہی اصل بھی ہے۔ اس میں شریعت کا مقصود گناہ کے غیر موجود ہونے کو جاری رکھنا ہے۔ اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کی کسی میں استطاعت نہ ہو۔

مگر یہ بات بھی قابل غور ہے۔ کیوں کہ بعض اوقات کسی گناہ کے کام کا داعیہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ قدرت کے باوجود بندہ اپنے آپ کو اس سے روکے رکھنے پر صبر نہیں کرسکتا۔ ان حالات

میں اس سے باز آنا سخت مجاہدے کا محتاج ہوتا ہے جو بعض اوقات نفس پر اتنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کے مقابلے میں عمل صالح کو کرنا آسان نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ عبادت میں خوب کوشش کرتے ہیں مگر اپنے آپ کو حرام سے نہیں بچا سکتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک ایسی قوم کے بارے میں پوچھا گیا جو گناہ کا شوق رکھتے تھے مگر اس پر عمل نہیں کرتے تھے، تو انھوں نے کہا:

أُولٰئِكَ قَوْمٌ امْتَحَنَ اللهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّأَجْرٌ عَظِيمٌ [12] یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے آزما لیے ہیں۔ ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

یزید بن میسرۃ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی کتاب میں فرمایا ہے: اے نوجوان، جس نے اپنی خواہشات کو چھوڑ دیا ہے اور جس نے اپنی جوانی کو میری خاطر لگایا ہے! تو میرے ہاں میرے بعض فرشتوں کا مقام رکھتا ہے۔ [13]

اور کہتے ہیں: جسم میں شہوت کس قدر غالب ہے!! یہ آگ کی طرح جلا دیتی ہے، اس سے پاکباز لوگ کیسے بچ سکیں گے؟! [14]

اس مسئلے کی تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان اعمال کا مکلّف نہیں کرتا جس کی وہ طاقت نہ رکھتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت سے اعمال کو اس وجہ سے ساقط کر دیا ہے کہ ان میں مشقت تھی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں رخصت عطا فرمائی ہے اور ان پر رحم کیا ہے۔ رہے وہ اعمال جن کی ممانعت کی ہے تو ان میں کسی کو اس وجہ سے معذور نہیں کیا گیا کہ ان میں اس کا

۱۲-اسے احمد نے کتاب الزهد میں روایت کیا ہے جیسا کہ تفسیر ابن کثیر ۷/ ۲۴۸ میں ہے۔ یہ مجاہد کی روایت سے حضرت عمرؓ سے مروی ہے۔ مگر مجاہد کا سماع حضرت عمرؓ سے ثابت نہیں ہے اس وجہ سے یہ روایت منقطع ہے۔

۱۳-اسے ابونعیم نے الحلیة ۵/ ۲۳۷ میں ذکر کیا ہے۔

۱۴-اسے بھی ابونعیم نے الحلیة ۵/ ۲۴۱ میں ذکر کیا ہے۔

داعیہ شدید ہے، بلکہ انھیں ہر حال میں ان افعال کے ترک کا مکلّف ٹھیرایا ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ کھانے کی اشیا میں جب شدید ضرورت ہو تو اپنی زندگی کو بچانے کے بقدر اس میں سے کھا سکتے ہیں، مگر مزے لینے اور خواہش پورا کرنے کے لیے نہیں کھا سکتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح بات وہی ہے جو امام احمد نے فرمائی ہے کہ نہی کا معاملہ امر کے مقابلے میں شدید ہے۔ اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔ فرمایا:

اِسْتَقِيمُوا وَلَنْ تُحْصُوا۔ [15] یعنی سیدھے ہو جاؤ، مگر تم اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے۔ یعنی تم مکمل طور پر استقامت پر قادر نہیں ہو سکتے۔

● مال اور شکر یا فقر اور صبر

یہاں موازنات یا ترجیحات کے مسئلے میں جو مباحث شامل ہوتے ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس میں قدیم علما نے اس سوال کے جواب میں بڑی بحثیں کی ہیں کہ ان دونوں چیزوں میں کون سی چیز افضل ہے، کیا مال داری جس کے ساتھ شکر ہو یا غریبی جس پر آدمی صبر کرے۔ دوسرے الفاظ میں مال دار شکر گزار افضل ہے یا غریب صابر؟

اس سوال کا جواب دینے میں اقوال مختلف ہیں کہ پہلی چیز کو ترجیح دی جائے گی یا دوسری کو۔ میں نے جہاں تک نصوص پر غور و فکر اور ان کے درمیان تقابل کیا ہے، تو میرے سامنے یہ بات راجح ثابت ہوئی ہے کہ مال داری کے ساتھ شکر ہو تو یہ افضل اور اولیٰ ہے۔ یہ شکر کوئی معمولی چیز نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ. (سبأ ۳۴:۱۳)

۱۵-یہ صحیح حدیث ہے جسے احمد ۵/ ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۸۲، دارمی ۱/ ۱۶۸، ابن ماجہ ۲۷۷ نے سالم بن ابی الجعد کے ذریعے حضرت ثوبانؓ سے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے [۱/ ۱۳۰] ذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔ اس کے علاوہ اسے احمد ۵/ ۲۸۲ اور دارمی ۱/ ۱۶۸ نے ولید بن مسلم کے ذریعے بھی نقل کیا ہے۔ اس کی سند یہ ہے: حدثنا ابن ثوبان، حدثني حسان بن عطية أن أبا كبشة السلولي، حدثه أنه سمع ثوبان يقول......

میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ ابلیس لعین کی زبان سے فرماتا ہے:

وَلَاتَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ. (الأعراف ۷:۱۷)

اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ الْهُدٰى وَالتُّقٰى وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰى [16] اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت، تقویٰ عفاف اور مال داری کی دعا کرتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْفَقْرِ، وَالْقِلَّةِ، وَالذِّلَّةِ، وَأَعُوْذُ بِكَ أَنْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ [17] اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں فقر سے، کمی سے، ذلت سے، اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم ہو جائے۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْفَقْرِ، وَالْكُفْرِ، وَالْفُسُوْقِ، وَالشِّقَاقِ، وَالنِّفَاقِ [18] اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں غریبی سے، کفر سے، فسق سے، دشمنی سے، اور نفاق سے۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُوْعِ، فَإِنَّهُ بِئْسَ الضَّجِيْعُ. [19] اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بھوک سے، وہ بہت برا ساتھی ہے۔

آپ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ. [20] اللہ اپنے اس بندے سے محبت کرتا ہے

۱۶-اسے مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے، دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۱۲۷۵۔

۱۷-ابوداوٗد، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے ابوہریرہؓ سے نقل کی ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۱۲۸۷۔

۱۸-اسے حاکم اور بیہقی نے کتاب الدعا میں نقل کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۱۲۸۵۔

۱۹-اسے ابوداوٗد، نسائی اور ابن ماجہ نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۱۲۸۳۔

۲۰-اسے احمد اور مسلم نے سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت کیا ہے۔ دیکھیے: صحیح الجامع الصغیر ۱۸۸۲۔

جو متقی ہو، مال دار ہو اور چھپ کر رہتا ہو۔

اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

يَا عَمْرُو! نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلْمَرْءِ الصَّالِحِ. [21] ایک صالح آدمی کے لیے صالح مال بہت اچھا ہے۔

اور وہ مشہور حدیث جس میں ذکر ہے کہ اہل ثروت لوگ اونچے اونچے درجات اڑا لے گئے اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ مال دار لوگ اگر نعمت کا شکر کریں اور اس کے حقوق ادا کریں تو انھیں بعض ایسی عبادات کا موقع ملتا ہے جو غریبوں کو نہیں ملتا، اسی وجہ سے اس حدیث کے آخر میں کہا گیا ہے:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ. [22] یہ اللہ کا فضل ہے اور وہ جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کئی معزز رسولوں کی تعریف کی ہے اور ان کو شکر کی فضیلت سے متصف کیا ہے۔ جیسے انبیا میں سب سے زیادہ عمر پانے والے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۳)

وہ ایک شکر گزار بندہ تھا۔

اور ابوالانبیاء والمسلمین حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف ان الفاظ میں کی:

شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ اجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. (النحل ۱۶:۱۲۱)

وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے۔ اللہ نے ان کو منتخب کیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔

حضرت داوٗد اور سلیمان علیہ السلام کی یہ کہہ کر تعریف کی:

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ. (سبأ ۳۴:۱۳)

اے آل دووَد! عمل کرو شکر کے طریقے پر، میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہوں گے۔

۲۱-اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے، ابن حبان نے بھی اسے عمرو بن العاصؓ سے نقل کیا ہے۔

۲۲-اسے بخاری اور مسلم دونوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ بخاری ۸۴۳، ۶۳۲۹، مسلم ۵۹۵۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں حکایت بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے جب چیونٹی کی بات سنی تو انھوں نے کہا:

رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّ. (النمل ۲۷:۱۹)

اے میرے رب! مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ. (یوسف ۱۲:۱۰۱)

اے میرے رب! تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا۔

اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ان الفاظ میں احسان کیا ہے:

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَى. (الضحیٰ ۹۳:۸)

اور تیرے رب نے تجھے ناواقفِ راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ. (الضحیٰ ۹۳:۱۱)

اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔

اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر بھی احسان کیا ہے۔ فرمایا:

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○ (الأنفال ۸:۲۶)

یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے تمھارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمھیں اچھا رزق پہنچایا۔ شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور ترجیحات

جن علمائے کرام نے ترجیحات کے مسئلے پر توجہ دی اور معاشرے کو ان میں کوتاہی کرنے پر کوسا ان میں سے ایک امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ چیز ان کی انسائیکلو پیڈیا إحياء علوم الدين میں اچھی طرح سامنے آتی ہے۔ اسے قاری پوری کتاب میں اور اس کی پوری چالیس فصلوں میں محسوس کرتا ہے مگر اس کی زیادہ وضاحت اس کتاب کی فصل ذم الغرور میں ہوتی ہے۔ یہ المہلکات والے حصے کی دسویں فصل ہے۔

اس میں انھوں نے ایسے لوگوں کی کئی قسمیں ذکر کی ہیں جو غرور [خود فریبی] کی وجہ سے ہلاک ہو گئے، اور انھیں اس کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔

اس میں انھوں نے بعض اہل علم کا ذکر بھی کیا ہے، بعض عبادت گزار، بعض صوفیا، مال و دولت کے مالکان اور دوسرے عام لوگوں کے حوالے سے لکھا ہے۔ پھر ہر صنف میں غرور میں مبتلا لوگوں کے مختلف فرقے ذکر کیے ہیں اور ان کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ کس طرح نفس کے دھوکے میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے شیطانوں نے کیسے ان کے لیے برے اعمال مزین کر دیے جنھیں انھوں نے اچھا محسوس کیا۔ اس مقام پر انھوں نے لوگوں کی صفت بیان کرنے اور ان کی تصویر کشی کرنے میں بہت عمدگی اپنائی ہے اور اس کے ساتھ ضروری علاج کا مشورہ بھی دیا ہے۔

یہاں، ہم ان کے مضبوط، گہری اور ذی بصیرت نقد کی صرف دو مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

اسی سے ہم ان کی فقاہت فی الدین، مہارت فی الدنیا اور لوگوں کی ظاہری و باطنی اصلاح کے لیے

ان کے دل میں موجزن جذبے کا اندازہ لگاسکیں گے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ ترجیحات کے مسئلے کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

● اعمال کی شرعی ترتیب

پہلی مثال اعمال کی شرعی ترتیب میں خلل کے حوالے سے ہے۔ یہ مثال ان لوگوں کے بارے میں ہے جو دین دار اور عبادت گزار تھے اور نیک اعمال کرنے والے تھے مگر ان کو شیطان نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ ان کے بارے میں وہ فرماتے ہیں:

ان میں ایک فرقہ وہ ہے جنھوں نے فرائض کو غیر اہم قرار دیا ہے اور فضائل ونوافل میں مشغول ہوگئے ہیں۔ بعض اوقات وہ فضائل میں اتنے ڈوب جاتے ہیں کہ سرکشی اور اسراف تک پہنچتے ہیں۔ جیسے کسی شخص پر وضو میں وسوسہ غالب ہوتا ہے اور وہ اس میں بہت مبالغہ کرتا ہے۔ وہ اس پانی پر بھی راضی نہیں ہوتا جس کی طہارت کا شرعی فتویٰ دیا گیا ہو۔ وہ طہارت میں بعید احتمالات کو قریب سمجھتا ہے۔ لیکن اگر حرام کھانے کا مسئلہ درپیش ہو تو وہ قریب احتمالات کو بعید تصور کرتا ہے! بلکہ کبھی تو صریح حرام کو بھی کھالیتا ہے۔ اگر پانی اور طعام کے بارے میں اس احتیاط کو الٹ دیا جاتا تو یہ بات صحابہ کی سیرت کے زیادہ قریب ہوتی۔ حضرت عمرؓ نے ایک بار نصرانی لوٹے سے وضو کیا حالانکہ نجاست کا احتمال ظاہر تھا۔ اس کے ساتھ وہ بعض حلال چیزیں بھی چھوڑ دیتے تھے، اس خوف سے کہ کہیں حرام میں نہ پڑ جائیں۔[۲۳]

ایک اور فرقہ ہے جو نوافل کی بڑی حرص رکھتا ہے اور ان کو فرائض پر حاوی کرنا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں معلوم ہوتی۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان میں سے کوئی شخص نماز اشراق سے بہت خوش ہوتا ہے، تہجد بھی پڑھتا ہے اور اس طرح کے دوسرے نوافل بھی ادا کرتا ہے، مگر انھیں فرض نماز میں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی۔ اسے اول وقت پر ادا کرنے میں ان کی حرص اتنی شدید نہیں ہوتی۔ وہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کا وہ قول بھول جاتے ہیں جو

۲۳- دیکھیے ہماری کتاب: الرسول والعلم، ص ۲۰-۲۳، طبع: الرسالۃ، بیروت۔ اور الصحوۃ، قاہرہ

آپ ﷺ اپنے رب تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں:

مَا تَقَرَّبَ الْمُتَقَرِّبُوْنَ إِلَيَّ بِمِثْلِ أَدَاءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِمْ.[۲۴] کوئی عبادت گزار میرے قریب ہونے کے لیے جو طریقے استعمال کرتا ہے ان میں میرے مقرر کردہ فرائض سے زیادہ کوئی چیز کارگر نہیں ہے۔

نیک اعمال میں ترتیب کو ترک کرنا بھی شرور [یعنی معصیت] کی قبیل سے ہے۔

بلکہ بعض اوقات ایک انسان پر دو فرائض لازم ہوجاتے ہیں جن میں سے ایک فوت ہوتا ہے اور دوسرا فوت نہیں ہوتا، یا اس کے سامنے دو فضائل ہوتے ہیں جن میں سے ایک کا وقت مختصر ہوتا ہے اور دوسرے کے وقت میں وسعت ہوتی ہے اگر اس نے ان میں ترتیب کا خیال نہ رکھا تو وہ گھاٹے میں رہے گا۔

اس کی مثالیں گنتی سے باہر ہیں کیوں کہ معصیت بھی ظاہر ہے اور طاعت بھی ظاہر ہے۔ جس چیز میں پوشیدگی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان میں سے کس کو کس پر مقدم کیا جائے۔ جیسے سارے فرائض کو نوافل پر مقدم کرنا، فرائض عین کو فرائض کفایہ پر مقدم کرنا، اور پھر ایسے فرض کفایہ کو مقدم کرنا جس کا کسی اور بھلائی سے بھی تعلق ہو اس فرض کفایہ پر جس کا کسی اور نیکی سے تعلق نہ ہو۔ اہم تر فرض عین کو عمومی فرض عین پر مقدم کرنا۔ ان فرائض کو مقدم کرنا جو فوت ہوتے ہیں ان فرائض پر جو فوت نہیں ہوتے۔

یہ اسی طرح کی بات ہے جیسے والدہ کی حاجت کو والد کی حاجت پر مقدم کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ میں کس کے ساتھ بھلائی کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ۔ سوال کیا گیا: پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ۔ پھر سوال کیا گیا: اس کے بعد کس کے ساتھ؟ فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ۔ چوتھی بار سوال ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے باپ کے ساتھ۔ اس کے بعد جب ایک بار پھر سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

۲۴- اسے بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اس میں مَاتَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِيْ کے الفاظ آئے ہیں۔

أَدْنَاكَ فَأَدْنَاكَ [25] اس کے بعد جو زیادہ قریب ہو اس کے ساتھ زیادہ احسان کرو۔

چنانچہ ضروری ہے کہ جو رشتہ دار زیادہ قریب ہوں پہلے ان کی صلہ رحمی کی جائے۔ اگر رشتے میں سب برابر ہوں تو پھر جس کو صلہ رحمی کی زیادہ ضرورت ہو ان کو مقدم کیا جائے۔ اور حاجت میں بھی سب برابر ہوں تو پھر ان کو مقدم رکھے جو زیادہ متقی اور پرہیز گار ہوں۔

اسی طرح جس کا مال اتنا نہیں ہے کہ اس سے والدین کا حق بھی ادا کرے اور حج بھی کرے، تو اکثر اوقات ہوتا یہ ہے کہ وہ حج کر جاتا ہے، مگر یہ شخص بھی دھوکے میں مبتلا ہے۔ ضروری یہ ہے کہ والدین کے حق کو حج پر مقدم کیا جائے۔ یہ اہم تر فرض کے کم اہم فرض پر مقدم کرنے کے قبیل سے ہے۔

اسی طرح ایک آدمی کا کسی سے وعدہ ہو اور اسی دوران جمعے کا وقت ہو جائے تو اگر چہ وعدہ پورا کرنا فی نفسہٖ نیک کام ہے مگر اس سے جمعہ فوت ہوتا ہے۔ اس صورت میں وعدے کو وفا کرنے کے لیے جمعے کو چھوڑ دینا گناہ ہوگا۔

اسی طرح بعض اوقات آدمی کے کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں تو اس کی وجہ سے وہ اپنے والدین اور گھر والوں پر سختی کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نجاست بھی بری چیز ہے اور والدین کی ایذا رسانی بھی، مگر ان کی ایذا رسانی نجاست سے زیادہ بری چیز ہے۔

اس طرح سے ممنوع اور مطلوب اعمال کے درمیان تقابل کی مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ انھیں گنتی نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب میں جس نے ترتیب کا خیال نہیں رکھا تو وہ دھوکے میں مبتلا ہے۔ اور یہ دھوکہ زیادہ مخفی ہے کیوں کہ اس میں ایک آدمی کسی نیک کام کے بارے میں دھوکے میں ہوتا ہے مگر اسے اس کی سمجھ نہیں آتی کہ میری نیکی گناہ میں بدل چکی ہے، کیوں کہ میں نے اس کی وجہ سے ایک ایسی نیکی چھوڑ دی ہے جو اس سے زیادہ اہم تھی۔ [26]

۲۵- اسے ترمذی اور حاکم نے بہز بن حکیم سے روایت کیا ہے وہ اپنے باپ سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ یہ دوسرے الفاظ کے ساتھ صحیحین میں ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے۔

۲۶- احیاء علوم الدین ۳/۴۰۰-۴۰۴، طبع: دار المعرفة، بیروت۔

یہ ہے وہ بات جسے عظیم فقیہ امام غزالی رحمہ اللہ نے بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اسلامی انقلاب کے داعی اس کی سمجھ اور فہم کے بہت زیادہ محتاج ہیں۔ میں کچھ عرصے سے اکثر اوقات انقلابی نوجوانوں اور دینی جماعتوں کو اس چیز کی دعوت دیتا آیا ہوں جسے میں فقہ مراتب الأعمال کی اصطلاح سے یاد کرتا ہوں۔ میں انھیں کہتا ہوں کہ وہ ہر عمل کو ان کی شرعی قدر و قیمت عطا کریں اور مامورات یا منہیات کی سیڑھی میں ان کو وہی مقام دیں جو ان کا حقیقی مقام ہوتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے امام غزالی رحمہ اللہ کے ان افکار کو اتنی گہرائی سے نہیں پڑھا تھا جو انھوں نے یہاں اس مسئلے میں پیش کی ہیں اور ان کا خلاصہ ان صاف الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ تَرْكُ التَّرْتِيبِ بَيْنَ الْخَيْرَاتِ مِنْ جُمْلَةِ الشُّرُوْرِ. بھلائیوں کے درمیان ترتیب کو ترک کرنا شرور کی قبیل سے ہے۔

ان کے کلام میں مزید مثالیں بھی آجائیں گی۔

● بے محل انفاق

دوسری مثال بعض مال دار لوگوں کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ان میں جو لوگ دھوکے میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے کئی فرقے ہیں۔ ان میں سے ایک فرقہ مساجد اور مدارس اور مسافر خانوں کی تعمیر کا بڑا شوقین ہوتا ہے جو سارے لوگوں کو نظر آتے ہیں اور جن پر ان کے نام کی تختیاں لگائی جاتی ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ اس سے ان کا ذکر دائمی ہو جاتا ہے اور اس کا اثر موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے وہ بخشش کے مستحق ہو جاتے ہیں مگر اس سلسلے میں وہ دو طرح سے دھوکے میں مبتلا ہیں۔

ایک یہ کہ انھوں نے یہ مال ظلم، لوٹ کھسوٹ، رشوت اور دوسرے حرام طریقوں سے کمایا ہوتا ہے چنانچہ انھوں نے یہ مال کمانے میں بھی اللہ کے غضب کو دعوت دی ہوتی ہے اور اس کو خرچ کرنے میں بھی۔ ان پر لازم تھا کہ اس طرح کا مال پہلے تو نہ کماتے، مگر اس کے کمانے میں اللہ کی نافرمانی کرنے کے بعد ان پر توبہ اور اللہ کی طرف رجوع لازم تھا۔ اور اس مال کو اصل

صورت میں اپنے حقیقی مالکوں کے سپرد کرنا لازمی تھا یا اگر اصل صورت میں ادا نہ کر سکتے تو اس کی جگہ اس کا بدل دینا چاہیے تھا۔

مالکوں کو واپس کرنے سے عاجز ہونے کی صورت میں ان کے وارثوں کو لوٹانا تھا اور ان کے وارث بھی نہ ہوتے تو پھر ان اموال کو اہم تر مصالح کے لیے خرچ کرنا ضروری تھا۔ اور اکثر اوقات اہم تر مصلحت یہ ہوتی ہے کہ اسے غریبوں میں تقسیم کیا جائے۔ مگر یہ لوگ یہ کام نہیں کرتے۔ انھیں خوف ہے کہ یہ معاملہ لوگوں کے سامنے آئے گا۔ لہٰذا وہ اینٹوں اور پتھروں کی عمارتیں بناتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد ریاکاری، لوگوں کی طرف سے تعریف وتوصیف یا ان کا باقی رہنا ہوتا ہے۔ اور باقی رہنا بھی اس لیے نہیں کہ اس سے خیر کی اشاعت ہو بلکہ اس لیے کہ اس سے ان کا نام دنیا میں زندہ رہے۔

دوسری یہ کہ وہ اپنے اوپر اخلاص کا گمان کرتے ہیں اور ان تعمیرات سے ان کا مقصود بھلائی کرنا ہوتا ہے مگر ان میں سے کسی کو مجبور کیا جائے کہ ایک دینار ویسے خرچ کرے اور اس جگہ میں اپنا نام نہ لکھوائے جہاں یہ دینار خرچ کیا گیا ہے تو ان کا نفس انھیں اس کی اجازت نہیں دے گا۔ حالانکہ اللہ کو تو علم ہوتا ہے خواہ اس پر کسی کا نام لکھا ہو یا نہ لکھا ہو۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کی رضا چاہتا ہے نہ کہ اللہ کی رضا تو وہ اس بات کی کوئی حاجت محسوس نہ کرتا کہ اس کا نام کسی جگہ لکھا جائے۔

● مال دار اور بدنی عبادات

مال داروں کا ایک اور گروہ ہے جو اسی کام میں مشغول ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے مال کو بچا کر رکھتے ہیں، اور بخل کرتے ہوئے اسے اپنے پاس ہی رکھنے پر مصر ہوتے ہیں۔ وہ ایسی عبادات میں مشغول ہو جاتے ہیں جن میں مال خرچ کرنا نہیں ہوتا، جیسے روزے رکھنا، نماز تہجد پڑھنا، قرآن پاک کی تلاوت کرنا، وغیرہ۔ یہ لوگ بھی دھوکے میں مبتلا ہیں۔ کیوں کہ ان کے باطن پر

بخل جیسی ہلاکت خیز بیماری غالب آ چکی ہے۔ اس بیماری کو ختم کرنے کے لیے مال خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر وہ ایسے فضائل میں مصروف ہو جاتے ہیں جس کی انھیں اتنی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس کی آستین میں سانپ گھس چکا ہو جس سے اس کی ہلاکت کا خطرہ ہو اور وہ سکنجبین پکانے میں مصروف ہو' تا کہ اس کے ذریعے وہ اپنے صفراء کو پرسکون بنا سکے۔ مگر جب سانپ اسے ڈس کر ہلاک کر دے گا تو سکنجبین کا اسے کیا فائدہ ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ ایک آدمی سے کہا گیا: فلاں آدمی بہت زیادہ روزے رکھتا ہے اور نمازیں پڑھتا ہے تو اس نے کہا: وہ بے چارہ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کاموں میں دخل دے رہا ہے۔ اس کا کام یہ تھا کہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا اور مسکینوں پر خرچ کرتا، یہ اس کے لیے اس سے بہتر تھا کہ وہ اپنے آپ کو بھوکا رکھتا ہے، خود نمازیں پڑھتا ہے اور اپنی دنیا کو جمع کر کے اسے فقرا پر خرچ کرنے سے جی چراتا ہے۔

● نفل حج میں مال خرچ کرنا

امام غزالی رحمہ اللہ نے ان صاحبِ ثروت دین داروں پر بھی گرفت کی ہے جو اپنا مال نفلی حج پر خرچ کرتے ہیں اور پے در پے حج وعمرے کرتے رہتے ہیں اور ان کے پڑوسی بھوکے ہوتے ہیں۔

یہ تو وہی بات ہے جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھی کہ آخری دور میں حاجی بلا سبب بہت بڑھ جائیں گے ان کے لیے سفر کرنا آسان ہوگا، ان کے رزق میں کشادگی ہوگی، مگر وہ محروم اور خالی ہاتھ واپس آئیں گے۔ ان میں کسی آدمی کی سواری اسے پہاڑ اور صحرائیں عبور کرائے گی اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی تنگ دست ہوگا مگر یہ اس کے ساتھ غم خواری نہیں کرے گا۔

گویا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے غائبانہ طور پر ہمارے دور کو دیکھ لیا تھا اور اسی کو انھوں نے بیان کیا ہے۔

ابونصر التمار کہتے ہیں: ایک آدمی آیا وہ بشر بن الحارث [بِشر: باء مکسور، شین ساکن] سے

رخصت لے رہا تھا اور اس نے کہا کہ میں نے حج کا ارادہ کرلیا ہے، کیا آپ مجھے کوئی نصیحت کریں گے؟ انھوں نے پوچھا: سفر خرچ کے لیے کتنی رقم جمع کی ہے؟ اس نے کہا: دو ہزار درہم۔

بشر نے کہا: تمھارا حج کرنے سے کیا مقصد ہے؟ دنیا سے بے نیازی یا بیت اللہ کی زیارت کا شوق یا اللہ کی رضا؟ اس نے کہا: اللہ کی رضا۔

بشر نے کہا: اگر تم گھر میں بیٹھے رہو اور تمھیں اللہ کی رضا مل جائے، یعنی اگر تم دو ہزار درہم خرچ کرلو اور تمھیں یقین ہو کہ تمھیں اللہ کی رضا مل جائے گی تو ایسا کرلو گے؟ اس نے کہا: جی ہاں۔

بشر نے کہا: تو پھر اس کو دس قسم کے آدمیوں کو دے دو: قرض دار کو کہ وہ اپنا قرض ادا کرے، فقیر کو کہ وہ اس سے اپنا بکھرا ہوا شیرازہ سمیٹ لے، عیال دار کو کہ وہ اپنے اہل وعیال کو کھلائے، یتیم کے ذمہ دار کو کہ وہ اسے خوش کر سکے، اس سے کسی مصیبت زدہ کی مصیبت کو دور کرو، کسی کو تکلیف سے نجات دلاؤ اور کمزور کی مدد کرو، یہ تمھارے لیے فرض حج کے بعد سو عدد حجوں سے بہتر ہے۔ اب جلدی کرو، جیسا کہ ہم نے کہا ہے اس کے مطابق یہ رقم نکالو، ورنہ ہمیں صاف صاف بتادو کہ تمھارے دل میں کیا ہے۔

اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا: ابونصر! میرے دل میں سفر کا ارادہ زیادہ قوی ہے۔

حضرت بشرؒ ہنسنے لگے اور اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا: جو مال تجارت اور شبہات کے میل کچیل سے جمع کیا جائے تو نفس یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس سے اس کی کوئی حاجت پوری کی جائے۔ اور وہ مختلف نیک اعمال ظاہر کرتا ہے۔ مگر اللہ نے قسم کھائی ہے کہ وہ اس شخص کے سوا کسی کے عمل کو قبول نہیں کرتا جسے وہ پورے عزم ویقین کے ساتھ ادا کر رہا ہو۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. (البقرة ۲:۱۲۷)

اے ہمارے رب! ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے۔ تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔[۲۷]

۲۷- الاحیاء ۳/۴۰۹، نیز دیکھیے ہماری کتاب: الإمام الغزالی بین مادحیه وناقدیه، ص ۸۱-۹۳، طبع: دارالوفاء۔

بعض دوسرے علما اور ترجیحات

امام غزالیؒ کے معاصرین میں ایک علامہ راغبؒ اصفہانی (ف ۵۰۲ھ) ہیں۔ ترجیحات کے مسئلے میں ان کے کلمات بھی بڑے روشن ہیں۔ ہم نے سنن کو فرائض پر مقدم کرنے کے بارے میں ان کی ایک عبارت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: جو نفل کے بجائے فرض میں مصروف رہا وہ معذور ہے اور جو فرض کے بجائے نفل میں مصروف رہا وہ مغرور [یعنی دھوکے میں مبتلا] ہے۔

اس کے بعد ہم عالم نقاد امام ابن الجوزیؒ (ف ۵۹۷ھ) کو دیکھتے ہیں۔ انھیں معاشرتی زندگی اور اس کے مختلف طبقات کی حالت ـــــ ان کے ہاں ترجیحات کے تہ وبالا ہونے، اور ان پر شیطانی التباسات ـــــ کے حوالے سے یدطولیٰ حاصل تھی۔ اس کا اظہار ان کی کتابوں، خاص طور پر **تلبیس ابلیس، صید الخاطر، ذم الهوى**، وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ابن الجوزیؒ کی ایک اور اہم پہلو کی طرف بھی توجہ ہوئی جس کے عام لوگوں پر ترجیحات کے خراب ہونے میں گہرے اثرات ہیں۔ اور وہ ہیں موضوع اور واہیات احادیث۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنی دو بڑی کتابیں یعنی **الموضوعات** اور **العلل المتناهية في الأحاديث الواهية** تالیف کیں۔

اس کے بعد ہمیں سلطان العلماء عزالدین بن عبدالسلامؒ (ف ۶۶۰ھ) ملتے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ترجیحات کے مسئلے میں دور رس نگاہیں اور صائب فکر عطا کی تھی جس کے آثار ان کی بنیادی کتاب **قواعد الأحكام في مصالح الأنام** میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ہم نے دوسری فصل میں ان کے چند فقرے نقل کیے تھے۔ وہ اتنے روشن ہیں کہ اس مضمون پر اچھی طرح دلالت کرتے ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ترجیحات

ان ائمہ ہدیٰ میں جن کو اللہ تعالیٰ نے ترجیحات کے مسئلے میں رسوخ عطا کیا تھا، ایک شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (ف ۷۲۸ھ) ہیں اور ان کے محقق شاگرد امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ (۷۵۱ھ) بھی اسی نہج پر چلے تھے۔

میں نے اپنی کتاب: أولويات الحركة الإسلامية میں دو فصلیں شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں سے نقل کی ہیں جو اس میدان میں ان کی فکر اور فقاہت کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ میں نے انھیں کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل کیا تھا۔

شیخ کی کتابوں، ان کے رسائل، ان کے فتاویٰ اور دوسرے اقوال میں بہت کچھ ہے جس سے اس موضوع پر استدلال کیا جاسکتا ہے اور جس سے آدمی اطمینان حاصل کرسکتا ہے، کیوں کہ انھوں نے اپنی آرا ہدایاتِ الٰہی اور ہدایاتِ نبوی کے منابع سے حاصل کی ہیں۔ ہم یہاں ان میں سے دو مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ یہ اس مقام پر ان شاءاللہ ہمارے اطمینان کے لیے کافی ہوں گی۔

● **اختلافاتِ حالات اور فضیلتِ عمل**

اس سلسلے میں پہلی مثال جیسا کہ میں نے اپنی کتاب الصحوة الإسلامية بين الجحود والتطرف میں بتایا ہے، اس حوالے سے ہے کہ عمل کی فضیلت احوال وظروف کے اختلاف کے ساتھ اور لوگوں کا دل رکھنے کے لیے مختلف ہوتی ہے۔

امام رحمہ اللہ کافی بحث ومناقشہ کے بعد فرماتے ہیں:

ایک ہی عمل ہوتا ہے کبھی اس کا کرنا مستحب ہوتا ہے اور کبھی ترک، اس اعتبار سے کہ کبھی شرعی دلائل کے ساتھ ایک فعل کا کرنا راجح ہوتا ہے اور کبھی اس کا نہ کرنا۔ ایک مسلمان بعض اوقات کسی ایسے مستحب فعل کو ترک کردیتا ہے جس کے کرنے میں کوئی ایسا فساد ہوتا ہے جو اس کی مصلحت پر غالب ہوتا ہے۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے بیت اللہ کی تعمیر ان بنیادوں پر اٹھانے سے اجتناب فرمایا جن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے اٹھایا تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

لَوْ لَا قَوْمُكَ حَدِيثُو عَهْدٍ بِالْجَاهِلِيَّةِ لَنَقَضْتُ الْكَعْبَةَ، وَلَأَلْصَقْتُهَا بِالْأَرْضِ وَلَجَعَلْتُ لَهَا بَابَيْنِ، بَابًا يَدْخُلُ النَّاسُ مِنْهُ، وَبَابًا يَخْرُجُونَ مِنْهُ. اگر تیری قوم نئی نئی جاہلیت سے [اسلام میں] نہ آئی ہوتی تو میں کعبے کو ڈھا کر اس کو زمین کے ساتھ برابر کردیتا اور اس میں دو دروازے بنالیتا ایک اندر داخل ہونے کے لیے اور ایک باہر نکلنے کے لیے۔

یہ حدیث صحیحین میں آئی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبی ﷺ نے وہ کام ترک فرمایا جو آپ ﷺ کے نزدیک افضل تھا مگر اس کے خلاف ایک بات ایسی تھی جو فساد کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ وہ بات یہ تھی کہ قریش کے لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور اس کام میں ان کی بغاوت کا خطرہ تھا چنانچہ اس کا فساد اس کی مصلحت پر بھاری تھا۔

اس وجہ سے ائمۂ کرام مثلاً احمد وغیرہ نے یہ بات مستحب قرار دی ہے کہ امام مقتدیوں کی تالیف قلب کے لیے کوئی ایسا کام چھوڑ دے جو اس کے نزدیک افضل ہو۔ مثلاً یہ کہ اس کے نزدیک افضل یہ ہو کہ دو رکعتوں پر سلام پھیرے اور وتر کی ایک رکعت الگ ادا کرے، مگر وہ ایسے لوگوں کو نماز پڑھا رہا ہو جو وتر کو اکٹھا ہی پڑھتے ہیں۔ یہاں اگر اس کے لیے افضل پر عمل ممکن نہ رہا تو اس کے بدلے میں اس نے لوگوں کی تالیف قلب کی جو مصلحت اپنائی ہے وہ اس کے لیے افضل پر عمل کرنے سے زیادہ راجح ہے اور اس کی مصلحت اس مصلحت سے راجح ہے جو

افضل کی صورت پر عمل کرنے میں ملحوظ تھی۔ اس لیے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں کراہت محسوس کرتے۔ اسی طرح اگر ایک آدمی ان لوگوں میں سے ہے جو بسم اللہ کو خاموشی سے پڑھنا افضل سمجھتے ہیں یا اسے جہراً پڑھنا افضل قرار دیتے ہیں اور مقتدی اس کی رائے کے خلاف ہوں تو اس کے لیے مفضول پر عمل کرنا، اس مصلحت کی وجہ سے کہ وہ ان کے ساتھ موافقت اختیار کر کے ان کی دلجوئی کرتا ہے، جائز ہے۔ کیوں کہ یہ مصلحت اس مصلحت کے مقابلے میں راجح ہے جو افضل پر عمل کرنے کی صورت میں حاصل ہوتا۔

اسی طرح اگر ایک آدمی افضل کے خلاف عمل کرتا ہے اس مقصد کے لیے کہ سنت کا بیان ہو جائے اور ان کو تعلیم دینے کا موقع مل سکے جن کو سنت کا علم نہیں ہوتا تو یہ مستحسن ہوگا۔ مثلاً ایک آدمی نماز کے آغاز میں تعوذ اور تسمیہ میں جہر کرتا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ نماز میں اس کا پڑھنا جائز اور حسن ہے۔ جیسا کہ حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر جہر کیا۔ انھوں نے تکبیر کے بعد کہا:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ اسْمُكَ، وَتَعَالٰى جَدُّكَ، وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ.

اے اللہ! تو پاک ہے، تعریف تیرے لیے ہے، تیرا نام مبارک اور تیری شان اونچی ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

اسود بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے ستر سے زیادہ نمازیں پڑھی ہیں۔ وہ جب تکبیر کرتے تو اس کے بعد یہ پڑھتے تھے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ اسی وجہ سے یہ استفتاح مشہور ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ اب اکثر لوگ اس پر عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ تعوذ جہر کے ساتھ پڑھتے تھے، اور کئی صحابہ کرام بسم اللہ جہر کے ساتھ پڑھتے تھے۔ یہی معاملہ جمہور ائمہ کے ہاں بھی ہے جو مستقل طور پر اسے جہر کے ساتھ پڑھنا سنت نہیں کہتے مگر جب لوگوں کو اس کی تعلیم کا معاملہ درپیش ہو تو وہ بھی اس کے پڑھنے کو سنت کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے حدیث

صحیح میں ثابت ہے کہ انھوں نے ایک جنازے پڑھایا تو انھوں نے اس میں سورۂ فاتحہ جہر کے ساتھ پڑھی۔ اور پھر کہا کہ میں نے یہ اس لیے کیا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ بھی سنت ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جنازے میں لوگوں کے دو اقوال ہیں:

بعض کے نزدیک اس میں قرأت کسی حال میں جائز نہیں ہے جیسا کہ زیادہ تر سلف نے کہا ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔

اور بعض کہتے ہیں اس میں قرأت سنت ہے، جیسا کہ امام شافعی اور احمد کا قول ہے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث اور بعض مزید دلائل ہیں۔

پھر ان میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں قرأت اسی طرح واجب ہے جیسے نماز میں۔

اور بعض کہتے ہیں کہ یہ سنت مستحبہ ہے، واجب نہیں ہے۔ یہ قول تینوں میں سے معتدل قول ہے۔ کیوں کہ سلف میں بہت سے لوگوں نے یہ کیا ہے اور بہت سوں نے وہ کیا ہے۔ ان کے ہاں دونوں فعل مشہور ہو چکے ہیں۔ وہ قرأت کے ساتھ بھی جنازہ پڑھتے تھے اور بغیر قرأت کے بھی۔ اسی طرح کبھی بسم اللہ بالجہر پڑھتے تھے اور کبھی بغیر جہر کے۔ اور اسی طرح کبھی ثنا پڑھتے تھے اور کبھی نہیں پڑھتے تھے۔ کبھی رفع الیدین کرتے تھے اور کبھی نہیں کرتے تھے۔ کبھی دو سلام کرتے تھے اور کبھی ایک ہی سلام۔ کبھی امام کے پیچھے خاموشی سے پڑھتے تھے اور کبھی نہیں پڑھتے تھے۔ جنازے پر کبھی چار تکبیریں پڑھتے تھے کبھی پانچ اور کبھی سات۔ اور ایک ہی نماز میں وہ لوگ بھی ہوتے جو اِس مذہب پر عمل پیرا ہوتے اور وہ بھی جو اُس مذہب پر عمل پیرا ہوتے۔ یہ ساری باتیں خود صحابہ سے ثابت ہیں۔

اسی طرح ان سے یہ بھی ثابت ہے کہ ان میں سے کوئی اذان میں ترجیع[28] کرتا تھا اور کوئی نہیں کرتا تھا۔ اور ان میں کوئی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اقامت میں ایتار[29] کرتا تھا اور کوئی

۲۸۔ بعض جملوں کو چار بار دہرانا۔

۲۹۔ یعنی قد قامت الصلاۃ کے علاوہ سارے جملوں کو ایک بار پڑھنا

شفع[۳۰] کرتا تھا۔ اور یہ دونوں طریقے نبی ﷺ سے ثابت ہیں۔

یہ سارے امور ایسے ہیں کہ ان میں اگرچہ ایک راجح اور ایک مرجوح ہوتا ہے، جس نے مرجوح پر عمل کیا اس نے بھی ایک جائز عمل کیا اور بعض اوقات تو ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جس نے مرجوح پر عمل کیا ہے وہ کسی مصلحت کی وجہ سے راجح بن جائے۔ جیسا کہ یہ ہوسکتا ہے کہ کبھی راجح عمل کسی مصلحت کی وجہ سے مرجوح بن جائے۔

یہ معاملہ عمومی اعمال کے بارے میں ہے۔ وہ عمل جو فی نفسہ افضل ہو بعض مواقع پر غیر افضل بن جاتا ہے۔ جیسا کہ جنس نماز افضل ہے جنس قرأت سے اور جنس قرأت افضل ہے جنس ذکر سے اور جنس ذکر افضل ہے جنس دعا سے۔ پھر فجر اور عصر کے بعد نماز ممنوع ہے اور ان اوقات میں تلاوت اور ذکر اور دعا اس سے بہتر ہیں۔ اسی طرح رکوع اور سجدے میں قرأت ممنوع ہے اور اس میں ذکر افضل ہے۔ اور نماز کے آخر میں تشہد سے پہلے دعا ذکر سے بہتر ہے۔

بعض اوقات کوئی مفضول عمل کسی معین شخص کے حق میں افضل ہوتا ہے کیوں کہ وہ افضل سے عاجز ہوتا ہے یا یہ کہ مفضول کے ساتھ اسے زیادہ محبت اور رغبت ہوتی ہے، وہ اس کا زیادہ اہتمام کرتا ہے اور اس میں لذت محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے لیے افضل بن جاتا ہے کیوں کہ اس سے اس کو مزید عمل کے لیے رغبت اور خواہش ہوگی اور وہ اس سے خوب متمتع ہوگا۔ جیسا کہ ایک مریض اپنی پسندیدہ دوا سے جس قدر فائدہ حاصل کرتا ہے اتنا فائدہ وہ اس دوا سے نہیں حاصل کرسکتا جو اسے ناپسند ہے۔ اگرچہ اس کی جنس افضل ہو۔

اسی بنا پر بعض لوگوں کے لیے بعض اوقات ذکر افضل ہوتا ہے قرأت سے، اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے بعض اوقات قرأت افضل ہوتی ہے نماز سے۔ اور اس طرح کی اور مثالیں لی جاسکتی ہیں۔ ان میں یہ تفضیل جو آتی ہے تو اسی وجہ سے کہ ان میں اس کے لیے نفع زیادہ ہوتا ہے نہ اس وجہ سے کہ وہ فی نفسہ افضل یا مفضول ہیں۔

۳۰- سارے جملوں کو دوبارہ دہرانا

یہ باب کسی عمل کے فرض یا حرام ہونے کا نہیں، بلکہ کسی عمل کے افضل یا مفضول ہونے کا ہے۔ اور ان چیزوں میں بہت سے اعمال حالات کے مختلف ہونے سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ اگر اس تنوع کا خیال نہ رکھا جائے تو بہت سے اعمال میں اضطراب پیدا ہو جائے گا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب کسی عمل کے استحباب یا اس کے راجح ہونے کا یقین کر لیتے ہیں تو اس کی اتنی پابندی کرتے ہیں جتنی واجبات کی بھی نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اس پر معاملہ خواہش اور جاہلی تعصب وحمیت تک پہنچ جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ اسے ان لوگوں میں دیکھ سکتے ہیں جو ان امور میں سے کسی امر کو اختیار کرتے ہیں اور اسے اپنے مذہب کا شعار بنا لیتے ہیں۔

اور ان میں سے کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں کہ جب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں چیز کا ترک کرنا افضل ہے تو اس کے ترک کی اتنی پابندی کرتے ہیں جتنی کسی حرام سے بچنے کی نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ معاملہ خواہش اور حمیت جاہلیہ تک پہنچ جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ اسے ان لوگوں میں دیکھ سکتے ہیں جو کسی چیز کا ترک اپنے مذہب کا شعار بنا لیتے ہیں۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں اور یہ سب کچھ غلط ہے۔

ضروری یہ ہے کہ ہر ذی حق کو اس کا حق دیا جائے۔ کسی معاملے کو اتنی وسعت دی جائے جتنی وسعت اللہ اور اس کے رسول نے دی ہو، اور کسی چیز سے اتنی الفت رکھی جائے جتنی کہ اللہ اور اس کے رسول نے اس کے ساتھ رکھی ہو۔ اس میں انھی مصلحتوں اور مقاصد شرعیہ کا خیال رکھا جائے جو اللہ اور اس کے رسول کے ہاں پسندیدہ ہوں۔ ہر معاملے میں یہ جانا جائے کہ سب سے بہتر کلام اللہ کا کلام ہے اور سب سے بہتر سیرت نبی ﷺ کی سیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے اور انھیں ہر معاملے میں دنیا و آخرت دونوں کی سعادت عطا فرمائی ہے۔ یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کے پاس اس بات کی تفصیل موجود ہو جو اس اجمال کی وضاحت کرے۔ اگر یہ نہ ہوگا تو بہت سے لوگ اسے مجمل صورت میں ضروری سمجھیں گے اور جب تفصیل کا موقع آئے گا تو اسے چھوڑ دیں گے، جہالت کی وجہ سے یا ظلم اور سرکشی کی

بنا پر، یا پھر خواہشات کی پیروی میں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں سیدھا راستہ دکھادے۔ ان لوگوں کو راستہ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے، جو انبیا ہیں، صدیقین ہیں، شہدا ہیں اور صالحین ہیں، یہ لوگ بہترین رفیق ہیں۔[31]

اس فقاہت کی روشنی میں امام حسن البنا رحمہ اللہ سے جب اختلاف کرنے والوں نے نماز تراویح کے بارے میں سوال کیا گیا کہ ہم بیس رکعت پڑھیں جیسا کہ حرمین وغیرہ میں ہوتا ہے اور وہی ائمہ اربعہ کا مشہور مذہب ہے، یا آٹھ پڑھیں جیسا کہ بعض سلفیوں کا اصرار ہے؟ یہ سوال امام حسن البنا سے اس وقت کیا گیا تھا کہ اس بستی والے اس مسئلے پر لڑنے کے قریب تھے تو ان کا جواب یہ تھا کہ نماز تراویح سنت ہے اور مسلمانوں کا اتحاد فرض ہے۔ ہم ایک فرض کو کسی سنت کی وجہ سے کیوں ترک کردیں؟! اگر یہ لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھیں اور آپس میں لڑنے جھگڑنے اور دشمنی کرنے سے محفوظ رہیں تو یہ زیادہ بہتر اور درست ہوگا۔

● بھلائی اور برائی میں تعارض

دوسری مثال جسے میں نے اپنی کتاب **أولويات الحركة الإسلامية** کے آخر میں دوسرے ضمیمے کے طور پر شامل کیا ہے اور اسے عنوان دیا ہے: **فصل جامع في تعارض الحسنات والسيئات** [برائیوں اور بھلائیوں کے بارے میں ایک جامع فصل]۔

اس میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ بھلائیوں کے کچھ فوائد ہوتے ہیں اور اگر وہ واجب ہوں تو ان کے ترک میں نقصانات ہوں گے، اور دوسری طرف برائیوں میں نقصان ہے اور مکروہ میں کچھ نقصانات اور کچھ فوائد ہیں۔

۱- اب تعارض یا تو دو بھلائیوں کے درمیان ہوگا جن کو آپس میں جمع کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس کا حل یہ ہوگا کہ جو احسن ہوگا اس کو مقدم کیا جائے گا اور مرجوح کو فوت ہونے دیا جائے گا۔

۳۱- مجموع الفتاوی، شیخ الاسلام ۲۴/ ۱۹۵-۱۹۹۔

جیسے واجب اور مستحب کے درمیان تعارض، فرض عین اور فرض کفایہ کے درمیان تعارض، یا مانگے جانے والے قرض کی ادائیگی کو نفل صدقے پر مقدم رکھنا۔

۲- یا تعارض دو برائیوں کے درمیان ہوگا اور ان دونوں سے بیک وقت بچنا ممکن نہیں ہوگا بلکہ ایک میں مبتلا ہونا لازمی ہوگا۔ اس کا حل یہ ہے کہ زیادہ برائی کو دفع کیا جائے اور ادنیٰ کو برداشت کیا جائے۔ جیسے اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے کو غیر معین جہاد پر خرچ کرنے سے مقدم کرنا، یا والدین پر خرچ کو اسی قسم کے جہاد پر خرچ کرنے سے مقدم کرنا۔ حدیث صحیح میں آیا ہے: پوچھا گیا: کون سا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اَلصَّلَاةُ عَلَى وَقْتِهَا. وقت پر نماز ادا کرنا۔ پوچھا گیا: اس کے بعد؟ فرمایا: ثُمَّ بِرُّ الْوَالِدَيْنِ. پھر والدین کے ساتھ نیک سلوک۔ پوچھا گیا: پھر کون سا عمل؟ فرمایا: ثُمَّ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ. پھر اللہ کی راہ میں جہاد۔ اسی طرح جہاد کو حج پر مقدم کرنا، جیسا کہ کتاب وسنت میں ہے، اس شخص پر لازم ہے جس پر دونوں چیزیں لازم ہوں اور اس شخص پر مستحب ہے جس پر دونوں چیزیں مستحب ہوں۔

اور قرأت قرآن کو ذکر پر مقدم کرنا جب قلبی اور زبانی عمل ہونے کے لحاظ سے دونوں برابر ہوں۔ اور نماز کو ان دونوں پر مقدم کرنا جب وہ قلبی عمل ہونے میں ان دونوں کے ساتھ شریک ہوجائے۔ اگر یہ شرطیں نہ ہوں تو کبھی فہم اور جذبے کے ساتھ ذکر کو اس قرأت پر مقدم کیا جاسکتا ہے جو گلے سے نیچے نہ اترتی ہو۔ یہ ایک وسیع باب ہے۔

۳- یا یہ تعارض ایک بھلائی اور ایک برائی کے درمیان ہوگا اور دونوں کو الگ کرنا ممکن نہیں ہوگا، بلکہ اگر بھلائی کرتے ہیں تو اس کے ساتھ برائی لازم آتی ہے اور اگر برائی چھوڑتے ہیں تو اس کے ساتھ بھلائی کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ تو یہ دیکھا جائے کہ دونوں کے چھوڑ دینے میں زیادہ فائدہ ہے یا دونوں کے کرنے میں۔ پھر اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔

جیسے ہجرت کرنے والی خاتون کا کسی محرم کے بغیر سفر ہجرت اختیار کرنا بمقابلہ اس کے کہ

وہ دارالحرب میں مقیم رہے۔ جیسا کہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے کیا تھا جس کے بارے میں سورۂ ممتحنہ کی آیات نازل ہوئیں:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَکُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُھٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْھُنَّ.

(الممتحنة۶۰:۱۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمھارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو۔

یہی معاملہ جہاد کے باب میں بھی ہے۔ اس میں اصول تو یہ ہے کہ بچے اور خواتین وغیرہ جو مسلمانوں کے خلاف جنگ نہیں کرتیں ان کو قتل کرنا حرام ہے، مگر جب جنگ ایسی ہو کہ ان کو بھی نشانہ بنانا پڑتا ہو جیسے اگر منجنیق سے ان کی کسی جگہ کو نشانہ بنائیں، یا رات کے وقت حملہ ضروری ہو تو پھر درمیان میں اس طرح کے لوگ مر جائیں یہ بھی جائز ہوگا۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ طائف کا محاصرہ کیا گیا تو ان کے قلعوں کو منجنیق سے نشانہ بنایا گیا اور رات کے وقت ان میں سے ایسے لوگ بھی نشانہ بن گئے جو سو رہے تھے، مگر یہ فتنے کو دفع کرنے کے لیے ضروری تھا اور اس میں ایسے لوگوں کو مارنا جائز تھا جن کا قتل مقصود نہیں تھا۔

اسی طرح تَتَرُّس کا مسئلہ بھی ہے، جس کو فقہا نے ذکر کیا ہے۔[۳۲] تو چونکہ جہاد اس لیے ہوتا ہے کہ کفر کے فتنے کو دفع کیا جائے اور اس بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان گوارا کرنا پڑے گا۔ اسی بنا پر فقہا کے درمیان اتفاق ہے کہ جب مسلمانوں سے ضرر کو دفع کرنا اس کے بغیر ممکن نہ ہو کہ ان ڈھال بنائے جانے والوں کو قتل کریں تو یہ جائز ہوگا۔ اگر ان کے قتل کا نقصان زیادہ ہو لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ ہو تو اس میں دو قول ہیں۔

۴- یا ایک بھلائی اور ایک برائی کے درمیان تعارض ہوگا اور دونوں کو الگ کرنا ممکن ہوگا۔

۳۲- یعنی اس صورت میں جب کہ کافر کسی بچے یا عورت یا اپنے ملک کے کسی مسلمان کو سامنے رکھے تا کہ مسلمان ان کو نشانہ بنانے سے ہچکچائیں اور اس طرح ان کے فوجی محفوظ رہیں۔ (مترجم)

جیسے اضطرار کی حالت میں مردار کا گوشت کھانا۔ یہاں کچھ کھا لینا 'حسن' اور 'واجب' ہوتا ہے اور وہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی حرام کھائے۔ اور اسی کی 'مصلحت' غالب ہے۔

اس کے برعکس حرام دوائی کا معاملہ ہے۔ اس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے علاج سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ اس کے نتیجے میں ہونے والے نقصان سے کم ہے۔ اور دوسری طرف اس 'صحت یابی' کا یقین بھی نہیں ہے۔ اسی طرح شراب کو دوا کے طور پر استعمال کرنے کا معاملہ بھی ہے۔

معلوم ہوا کہ برائی کو دو مقامات پر برداشت کیا جاسکتا ہے ایک اس مقام پر جہاں زیادہ برائی کو روکنا مطلوب ہو اور وہ برائی اس کے بغیر دفع نہ ہوسکتی ہو کہ چھوٹی برائی کا ارتکاب کیا جائے۔ اور دوسرا اس مقام پر کہ اس برائی کے ارتکاب سے کسی ایسی چیز کا حصول مطلوب ہو جس کا نفع اس برائی کے ارتکاب کی صورت میں ہونے والے نقصان سے زیادہ ہو۔

اور بھلائی کو دو مقامات پر چھوڑا جاسکتا ہے: ایک اس صورت میں جب یہ اپنے سے زیادہ حسن چیز کے فوت ہونے کا ذریعہ بنے۔ اور دوسرا یہ کہ وہ ایک ایسی برائی کو اپنے ساتھ لائے جس کا نقصان اس بھلائی کے فائدے سے زیادہ ہو۔ یہ سب کچھ دینی موازنات کے ساتھ متعلق ہے۔

رہی یہ بات کہ کوئی واجب اس وجہ سے ساقط ہو جائے کہ اس میں دنیا کا نقصان ہے یا کسی حرام کو اس وجہ سے مباح قرار دیا جائے کہ دنیا میں اس کا احتیاج ہے جیسے روزے کو سفر کی وجہ سے ساقط کیا گیا ہے اور احرام یا نماز کے بعض ارکان کو بیماری کی وجہ سے ساقط کیا جاتا ہے، تو یہ ایک اور باب ہے جو دین میں وسعت اور عدم حرج میں شامل ہے جس کے حوالے سے قوانین میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

رہا پہلا باب تو اس کی جنس ایسی ہے کہ اس میں قوانین کا اختلاف ممکن نہیں ہوتا، اگرچہ عین کے لحاظ سے وہ بدل جائیں، بلکہ یہ تو عقلاً بھی ثابت ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: عاقل وہ

نہیں ہے جو خیر اور شر میں تمیز کر سکے، بلکہ وہ ہے جو دو خیرین میں سے زیادہ خیر اور دو شرین میں سے زیادہ شر کی پہچان کر سکے۔ شاعر کہتا ہے:

إِنَّ اللَّبِيبَ إِذَا بَدَا مِنْ جِسْمِهِ   مَرَضَانِ مُخْتَلِفَانِ دَاوَى الْأَخْطَرَا

عقل مند وہ ہے جس کے جسم میں اگر دو بیماریاں ظاہر ہوں تو وہ ان میں سے اسی کا علاج پہلے کرتا ہے جو زیادہ خطرناک ہو۔

یہ بات سارے امور کے بارے میں ہے۔

اسی وجہ سے لوگوں کی عقل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ جب بارش نہ ہو رہی ہو تو ان دنوں میں بارش ان کے لیے رحمت ہوتی ہے، اگر چہ اس کے ذریعے زمین سے جو غلے پیدا ہوتے ہیں اس سے ظالم اقوام کو ان پر ظلم کرنے کے لیے مزید قوت مل جاتی ہے، مگر بارش نہ ہو تو یہ ان کے لیے زیادہ نقصان کی بات ہے۔ اسی طرح لوگ سلطان کے وجود کو اس کے عدم وجود پر ترجیح دیتے ہیں اگر چہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ کسی عاقل کا قول ہے کہ ظالم حکمران کے ساٹھ سال اس سے بہتر ہیں کہ لوگوں کا کوئی حکمران نہ ہو۔

پھر حکمران سے اپنے ظلم اور سرکشی کے حوالے سے یا ان حقوق کے حوالے سے پوچھا بھی جا سکتا ہے جن کو وہ ناجائز طور پر لوگوں سے چھینتا ہے۔ لیکن میں یہاں کہتا ہوں کہ جو شخص اقتدار کا مالک بن جاتا ہے یا اس کے بعض فروع کا ذمہ دار بنتا ہے جیسے امارت، ولایت، یا قضا وغیرہ، تو اگر اس کے لیے اس کی ذمہ داریاں ادا کرنا اور اس کے محرمات سے بچنا ممکن نہ ہو مگر یہ انھی امور کا ارادہ کرتا ہے جن کی یہ استطاعت نہیں رکھتا جبکہ دوسرے ان کی استطاعت رکھنے کے باوجود اسے انجام نہیں دیتے، تو اس کے لیے ولایت جائز ہے، بلکہ کبھی تو اسی کی ولایت واجب ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ولایت ان واجبات میں سے ہے جس کے مصالح کو حاصل کرنا ضروری ہے، جیسے دشمن کے خلاف جہاد، مال غنیمت کی تقسیم، حدود کا اجرا اور امن

و امان کا قیام وغیرہ، تو اس ولایت کا قیام بھی ضروری ہو گیا۔ مگر جب یہ کام اس کے بغیر ممکن نہیں کہ کسی غیر مستحق کو ہی حکمران بنا دیا جائے اور بعض ناجائز امور انجام دیے جائیں، اور کسی کو بعض ایسی چیزیں دی جائیں جن کا وہ مستحق نہیں تھا اور اس کے لیے ان کا ترک بھی ممکن نہیں ہوتا، تو یہ مسئلہ اس باب سے بن جائے گا کہ مَا لَا يَتِمُّ الْوَاجِبُ أَوِ الْمُسْتَحَبُّ إِلَّا بِهِ فَيَكُونُ وَاجِبًا أَوْ مُسْتَحَبًّا [جس چیز کے بغیر کسی واجب یا مستحب کا حصول ممکن نہ ہو تو اس چیز کو حاصل کرنا واجب یا مستحب بن جاتا ہے] البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ اس غیر کا فساد اُس واجب یا مستحب کی مصلحت کے مقابلے میں کم ہو۔ [مطلب یہ کہ اس فعل سے ہمیں نقصان کم اور فائدہ زیادہ حاصل ہو رہا ہو]۔ بلکہ اگر ولایت واجب نہ ہو اور وہ کسی ظلم پر مشتمل ہو اور جو شخص ولایت حاصل کرے گا وہ ظلم کو قائم کرے گا اور دوسرا شخص ولایت کا ارادہ اس لیے کرتا ہے کہ ظلم کو کم کر لے، اور اس سلسلے میں زیادہ ظلم کو دفع کرنے کے لیے کم بری چیز کو اپناتا ہے، تو اس نیت کے ساتھ اس کا یہ اقدام جائز ہو گا۔ اور یہ جو چھوٹا گناہ اس نیت سے کرتا ہے کہ اس نقصان کو دفع کرے جو زیادہ ہے تو یہ درست ہو گا۔

یہ وہ باب ہے جس میں نیتوں اور مقاصد کے لحاظ سے تبدیلی آتی ہے۔ مثلاً ایک ظالم اور طاقت ور نے کسی سے مال کا مطالبہ کیا، اور وہ مجبور ہے کہ اسے مال دے دے۔ اس دوران ایک اور آدمی ان کے درمیان میں آتا ہے اور مظلوم کے اوپر سے زیادہ ظلم کو دفع کرنے کے لیے اس سے نرمی کے ساتھ مال لے لیتا ہے اور اسے ظالم کے سپرد کرتا ہے کہ مال لے لو مگر اسے کچھ نہ کہو، اور اس طریقے سے مظلوم کی جان اور عزت بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ ایک اچھا اقدام ہے۔ مگر یہ اس نیت سے درمیان میں آئے کہ ظالم کا حامی بنے تو گناہ گار ہو گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان اشیا میں نیت اور عمل کا فساد دیکھنا چاہیے۔ نیت کا فساد یہ ہے کہ اس اقدام سے اس کا مقصد حکمرانی اور مال حاصل کرنا ہو، اور عمل کا فساد یہ کہ اس کا مقصد محرمات کا ارتکاب اور واجبات کو ترک کرنا ہو۔ وہ یہ اقدام اس لیے نہیں کرتا کہ حرام اور حلال میں تعارض

آ گیا ہے یا اسے زیادہ صالح اور زیادہ نفع بخش کی تلاش ہے۔

پھر حکمرانی، خواہ جائز ہو، یا مستحب ہو، یا واجب، مگر کسی خاص آدمی کے بارے میں اس کے بجائے کوئی اور چیز زیادہ واجب یا زیادہ محبوب ہوگی، اس صورت میں اس کو کبھی وجوباً اور کبھی استحباباً **خیر الخیرین** [دو اچھی چیزوں میں جو زیادہ اچھی ہو] کو مقدم کرنا چاہیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو شاہِ مصر کی طرف سے خزائن الارض کی ولایت دیا جانا اسی باب سے تھا، بلکہ انھوں نے خود ہی مطالبہ کیا تھا کہ انھیں زمین کے خزانوں کا ذمہ دار بنایا جائے۔ وہ بادشاہ اور اس کی قوم کافر تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ...... (المؤمن ۴۰:۳۴)

اس سے پہلے یوسف تمھارے پاس بینات لے کر آئے تھے مگر تم ان کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ (یوسف ۱۲:۳۹)

اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں۔

یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ ان کے کفر کے باوجود یہ بات ضروری ہے کہ ان کے ہاں کوئی نہ کوئی اصول ہوگا جس کے ذریعے وہ لوگوں سے مال لیتے ہوتے تھے اور اسے حکمران، اس کی فوج اور اس کے نوکر چاکروں پر خرچ کرتے ہوتے تھے، اور یہ طریقہ انبیا کی سنت اور ان کے

عدل میں شامل نہیں تھا۔ مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اللہ کے دین کو نافذ کرنے کے لیے جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ اپنے پہلے شاہی فرمان میں کرنے کا اعلان کرتے، ورنہ قوم اس کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوتی۔ چنانچہ انھوں پہلے وہی عدل واحسان کیا جو اُن کے لیے ممکن تھا۔ انھوں نے حکومت کے ذریعے اپنے اہل بیت کا اکرام کیا، جو اس کے بغیر ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں داخل ہے کہ

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ. (التغابن ۶۴:۱۶)

جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔

جب دو واجب کام ایک ساتھ آ جائیں اور ان دونوں کو ایک ساتھ انجام دینا ممکن نہ ہو تو جو زیادہ تاکیدی ہوگا اسی کو مقدم کیا جائے گا۔ اس صورت میں دوسرا واجب نہیں رہے گا، اور جس نے اسے چھوڑ دیا، اس مقصد کے لیے کہ اس نے زیادہ تاکیدی کو اپنایا تو یہ فی الحقیقت واجب کا تارک شمار نہیں ہوگا۔

اسی طرح جب دو حرام ایک ساتھ آ جائیں جن میں اگر چھوٹے کو اپنائیں گے نہیں تو بڑے میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو، اس صورت میں ادنیٰ کو اختیار کرنا فی الحقیقت حرام نہیں ہوگا۔

اگر اطلاق کے اعتبار سے اُسے ترکِ واجب اور اِسے فعلِ حرام کا نام دیا جائے تو اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ اس طرح کے مسئلے میں کہا جا سکتا ہے کہ واجب کو عذر کی وجہ سے ترک کیا گیا اور حرام کو ایک راجح مصلحت، یا ضرورت و احتیاج یا زیادہ حرام کی وجہ سے اختیار کیا گیا۔

یہ تعارض کا باب ہے اور یہ ایک بہت وسیع باب ہے۔ خاص طور پر اُس دور میں اور اُس مقام پر جس میں نبوت اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے آثار کم ہو چکے ہوں۔ ان مقامات اور ادوار میں یہ مسائل بہت پیش آتے ہیں۔ اور ان کا موجود ہونا امت میں فتنے کا سبب بنتا ہے۔ جب نیکیاں برائیوں کے ساتھ خلط ملط ہو جائیں تو اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے

ہیں جو نیکیوں کو دیکھتے ہیں اور انھی کو راجح قرار دیتے ہیں، خواہ اس کے ساتھ زیادہ برائیاں ہی کیوں نہ آجائیں۔ اور بعض لوگ ہوتے ہیں جو برائیوں پر نظر رکھتے ہیں اور اسی پہلو کو راجح قرار دے لیتے ہیں اگرچہ ان کی وجہ سے بڑی بھلائیاں ہی کیوں نہ چھوٹ جائیں۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو متوسط الحال ہوتے ہیں وہ دونوں امور کا خیال رکھتے ہیں۔

ایک عالم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان مسائل کی انواع میں فکر وتدبر کرے۔ بعض اوقات ـــ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے ـــ ضروری ہوتا ہے کہ بعض اشیا میں امر و نہی میں عفو سے کام لیا جائے یعنی اس کے بارے میں نہ حلال ہونے کا حکم دیا جائے اور نہ اسے بالکل ساقط کرے۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک نیک کام کا حکم دیتا ہے مگر اس میں کسی بڑے گناہ کے ارتکاب کا خطرہ ہوتا ہے تو وہ اس خطرے سے بچنے کے لیے اس معروف کا حکم نہ دے۔ جیسے آپ ایک مجرم کو ظالم بادشاہ کے پاس لے جاتے ہیں، اور وہ اسے سزا دینے میں حد سے تجاوز کرے، اور اس سے کوئی ایسا ضرر لازم آجائے جو اس کے گناہ سے زیادہ ہے، تو یہ درست نہیں ہوگا۔ یا مثلاً وہ ایک برے کام سے روکے مگر اس سے کسی بڑے معروف کا ترک بھی لازم آئے، جس کا فائدہ اس منکر کے ترک سے زیادہ ہے، تو اس صورت میں اسے منکر کو روکنے سے خاموشی اختیار کرنی چاہیے، اس خوف سے کہ اس کے ساتھ کسی ایسے کام کا ترک لازم نہ آئے جس کا کرنا اللہ اور اس کے رسول نے لازم کیا ہے۔ اور اس کا فائدہ اس منکر کے ترک سے بہت بڑا ہے، جسے روکنے کا اس نے ارادہ کیا ہے۔[۳۳]

❖❖❖

۳۳- ملخصاً مجموع الفتاوی، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ۲۰/ ۴۸-۶۱۔

۱۱

مصلحین عصر کی دعوت اور ان کی ترجیحات

مصلحین عصر کی ترجیحات

جو شخص عہد حاضر میں داعیانِ دین اور مصلحین کی زندگی پر نظر ڈالے گا اسے عملی پہلو سے معلوم ہو جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک نے دعوت واصلاح کے میدان میں ایک متعین پہلو کو اپنائے رکھا۔ اسی پہلو کو دوسروں پر مقدم کیا اور اپنی پوری فکر اور سعی اس کی طرف متوجہ کی۔ اس کی بنیاد یہی تھی کہ ایک طرف انھوں نے اسلام کی حقیقت یہی سمجھی اور دوسری طرف انھوں نے اسلامی زندگی میں اس پہلو کے لحاظ سے کمی کا مشاہدہ کیا۔ انھوں نے سمجھا کہ اس وقت امت مسلمہ کو اپنی احیا اور بقا کی خاطر اور اعلائے کلمۃ اللہ اور نشاۃ ثانیہ کے لیے یہ پہلو اپنانے کی ضرورت ہے۔

● امام محمد بن عبدالوہاب

جزیرۂ عرب میں امام محمد بن عبدالوہاب کے نزدیک عقیدے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اس کے ذریعے وہ توحید کی کھیتی کو ان شرکیات اور کفریات سے محفوظ کرنا چاہتے تھے جس کا چشمہ آلودہ ہو چکا تھا اور جس کی شفافیت ماند پڑ گئی تھی۔ انھوں نے عقیدے کے بارے میں اپنی کتابیں اور مکتوبات لکھے اور اسی کی خاطر انھوں نے مظاہرِ شرک کو منہدم کرنے کی دعوتی اور عملی مہم چلائی۔

● سید محمد احمد مہدی

سوڈان میں محمد احمد مہدی کی اصل ترجیح جہاد تھی۔ وہ اپنے پیروکاروں کی اس انداز سے تربیت کرتے تھے جس کے ذریعے وہ مشکلات کو برداشت کرنے کا مادہ اپنے اندر پیدا کریں

اور وہ شدت کے ساتھ برطانوی استعمار اور اس کے اتحادیوں کا مقابلہ کریں۔

● سید جمال الدین

سید جمال الدین افغانی کے سامنے یہ ترجیح تھی کہ امت کو بیدار کیا جائے اور اسے استعمار کے خلاف اٹھایا جائے۔ کیوں کہ استعمار نہ صرف امت کی دنیوی زندگی کے لیے خطرہ تھا بلکہ اس کی اخروی زندگی بھی اس سے متاثر ہوسکتی تھی۔ وہ مسلمانوں کو یہ شعور دینا چاہتے تھے کہ وہ ایک امت ہیں، جن کا قبلہ مشترک، عقیدہ مشترک، رخ ایک اور انجام ایک ہے۔ یہ بات ان کی زندگی اور پوری سیرت میں نمایاں ہے۔ ان کے رسالے العروۃ الوثقیٰ سے بھی اس کی خوب وضاحت ہوتی ہے جسے وہ اپنے شاگرد اور دوست محمد عبدہٗ کی معیت میں نکالتے تھے۔

● امام محمد عبدہٗ

امام محمد عبدہٗ نے اس مسئلے کو اہمیت دی کہ مسلمانوں کو ذہنی غلامی کی بیماری سے نکالا جائے اور انھیں اسلام کے صاف وشفاف چشموں سے مربوط کیا جائے۔ وہ اپنے بارے میں اور اپنے اہداف کے بارے میں خود ہی فرماتے ہیں:

میں نے دو اہم معاملات کی طرف دعوت دی۔ ایک یہ کہ فکر کو تقلید کی قید سے آزاد کیا جائے اور دین کو اسی طریقے پر سمجھا جائے جیسا کہ امت کے سلف نے اختلافات کے ظہور سے پہلے اس کو سمجھا تھا۔ اس کے معارف سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے اس کے پہلے منبع کی طرف رجوع کیا جائے اور انھیں عقل انسانی کے اس میزان سے تولا جائے جنھیں اللہ نے مقرر کیا ہے تاکہ یہ امت ڈھلان سے واپس لوٹے اور وہ اپنی زندگی میں جو خلط وخبط دیکھتی ہے اس میں کمی پیدا کرے۔ اس سے عالم انسانی کی حفاظت میں اللہ کی رحمت کا اتمام ہوگا۔ اس بنا پر 'عقل انسانی' علم دوست سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ اس بات پر ابھارتی ہے کہ آدمی کائنات میں پنہاں اسرار کی تلاش کرے۔ یہ اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ ثابت شدہ حقائق کا احترام کرے

اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ نفس کی تہذیب اور عمل کی اصلاح میں اس کی طرف رجوع کیا جائے۔

ان ساری چیزوں کو میں ایک سمجھتا ہوں۔ اس کی طرف دعوت دینے میں بعض اوقات میں ان دو بڑے گروہوں کی رائے کے خلاف کرتا ہوں جن سے امت مسلمہ کا جسم مرکب ہے۔ میری مراد علومِ دین کے طالب علم اور اس دور کے فنون کے طالب علم ہیں۔

دوسری چیز عربی زبان کے اسالیب کی اصلاح کرنا تھی۔

ایک اور بات بھی تھی جس کی طرف میں دعوت دیتا تھا اور سارے لوگ اس سے بالکل کورے اور اس کے سمجھنے سے قاصر تھے۔ لیکن وہ ایک ایسی بنیاد تھی جس پر ان کی معاشرتی زندگی قائم تھی۔ ان کے اوپر جس کم ہمتی، کمزوری اور ذلت کا غلبہ ہو چکا تھا اس کی وجہ سے انھوں نے اس بنیاد سے صرف نظر ہی کیا تھا۔ وہ بنیاد یہ تھی کہ حکومت کے حق یعنی عوام کی طرف سے اس کی اطاعت، اور عوام کے حق یعنی حکومت کی طرف سے ان کے درمیان عدل دو الگ الگ باتیں ہیں اور ان کے درمیان فرق کرنا چاہیے۔ اور یہ کہ حکمرانوں کی اطاعت اگرچہ ضروری ہے مگر وہ بھی انسانوں میں سے ہوتے ہیں جن سے غلطی بھی ہوسکتی ہے اور خطا بھی، اور ان پر خواہش کا غلبہ بھی ہوسکتا ہے۔ ان کو ان کی غلطیوں اور خواہشات سے روکنے کا طریقہ یہی ہے کہ قوم ان کو نصیحت کیا کرے، نہ صرف قول کے ساتھ بلکہ فعل کے ساتھ بھی۔ ہم نے علی الاعلان یہ بات اس وقت کہی تھی جب استبداد پورے جوبن پر تھا اور ظلم اپنی لاٹھی ہاتھ میں لیے دندناتے پھر رہا تھا۔ ظالم کا ہاتھ فولادی تھا اور لوگ سارے کے سارے اس کے مکمل طور پر غلام بن چکے تھے۔[1]

● امام حسن البنا

امام حسن البنا نے سب سے پہلے مسلمانوں میں اسلام کے صحیح فہم کی طرف توجہ دی۔ جو چیزیں مغرب زدہ اور سیکولر مفکرین کے ہاتھوں اسلام سے خارج کردی گئی تھیں، امام حسن البنا نے انھیں دوبارہ اس میں داخل کردیا۔ ان مفکرین کا مقصد یہ تھا کہ اسلام قانون کو چھوڑ کر محض

۱- محمد رشید رضا، تاریخ الأستاذ الإمام الشیخ محمد عبده، حصہ اول، ص ۱۱-۱۲، طبع: مطبعة المنار، قاہرہ ۱۹۳۱ء۔

ایک عقیدے کی شکل اختیار کرلے، یہ ایک ایسا دین ہو جس کی کوئی حکومت نہ ہو، یہ حق ہو مگر اس کے پاس کوئی قوت نہ ہو، اس میں امن ہو مگر جہاد کے بغیر۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ دوسروں کے آگے جھک جائے۔ مگر امام حسن البنا چاہتے تھے، اور یہی اس کے شارع کا بھی ارادہ تھا کہ اسلام عقیدہ بھی ہو اور قانون بھی، دین بھی ہو اور حکومت بھی، حق بھی ہو اور اس کے پاس قوت بھی ہو، اس میں امن بھی ہو اور جہاد بھی، اس میں مصحف بھی ہو اور تلوار بھی۔ انھوں نے لوگوں کو یہ بات سمجھانے کے لیے بڑی کوشش صرف کی کہ سیاست اسلام کا ایک جز ہے اور آزادی مسلمانوں [کا حق ہی نہیں بلکہ ان] کے فرائض میں سے ایک اہم فرض ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے اپنی پوری قوت ایک نئی مسلمان نسل تیار کرنے پر صرف کی جس کا مقصود اللہ کی رضا ہو، جس کا نقطہ نظر اسلامی ہو اور جس کا اسوہ محمد ﷺ ہو۔ ایسی نسل جو اسلام کو گہرائی میں جا کر سمجھے، اس پر دل کی گہرائیوں سے ایمان لے آئے اور اس کے ساتھ مضبوط تعلق قائم کرلے۔ پہلے اس پر خود عمل پیرا ہو جائے اور پھر اس مقصد کے لیے کوشش اور جہاد کرے کہ اس کی روشنی میں ایک انقلاب برپا ہو جائے اور ساری زندگی اسی کے رنگ میں رنگ جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اکھٹے ہوں، الگ الگ نہ ہوں اور ان کے درمیان وحدت ہو، انتشار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے موضوعات نہیں چھیڑتے تھے جن سے خطرہ ہوتا تھا کہ اس سے امت کی صفوں میں دراڑیں پڑیں گی، ان کی آواز متفرق ہوگی اور لوگ پارٹیوں اور گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ان کے لیے یہی کافی ہے کہ انھوں نے لوگوں کو اسلام کے اصول وکلیات اور اس کے ضروری مبادیات پر جمع کیا۔

انھوں نے اپنی یادداشتوں میں وہ موقف بیان کیا ہے جو اُن کی اصابت فکر کی روشن دلیل ہے، حالانکہ اس وقت وہ اپنی عمر کے دوسرے عشرے میں تھے۔ وہ ان کا یہ موقف تھا کہ امت کو بنیادی عقائد، قوانین اور اخلاق پر جمع کیا جائے اور ان کو ایک مٹھی بنا دیا جائے۔ اس سلسلے میں فروعی مسائل سے اجتناب کیا جائے جو ختم ہونے والے نہیں ہیں۔

اس وقت ان کی ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کو زاویہ کہتے تھے۔ امام حسن البنا اس میں اپنے دروس پیش کیا کرتے تھے۔ اس کے بارے میں خود فرماتے ہیں:

اس دوسرے زاویہ کو حاجی مصطفیٰ نے ثواب کی نیت سے تعمیر کروایا تھا۔ یہاں طالب علموں کی ایک جماعت جمع ہوئی اور گہری اخوت ومحبت کی فضا میں آیاتِ الٰہی اور حکمتِ خداوندی کا مطالعہ کرنے لگی۔

زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ ہمارے اس درس کی خبر لوگوں میں مشہور ہوگئی جو مغرب سے عشاء تک کے وقت پر محیط ہوتا۔ اس کے بعد مدرس قہوہ خانوں کی طرف نکل جاتا جس کی وجہ سے ان درسوں میں خلافیات کے مشتاق لوگ، اور سابقہ فتنوں کے شہسوار بھی شامل ہو جاتے تھے۔

ایک رات میں نے ایک عجیب صورتِ حال دیکھی۔ یہ تفرقہ پسندی اور دوسرے سے بیزار ہونے کی کیفیت تھی۔ میں نے دیکھا کہ درس کے سامعین ایک دوسرے سے الگ الگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نشستیں بھی الگ کرلی تھیں۔ جوں ہی میں نے درس شروع کیا مجھ سے پوچھا گیا: وسیلے کے بارے میں استاذ کی کیا رائے ہے؟

میں نے کہا: میرے بھائی! میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے اسی ایک مسئلے کے بارے میں سوال نہیں کر رہے بلکہ آپ مجھ سے اذان کے بعد درود وسلام، جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت، درود شریف میں نبی ﷺ کے اسم مبارک کے ساتھ سیدنا کا لفظ پڑھنے، نبی ﷺ کے والدین کے انجام، مردے کے لیے قرآن خوانی اور ایصال ثواب، اور حلقہ ہائے تصوف وطریقت کے بارے میں بھی پوچھیں گے کہ ان میں ثواب ہے یا نہیں۔ میں نے ایک ایک کرکے وہ تمام اختلافی مسائل گنوانے شروع کیے جو سابقہ فتنوں کا موضوع بحث ہوتے تھے۔

آدمی یہ سن کر متحیر ہوگیا اور اس نے کہا: جی ہاں! میں ان تمام سوالوں کا جواب چاہتا ہوں۔

میں نے کہا: بھائی! میں عالم نہیں ہوں۔ میں ایک عام مدرس ہوں۔ مجھے قرآن کریم کی کچھ

آیات اور چند احادیث یاد ہیں اور کتابوں کا مطالعہ کر کے میں نے کچھ دینی احکام سیکھ لیے ہیں۔ اب میں رضا کارانہ طور پر لوگوں کو ان کا درس دیتا ہوں۔ اگر آپ مجھے ان حدود سے باہر لے جائیں تو مجھے مشکل میں ڈال دیں گے۔ اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا تو یہ بھی ایک فتویٰ ہے۔ اگر آپ کو میری باتیں اچھی لگیں اور ان میں آپ کو خیر کا کوئی پہلو نظر آئے تو ازراہ کرم انھیں سماعت فرمائیں۔ اگر آپ کو معلومات میں مزید اضافہ درکار ہو تو اس کے لیے میرے علاوہ دوسرے علما و فضلا سے جا کر پوچھیں جو اپنے اپنے میدان میں ماہر ہیں اور آپ کو اس مسئلے میں فتویٰ دے سکتے ہیں جس کے بارے میں آپ سوال کر رہے ہیں۔ میرا مبلغِ علم تو اتنا ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

آدمی میری بات کی گرفت میں آ گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ یوں میں نے اس حکمت عملی سے اس کو یہ موقع نہ دیا کہ وہ بات کو بڑھا دیتا۔ تمام حاضرین یا ان کی اکثریت میری اس گلو خلاصی سے مطمئن ہو گئی۔ لیکن میں نے بھی نہ چاہا کہ یہ سنہری موقع ہاتھ سے جانے دیا جائے۔

حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر میں نے کہا: میرے بھائیو! مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ بھائی اور آپ میں سے اکثر حضرات اس سوال کے جواب میں دراصل یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ نیا مدرس کس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا یہ شیخ موسیٰ کی پارٹی کا آدمی ہے یا شیخ عبدالسمیع کی پارٹی کا۔ یہ تحقیق آپ کے لیے بالکل مفید نہیں ہے۔ اس فتنہ آرائی میں آپ لوگ پورے آٹھ سال لگا چکے ہیں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ ان مسائل میں مسلمان صدیوں سے اختلاف کرتے چلے آئے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سے باہمی محبت اور اتحاد کے ذریعے راضی ہوتا ہے، وہ ہمارے اختلاف اور تفرقہ بازی کو ناپسند کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ اللہ سے عہد کریں گے کہ ان باتوں کو ترک کر دیں گے اور کوشش کریں گے کہ ہم سب مل کر دین کے اصول و قواعد سیکھیں گے، اس کے اخلاق و فضائل پر کاربند ہوں گے اور اس کے متفق علیہ تعلیمات پر عمل

کریں گے۔ فرائض و سنن کو ادا کریں گے اور موشگافی و تکلف سے اجتناب کریں گے۔ تاکہ دل صاف و شفاف ہو جائیں اور ہم سب کا اصل مقصد معرفتِ حق ہو نہ کہ کسی مسلک کا غلبہ۔ اس کے بعد ہم ان تمام مسائل کو باہمی اخلاص و محبت اور اعتماد و اتحاد کے سائے میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ میری رائے کو قبول کریں گے اور اس پر ہمارے درمیان ایک پختہ عہد استوار ہوگا۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ اس درس سے ہم یہ عہد کر کے رخصت ہوئے کہ ہر معاملے میں باہمی تعاون کو پیش نظر رکھیں گے، دین کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں گے اور اس کے لیے ایک مٹھی بن کر کام کریں گے۔ ہم اختلافی امور کو پس پشت ڈالیں گے اور ان میں ہر شخص اپنی اپنی رائے پر قائم رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ صادر فرما دے جو اٹل ہے۔

اس کے بعد زاویے کا درس اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس انداز سے جاری وساری رہا کہ ہم اختلاف سے دور تھے۔ اب میں کسی بھی موضوع پر بات کرتے ہوئے اہل ایمان کی باہمی اخوت و مودّت کے پہلوؤں کو زیر بحث لاتا تھا۔ میں اس کو موضوع گفتگو بناتا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں بھائی چارے کا احساس جاگزیں ہو جائے۔ میں بعض ایسے اختلافی گوشوں کو بھی منتخب کر لیتا جو ان کے درمیان محل نزاع نہ تھے بلکہ سب کے لیے عقیدت واحترام کا ذریعہ تھے۔ ان گوشوں کو میں سلف صالحین کی باہمی رواداری کے لیے بطور مثال پیش کرتا تھا اور اس کی بنیاد پر ان کے دل میں یہ بات بٹھاتا تھا کہ ہم آپس میں بھی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کی رائے کا احترام کریں۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ان کے سامنے ایک عملی مثال بھی پیش کی۔ میں نے ان سے پوچھا: آپ میں حنفی کون ہے؟ ایک شخص آگے بڑھا۔ میں نے پوچھا: شافعی کون ہے؟ یہ سن کر ایک اور شخص آگے آیا۔ میں نے لوگوں سے کہا: میں ابھی ان دونوں بھائیوں کو نماز پڑھاؤں گا۔ پھر میں نے حنفی سے پوچھا: آپ قراءت فاتحہ کے بارے میں کیا طریقہ اختیار کریں گے؟ اس نے کہا: میں خاموش رہوں گا اور فاتحہ نہیں پڑھوں گا۔ میں نے شافعی سے پوچھا: آپ کیا طریقہ

اپنائیں گے؟ اس نے کہا: میں تو ضرور فاتحہ پڑھوں گا۔

میں نے کہا: جب ہم نماز سے فارغ ہوں گے تو اے شافعی! آپ مجھے یہ بتائیں کہ اپنے حنفی بھائی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہوگی؟ اس نے کہا: اس کی نماز باطل ہوگی کیوں کہ اس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔ اور قراءت فاتحہ نماز کا ایک رکن ہے۔

پھر میں نے حنفی سے پوچھا: اپنے شافعی بھائی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہوگی؟ اس نے کہا: وہ مکروہ تحریمی کا ارتکاب کرے گا۔ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

اس کے بعد میں نے دونوں سے مخاطب ہوکر کہا: کیا تم دونوں ایک دوسرے کے فعل کو منکر سمجھو گے جس کے لیے حدیث میں ہاتھ، زبان یا دل سے تغییر [یعنی بدل ڈالنے یا ناپسندیدگی] کا حکم ہے؟ دونوں نے یک زبان ہوکر کہا: ہرگز نہیں!

پھر میں نے دیگر سامعین سے پوچھا: کیا تم ان دونوں میں سے کسی کے فعل کو منکر سمجھو گے؟ انھوں نے بھی کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: سبحان اللہ! اس معاملے میں تو آپ لوگوں کے لیے سکوت کی گنجایش ہے، حالانکہ یہ نماز کی صحت وفساد کا معاملہ ہے۔ مگر آپ کسی نمازی کے ساتھ اس بات پر رواداری کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ تشہد میں اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ پڑھے یا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ پڑھے۔ آپ لوگ اتنی سی بات کو ایسا مسئلہ بنا لیتے ہیں کہ اگر آپ کی بات نہ مانی گئی تو پوری دنیا میں ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔

میرا یہ اسلوب خاصا مؤثر رہا۔ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں اپنے رویے پر نظر ثانی کرنے لگے اور وہ جان گئے کہ اللہ کے دین میں بہت وسعت اور آسانی ہے اور اس میں کسی ایک فرد یا گروہ کی حکومت نہیں چلتی۔ ہر چیز کا مرجع اللہ اور اس کا رسول یا پھر مسلمانوں کی جماعت اور ان کا امام ہے۔ اگر فی الواقع ان کی کوئی جماعت اور کوئی امام موجود ہو۔[۲]

۲-مذکرات الدعوۃ والداعیۃ،ص۵۸-۶۰۔

● امام مودودی

امام ابوالاعلیٰ مودودی کی ترجیح یہ تھی کہ جدید جاہلیت کے خلاف جنگ کی جائے، لوگوں کو دین اور عبادت ـــ جامع معنی میں ـــ کی طرف بلایا جائے اور صرف اللہ وحدہٗ کی حاکمیت کو تسلیم کیا جائے۔ اس کے علاوہ جتنی حاکمیتیں دنیا میں قائم ہیں ان سب کو مسترد کیا جائے، خواہ اس کا مقام ومرتبہ کچھ بھی ہو، خواہ یہ حاکمیتیں علمی وفکری رہنماؤں کی ہوں یا سیاسی قائدین کی۔

ان کا مقصد ایک امتیازی اسلامی ثقافت کا قیام تھا۔ ایک ایسی ثقافت جو تمدن، معیشت، سیاست اور انفرادی واجتماعی زندگی میں مغربی فکر کو مسترد کرے اور انقلاب اور تبدیلی کے لیے اپنا ایک مستقل طریق کار طے کر لے۔ اس سلسلے میں ان کی کئی کتابیں اور رسالے سامنے آئے جو اسلامی دعوت اور اسلام کی تجدید میں ان کی فکر کو بیان کرتے ہیں۔ پھر اس بنیاد پر عمارت کی تعمیر اور اس فکر کو عام کرنے کے لیے ایک جماعت وجود میں آئی۔

[ان کی یہ فکر ان کی تمام کتابوں میں نمایاں ہے۔ جس کا ایک نمونہ سورۂ شوریٰ کی آیت أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ (۴۲:۱۳) کا وہ تفسیری نوٹ ہے جس میں اقامت دین کی ایک غلط تعبیر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے، بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، اپنے پیرووں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دین حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی اور قانونی وسیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لیے جان لڑا دیں، اور ان کو انسانی زندگی کی اصلاح کا وہ پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصے پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ یہ کتاب اپنے نازل کیے جانے کا مقصد یہ بیان کرتی ہے کہ:

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتَٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ اللَّهُ (النساء ۴:۱۰۵)

اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اس روشنی میں جو اللہ نے تمھیں دکھائی ہے۔

اس کتاب میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے جو احکام دیے گئے ہیں وہ صریحاً اپنے پیچھے ایک ایسی حکومت کا تصور رکھتے ہیں جو ایک مقرر قاعدے کے مطابق زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین تک پہنچانے کا ذمہ لے (التوبہ۹: ۶۰، ۱۰۳)۔ اس کتاب میں سود کو بند کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور سود خواری جاری رکھنے والوں کے خلاف جو اعلان جنگ کیا گیا ہے (البقرہ۲: ۲۷۵-۲۷۹) وہ اسی صورت میں روبعمل آسکتا ہے جب ملک کا سیاسی اور معاشی نظام پوری طرح اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ اس کتاب میں قاتل سے قصاص لینے کا حکم (البقرہ۲: ۱۷۸)، چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (المائدہ۵: ۳۸) زنا اور قذف پر حد جاری کرنے کا حکم (النور: ۲-۴) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ ان احکام کے ماننے والے لوگوں کو کفار کی پولیس اور عدالتوں کے ماتحت رہنا ہوگا۔ اس کتاب میں کفار سے قتال کا حکم (البقرہ۲: ۱۹۰، ۲۱۶) یہ سمجھتے ہوئے نہیں دیا گیا ہے کہ اس دین کے پیرو کفر کی حکومت میں فوج بھرتی کر کے اس حکم کی تعمیل کریں گے۔ اس کتاب میں اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم (التوبہ۹: ۲۹) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ مسلمان کافروں کی رعایا ہوتے ہوئے ان سے جزیہ وصول کریں گے اور ان کی حفاظت کا ذمہ لیں گے۔

اور یہ معاملہ صرف مدنی سورتوں ہی تک محدود نہیں ہے۔ مکی سورتوں میں بھی دیدۂ بینا کو علانیہ یہ نظر آسکتا ہے کہ ابتدا ہی سے جو نقشہ پیش نظر تھا وہ دین کے غلبہ و اقتدار کا تھا نہ کفر کی حکومت کے تحت دین اور اہل دین کے ذمی بن کر رہنے کا......

سب سے بڑھ کر جس چیز سے تعبیر کی یہ غلطی متصادم ہوتی ہے وہ خود رسول اللہ ﷺ کا وہ عظیم الشان کام ہے جو حضور ﷺ نے ۲۳ سال کے زمانۂ رسالت میں انجام دیا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ آپ نے تبلیغ اور تلوار دونوں سے پورے عرب کو مسخر کیا اور اس میں ایک مکمل حکومت کا نظام ایک مفصل شریعت کے ساتھ قائم کر دی جو اعتقادات اور عبادات سے لے کر

شخصی کردار، اجتماعی اخلاق، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، سیاست و عدالت اور صلح و جنگ تک زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی تھی۔ اگر حضور ﷺ کے اس پورے کام کو اقامت دین کے اس حکم کی تعبیر نہ مانا جائے جو اس آیت کے مطابق تمام انبیا سمیت آپ ﷺ کو دیا گیا تھا تو پھر اس کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ یا تو معاذ اللہ حضور ﷺ پر الزام عائد کیا جائے کہ آپ ﷺ مامور تو صرف ایمانیات اور اخلاق کے موٹے موٹے اصولوں کی محض تبلیغ و دعوت پر ہوئے تھے، مگر آپ ﷺ نے اس سے تجاوز کر کے بطور خود ایک حکومت قائم کر دی اور ایک مفصل قانون بنا ڈالا جو شرائع انبیا کی قدر مشترک سے مختلف بھی تھا اور زائد بھی۔ یا پھر اللہ تعالیٰ پر یہ الزام رکھا جائے کہ وہ سورۂ شوریٰ میں مذکورۂ بالا اعلان کر چکنے کے بعد خود اپنی بات سے منحرف ہو گیا اور اس نے اپنے آخری نبی سے نہ صرف وہ کام لیا جو اس سورہ کی اعلان کردہ 'اقامت دین' سے بہت کچھ زائد اور مختلف تھا، بلکہ اس کام کی تکمیل پر اپنے پہلے اعلان کے خلاف یہ دوسرا اعلان بھی کر دیا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ [آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا)، اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ ان دو صورتوں کے سوا اگر کوئی تیسری صورت ایسی نکلتی ہو جس سے 'اقامت دین' کی یہ تعبیر بھی قائم رہے اور اللہ یا اس کے رسول پر کوئی الزام بھی عائد نہ ہو تو ہم ضرور یہ معلوم کرنا چاہیں گے۔][۳]

● سید قطب شہید

سید قطب شہید کے ہاں ترجیح یہ تھی کہ نظام سے پہلے عقیدے کو پختہ کیا جائے اور اس کی بنیاد پر زمین میں اللہ کی حاکمیت قائم کی جائے۔ یہ بات انھوں نے اپنی آخری دور کی کتابوں میں اور خاص طور پر فی ظلال القرآن میں بار بار دہرائی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حاکمیت کا نظریہ مودودی اور قطبی نظریہ ہے! مگر یہ سخت غلطی اور جہالت ہے۔ یہ تو ایک ایسا مسئلہ

۳- تفہیم القرآن، ۴/ ۴۹۱-۴۹۲۔ مؤلف کو غالباً اس موضوع سے متعلق مولانا مودودیؒ کے عربی لٹریچر میں کوئی عبارت نہیں ملی تھی۔ جس کی وجہ سے تشنگی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے ترجمے میں اس تشنگی کو دور کرنے کے لیے یہ اضافہ مناسب سمجھا۔ (مترجم)

ہے۔جس پر تمام علمائے اہل اصول کا اتفاق ہے اورانھوں نے اس مسئلے کو اصول فقہ کی بحث الحکم میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔انھوں نے صراحت کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ حاکم اللہ ہی ہے اوراس کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا کام اس کی تبلیغ کرنا تھا۔توحید کے جو عناصر قرآن میں بیان ہوئے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ:

أَفَغَيْرَ اللهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِىٓ أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا. (الأنعام۶:۱۱۴)

تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں، حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمھاری طرف کتاب نازل کردی ہے۔

اسی طرح سید قطب شہید رحمہ اللہ نے اسلام کے اعتقادی تصور کو درست کرنے پر بھی توجہ دی۔ کیوں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک فاسد یا بیمار تصور سے کوئی صالح عمل برآمد ہوسکے۔اگر لکڑی ٹیڑھی ہو تو اس کا سایہ سیدھا کیسے ہوسکتا ہے۔

اس بنا پر انھوں نے ہر میدان میں جدید جاہلیت کو مسترد کردیا، عقیدے میں، فکر میں، کردار میں، فرد کی زندگی میں، خاندان اور معاشرے کی زندگی میں۔انھوں نے دنیا کے کونے کونے میں قائم تمام معاشروں کو یہاں تک کہ مسلمان معاشروں کو بھی جاہلی معاشرے قرار دیا کیوں کہ یہ اللہ کی حاکمیت نہیں مانتے۔حاکمیت سے مراد ان کی وہ حاکمیت تھی جو قوانین وضع کرنے، اقدار وموازین کا تقرر کرنے اور مفاہیم اور ضوابط کا تعین کرنے میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ حاکمیت جس کی بنیاد پر پورے معاشرے کی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ان معاملات میں جس طرح بھی غیر اللہ کو حکم بنایا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کا یہ حق غصب کرنا ہے، کہ اپنی مخلوق کے لیے قانون سازی کا اختیار اس کو حاصل ہے۔

یہ ایک کلی معاملہ تھا جس کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہونی چاہیے تھی اور اسے ان جزئیات اور فرعیات پر مقدم ہونا چاہیے تھا جن میں بعض پاک طینت مسلمان بہت شدت کا مظاہرہ

کرتے ہیں۔جیسے جزوی منکرات سے لوگوں کو روکنا اور ان منکرات سے غفلت برتنا جو اس سے کئی گنا بڑے ہیں اور جن پر معاشرے کی بنیادیں قائم ہیں۔

میں یہاں في ظلال القرآن سے ایک اقتباس نقل کرنا چاہتا ہوں۔بنی اسرائیل کے بارے میں اللہ کے ارشاد: كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (المائدة ۵:۷۹) [انھوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا، برا طرزِ عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا] کی تفسیر کرتے ہوئے سید قطب شہید فرماتے ہیں:

اصل جدوجہد اور زیادہ قربانیوں کا رخ سب سے پہلے ایک اچھے معاشرے کے قیام کی طرف متوجہ ہونا چاہیے ـــــ اور ایک اچھا معاشرہ وہ ہوتا ہے جو اللہ کے مقرر کردہ اصولوں پر قائم ہوتا ہے ـــــ یہ کام اس سے پہلے ہونا چاہیے کہ ہم اپنی جدوجہد، اپنی قوت اور اپنی قربانیوں کو جزوی، انفرادی اور شخصی اصلاحات کی طرف متوجہ کریں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے ہوسکتی ہیں۔

اگر پورا معاشرہ خراب ہو، جاہلیت کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہو، معاشرہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصولوں پر قائم نہ ہو اور اس کا قانون اللہ کا مقرر کردہ قانون نہ ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے جزوی کوشش کریں۔اس صورت حال میں ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ اصلاح کی کوشش بنیاد سے شروع کی جائے اور اسے بنیاد سے اٹھایا جائے۔ اس صورت میں ساری کوشش اور پورا جہاد زمین میں اللہ کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے ہوگا۔ پھر جب یہ حکمرانی مضبوط ہوگی تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اپنی اساس کے ساتھ مربوط ہوجائے گا۔

اس کے لیے ایمان کی ضرورت ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ آدمی اس ایمان کی حقیقت کا ادراک کرے اور نظام حیات میں اس کی حدود سے واقفیت حاصل کرے۔اس سطح پر ایمان وہ چیز ہے جو آدمی کا اعتماد پورے کا پورا اللہ پر قائم کردیتا ہے اور اسے اس بات پر پختہ یقین

ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نصرت ’خیر‘ کے ساتھ کردے گا، خواہ راستہ کتنا ہی لمبا ہو، اسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ مجھے اجر اسی کے پاس سے مل سکتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ میری کوشش کا اس دنیا میں کوئی پھل نکل آیا یا نہیں اور اس کام کے لیے میرے ساتھ کوئی اور تیار ہوا یا نہیں۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ گمراہ معاشرے نے اس کی قدر کی یا نہیں کی۔ نہ اسے یہ امید ہوتی ہے کہ اہلِ جاہلیت میں سے کوئی شخص اس کی مدد کو آئے گا۔

قرآن وسنت کی وہ تمام نصوص جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم آیا ہے وہ سب اس بات سے بحث کرتی ہیں کہ ایک اسلامی معاشرے میں مسلمان کا فرض کیا ہونا چاہیے، یعنی وہ معاشرہ جو بنیادی طور پر اللہ کی حاکمیت کا معترف ہوتا ہے اور اپنے فیصلے شریعت الٰہی کے مطابق کرتا ہے، خواہ پھر اس میں بعض حالات میں اس حاکمیت سے کسی بھی حد تک سرکشی پائی جائے اور بعض حالات میں اس کے اندر گناہ کس قدر عام ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں یہی بات ملتی ہے:

أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ افضل ترین جہاد یہ ہے کہ ظالم ’امام‘ کے سامنے کلمہ حق کہا جائے۔

اس میں ’امام‘ کا ذکر ہے اور وہ امام نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ پہلے اللہ کی حکمرانی اور اس کی شریعت کے فیصلہ کن ہونے کا اقرار نہ کرے۔ جو شخص شریعت کو فیصلہ کن نہیں بناتا اس کو امام نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. (المائدة ۵:۴۴)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون پر فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

اب وہ جاہلی معاشرے جو اللہ کے قانون سے فیصلے نہیں کرواتے ان میں اہم اور بڑا منکر وہ ہے جس کے منبع سے سارے منکرات پھوٹتے ہیں اور وہ ہے اللہ کی شریعت کو دنیا کی

زندگی سے بے دخل کر کے بالواسطہ اس کی الوہیت سے انکار کرنا۔ یہ منکر جو بڑا اور بنیادی ہے سب سے پہلے اس بات کا مستحق ہے کہ اس کا انکار کیا جائے۔ یہ کام اس سے پہلے کرنے کا ہے کہ آدمی جزوی منکرات کے پیچھے پڑ جائے جو اس بڑے منکر سے نکلے ہوئے ہیں، اس کی فرع اور اس کا سایہ ہیں۔

کوئی فائدہ نہیں ہے اگر کچھ نیک اور اچھے لوگ اپنی جدوجہد کو جزوی منکرات کا قلع قمع کرنے میں ضائع کریں، جو فطرتاً اس بڑے منکر کی وجہ سے پیدا ہو چکے ہیں۔ وہ بڑا منکر اللہ کی مخالفت کرنے کی جرأت کرنا، اس کی الوہیت والی خصوصیات کا دعویٰ کرنا اور زندگی کے لیے اس کے دیے ہوئے نظام کو مسترد کر کے اس کی الوہیت سے انکار کرنا ہے۔ ایسے منکرات کو ختم کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرنا بالکل بے فائدہ ہے جو اس بڑے منکر کے مقتضیات میں سے ہیں اور بلا اختلاف اس کے برے نتائج میں سے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ہم کب تک لوگوں کی طرف سے کیے جانے والے ان منکرات کے بارے میں فیصلے صادر کریں گے۔ ہم ان کے اعمال کو کس میزان میں تولیں گے تاکہ ہم ان سے کہہ سکیں کہ یہ منکر ہے اور اس سے اجتناب کرو۔ جب آپ ان سے کہیں گے کہ یہ منکر ہے تو اِدھر اُدھر سے دس آدمی تمھاری طرف متوجہ ہوں گے اور تم سے کہیں گے کہ ”نہیں جی، یہ منکر نہیں ہے۔ یہ تہذیب وتمدن سے خالی دور میں منکر ہوتا ہو گا مگر اب دنیا ترقی کر رہی ہے اور معاشرہ ’ایڈوانس‘ ہو رہا ہے۔“ اس طرح کے حالات میں چیزوں کے اعتبارات مختلف ہوتے رہتے ہیں۔

اس لیے ایک ایسے میزان کی ضرورت ہو گی جو ثابت ہو اور جس کی طرف ہم اپنے اعمال کے لیے رجوع کر سکیں۔ اسی طرح ایسی اقدار کی ضرورت ہے جو سب کے نزدیک معتبر ہوں جن پر ہم معروف اور منکر کو جانچ سکیں۔ یہ اقدار ہمیں کہاں سے ملیں گی اور یہ میزان ہم کہاں سے لائیں گے۔

کیا ہم یہ میزان لوگوں کے اندازوں، ان کے عرف، ان کی چاہتوں اور خواہشوں سے حاصل کریں گے جو ہر وقت تغیر پذیر ہوتی ہیں اور ایک حالت پر کبھی نہیں ٹھہرتیں؟ اگر ہم نے ایسا کیا تو گویا ہم نے ایک ایسے جنگل کا رخ کیا جس میں کوئی رہنما نہیں اور ایک ایسے سمندر میں اتر پڑے جس میں کہیں نشانات موجود نہیں ہیں۔

اس لیے ضروری ہوا کہ ہم پہلے ایک میزان قائم کریں اور یہ میزان بھی ایسا ہونا چاہیے جو مستقل ہو اور وہ خواہشات سے متاثر نہ ہو۔

یہ مستقل میزان صرف اور صرف اللہ کا میزان ہے۔

پس کیا ہے اگر معاشرہ سرے سے اللہ کی حاکمیت کو نہ مانے اور اس کی شریعت کو فیصلہ کن تسلیم نہ کرے، بالکہ اس کی طرف دعوت دینے والوں کا مذاق اُڑائے اور ان کو اجنبیت کی نظر سے دیکھے۔

کیا یہ کوشش ضائع اور عبث اور مسخرہ نہیں ہوگی کہ تم ایسے معاشرے میں کھڑے ہو کر لوگوں کو زندگی کے ایسے جزئیات کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو جن کی حیثیت بالکل ثانوی ہے؟ حالانکہ ان کے میزان مختلف ہوتے ہیں، ان کی اقدار میں کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی اور ان کے درمیان خواہشات اور آرا میں اختلاف کا ایک وسیع سمندر حائل ہو۔

یقیناً یہ بات ضروری ہے کہ بنیادی طور پر ان کے درمیان ایک حَکَم، ایک میزان، ایک اقتدار اور ایک منہج حیات کے بارے میں اتفاق ہو جس کی طرف اختلاف کرنے والے لوگ اپنی آرا اور اپنی خواہشات کے حوالے سے رجوع کر سکیں۔

ضروری ہے کہ پہلے بڑے معروف کا حکم دیا جائے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور اس کے منہج کو تسلیم کرنا۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے بڑے منکر کو روکا جائے اور وہ ہے اللہ کی شریعت کو بحیثیت قانون مسترد کر کے اس کی الوہیت سے انکار۔ اس بنیاد کی تعمیر کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکے گا کہ اس پر عمارت کو اٹھایا جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر قسم کی قوت فراہم کی جائے

اور اسے ایک جہت میں جمع کیا جائے تاکہ وہ بنیاد تعمیر ہو سکے جس پر اس عمارت کو اٹھایا جانا ہے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض نیک سیرت لوگ اپنی کوششیں فروعی مسائل کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہوئے صرف کرتے ہیں، حالانکہ وہ بنیاد جس پر اسلامی معاشرے کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور جس پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام کو آگے بڑھانا ہوتا ہے، وہ منہدم ہوئی پڑی ہے۔

مثلاً اس بات کا کیا فائدہ ہوگا کہ آپ ایک ایسے معاشرے میں لوگوں کو حرام کھانے سے روکیں جس کی معاشی بنیاد سود پر قائم ہے جو اس کے سارے مال کو حرام میں تبدیل کرتا ہے اور اس میں ایک فرد کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ حلال کا رزق کھا سکے۔ کیوں کہ اس کا معاشرتی اور معاشی سارا نظام اللہ کی شریعت کی مخالف بنیادوں پر قائم ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے سرے سے اللہ کی حاکمیت سے انکار کر کے گویا اس کی الوہیت کو چیلنج کیا ہے۔

اسی طرح کیا فائدہ ہوگا کہ ایک ایسے معاشرے میں لوگوں کو فسق سے روکا جائے جو زنا کو صرف اس وقت جرم کہتا ہے جب وہ بالجبر ہو، اور اس صورت میں بھی وہ اللہ کی شریعت کے مطابق سزا نہیں دیتا۔ کیوں کہ اس نے سرے سے اللہ کی حاکمیت کا انکار کر کے اس کی الوہیت کو مسترد کیا ہے۔

اسی طرح کیا فائدہ ہے کہ لوگوں کو ایک ایسے معاشرے میں شراب پینے سے روکا جائے جس کا قانون شراب کی چلن کو مباح قرار دیتا ہے اور وہ شارع عام میں کھلم کھلا شراب پینے کے سوا کسی کو مجرم نہیں کہتا۔ یہاں تک کہ وہ ایسی حد کو بھی نافذ نہیں کرتا جو اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔ کیوں کہ وہ سرے سے اللہ کی شریعت کو مسترد کر کے اس کی الوہیت سے انکار کر چکا ہے۔

اس کا کیا فائدہ ہے کہ لوگوں کو ایک ایسے معاشرے میں دین کو گالیاں دینے سے روکا جائے جو اللہ کی حکمرانی کا معترف نہ ہو، وہ اس میں اللہ کی عبادت نہ کرتے ہوں بلکہ اللہ کے سوا

دوسروں کو رب بنا بیٹھے ہوں۔ وہ اس معاشرے کے لیے شریعت اور قانون تیار کرتے ہوں اور ان پر اپنے نظام اور اپنے قواعد نافذ کر رہے ہوں۔ اس کے اپنے میزان اور اقدار ہوں۔ اس میں گالیاں دینے والے اور دیے جانے والے سب اللہ کے دین پر عمل پیرا نہ ہوں۔ بلکہ یہ دونوں اور ان کے معاشرے کے باقی لوگ ان 'ارباب' کے دین پر عمل پیرا ہوں جو ان کے لیے قوانین بناتے ہیں، ان کے لیے شریعت وضع کرتے ہیں اور ان کے لیے اقدار اور میزانوں کا تعین کرتے ہیں۔

ان حالات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کیا فائدہ ہے اور صغائر تو درکنار، ان کبائر سے لوگوں کے روکنے کیا فائدہ ہے، جبکہ سب سے بڑی کبیرہ کھلے عام رائج ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے نظام حیات سے انکار کر کے اس کی الوہیت سے انکار کیا جا رہا ہے۔

یہ معاملہ اس سے زیادہ بڑا، زیادہ وسیع اور زیادہ گہرا ہے جس میں یہ لوگ اپنی قوتیں، اپنی صلاحیتیں اور اپنی ہمتیں خرچ کر رہے ہیں۔ یہ مرحلہ ایسا ہے کہ اس میں فرعیات کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، خواہ وہ کتنے ہی بڑے ہوں، یہاں تک کہ وہ حدود اللہ میں سے کیوں نہ ہوں۔ حدود اللہ بھی بنیادی طور پر اسی فکر پر قائم ہوتے ہیں کہ پہلے اللہ کی حاکمیت تسلیم کی جائے اور اس کے سوا سب کی حاکمیت کا انکار کیا جائے۔ اگر یہ اعتراف حقیقت کے روپ میں سامنے نہ آئے جو اللہ کی شریعت کو قانون سازی کا واحد ذریعہ قرار دیتی ہو اور اللہ کو واحد مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے تسلیم کرے تو اس کے بعد فروع کے بارے میں ہر کوشش ضائع جائے گی۔ چنانچہ منکرات میں جو منکر سب سے بڑا ہے وہ اس بات کا سب سے زیادہ مستحق ہے کہ اس کے خلاف اپنی کوشش اور جہد کو صرف کیا جائے۔[۴]

● **استاذ محمد مبارک**

اصلاح وتجدید کے لیے سرگرم افراد میں سے جن لوگوں نے ترجیحات کے مسئلے پر توجہ دی ان

۴- فی ظلال القرآن، تفسیر سورۃ المائدۃ، آیت ۶۷، پارہ ۶، ۹۳۹-۹۵۱، طبع: دار الشروق۔

میں ایک، شام کے استاذ محمد مبارک رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب: **الفكر الإسلامي الحديث في مواجهة الأفكار الغربية** میں اس پہلو کے بارے میں بڑی عمیق گفتگو کی ہے۔ یہ در حقیقت مختلف مباحث اور محاضرات ہیں جو انھوں نے مختلف مواقع پر پیش کیے ہیں۔

اس کتاب میں انھوں نے اسلام میں مختلف اشیا کے درمیان موجود نسبتوں کا خیال رکھنے کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے اسے میں اس کی اہمیت کی وجہ سے ہو بہو نقل کرنا چاہتا ہوں:

اسلامی نظام میں وحدت کے خاصے کے ساتھ ہی ایک اور خاصہ ہے اور وہ اس سے کم اہم نہیں ہے۔ وہ یہ کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اقدار اور نسبتوں کا خیال رکھا جائے۔ مال، لذت، عقل، معرفت، قوت، عبادت، قرابت، قومیت اور انسانیت زندگی کی اقدار میں سے ہیں۔ اسلام نے اپنے نظام زندگی میں ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک محدود جگہ اور نسبت مقرر کی ہے ان میں سے کوئی قدر اس سے تجاوز نہیں کر سکتی، تاکہ ایک قدر دوسری قدر پر ظلم نہ کرے۔

اسلام کو مسخ کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ ان نسبتوں میں کوئی تبدیلی کی جائے، مثلاً کسی کو اپنی حد سے بڑھا دیا جائے یا اسے دوسری کی نسبت سے کم کیا جائے۔ جیسا کہ آخری بعض زمانوں میں عملاً یہ ہو چکا ہے۔ زندگی کے نظام میں نسبتوں کی تبدیلی ایسی ہے جیسے مزاحیہ تصویر میں تبدیلی۔ یہ انسان کی کچھ شکل وصورت پیش کرتی ہے مگر مزاحیہ انداز میں۔ یا اس تبدیلی کی مثال دوائی کے اجزاء میں تبدیلی کی طرح ہے جس سے وہ دوائی خراب ہو جاتی ہے اور اس کی صفات وخصوصیات میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات وہ ایک مضر مادے، اور زہر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اگر ہم زندگی کو سو اجزا میں تقسیم کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اسلام نے ان میں کئی اجزا کو عبادت کے لیے خاص کیا ہے۔ اور یہی معاملہ کمائی اور خرچ، جہاد اور جائز اشیا سے لذت اندوز ہونے کا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک حصہ مقرر ہے۔ اگر ہم ان نسبتوں کو تبدیل کریں گے مثال کے طور پر ہم جہاد کی قدر کم کریں گے اور عبادت کے حصے میں اضافہ کریں گے،

مال کمانے میں کوتاہی کریں گے یا اس کے خرچ کرنے میں، اپنے سامان لذت میں حد سے تجاوز کریں گے یا اس کو معطل کریں گے، تو اس کے نتیجے میں ہم ایک ایسے نظام کی طرف نکل جائیں گے جو اپنی حقیقت اور روح کے لحاظ سے اسلامی نظام کے خلاف ہے اور اس طرح ہم اس توازن کو خراب کر دیں گے جو اللہ تعالیٰ نے زندگی کی اقدار اور اس کے مختلف پہلوؤں میں قائم کر رکھا ہے۔

ہمارے موجودہ دور میں مسلمِ کامل اس کو کہا جاتا ہے جو عبادت بمعنی پوجا پاٹ کی طرف متوجہ ہو اور اس کے سوا کسی کام میں دخل نہ دیتا ہو۔ اپنی خانقاہ میں بیٹھا ہو، اس سے باہر نہ نکلتا ہو اور ہر وقت اپنے ذکر و اذکار میں مصروف ہو۔ عبادت کی یہ صورت قطعی طور پر اس صورت کے مطابق نہیں ہے جس پر نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلنے والے صحابہ عمل پیرا تھے۔ اگر ان کی زندگی کا ایک بڑا جز عبادت تھا تو جہاد بھی اس کے صفحات کو بھرے ہوئے تھا، معاشرے کو غلط عقائد سے آزاد کرنے کا جہاد، صحیح عقائد کو دلوں میں بٹھانے کا جہاد، معاشرے کو ظالم کے ظلم و استبداد سے نجات دلانے کا جہاد، کمزوروں کی مدد کا جہاد اور لوگوں کے درمیان عدل کے قیام کا جہاد۔ اس طرح ایک ایسے مسلمان کی زندگی بھی ناقص اور مضطرب رہتی ہے جو جہاد اور معاشرتی اصلاح میں تو مشغول رہتا ہو مگر وہ عبادت اور تعلق باللہ سے خالی ہو۔

ہمارے فقہائے متقدمین نے بھی اس نظریے یعنی نسبتوں کے نظریے پر توجہ کی تھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک مسلمان سے مطلوب فرائض اور دوسری چیزوں کے مطالبے میں فرق رکھا ہے۔ اسی طرح انھوں نے ممنوعات اور محرمات کو بھی ممانعت اور حرمت کے اعتبار سے مختلف قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں باتیں گناہ میں برابر نہیں ہیں کہ ایک آدمی جہاد میں شریک ہے اور دشمن کے مقابلے میں کھڑا ہے اور وہ اپنی جگہ خالی کر کے دشمن کو اپنی صفوں میں گھسنے کا موقع فراہم کرتا ہے،[5] اور دوسرا شخص شراب پیتا ہے یا سور کا گوشت کھاتا ہے۔

۵- استاذ کا اشارہ اس گناہ کی طرف ہے جسے حدیث میں التولی یوم الزحف کہا گیا ہے اور وہ السبع الموبقات میں سے ہے۔

اگر چہ ہیں یہ دونوں چیزیں حرام مگر یہ دونوں درجے میں برابر نہیں ہیں۔

بہت سی آیات اور احادیث اس فکر کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ۝ (التوبة ۹:۱۹)

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھیرالیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخر پر اور جس نے جاں فشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا وہ قول کہ جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل ہے جو جہاد کے برابر ثواب رکھتا ہو، یہ سوال دو یا تین بار پوچھا گیا اور آپ ﷺ ہر بار جواب دیتے رہے کہ لَا تَسْتَطِيْعُوْنَهٗ [تم یہ نہ کر سکو گے]۔ اور آخر کار جب سائل باز نہیں آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

مَثَلُ الْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ كَمَثَلِ الصَّائِمِ الْقَائِمِ الْقَانِتِ بِآيَاتِ اللهِ لَا يَفْتُرُ مِنْ صِيَامٍ وَلَا صَلَاةٍ حَتّٰى يَرْجِعَ الْمُجَاهِدُ.[6] مجاہد فی سبیل اللہ کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو مسلسل روزہ رکھے اور رات کو ساری ساری رات قیام کرے۔ وہ اللہ کی آیات پر قانت ہو، نہ روزے سے اکتاہٹ محسوس کرے اور نہ نماز سے، یہاں تک کہ مجاہد واپس لوٹ آئے۔

اور صحاح میں ہے کہ کسی نے پوچھا: یا رسول اللہ! کون سا انسان سب سے افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

مُؤْمِنٌ مُجَاهِدٌ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. وہ شخص جو اپنے نفس اور مال کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔

۶- متفق علیہ

پوچھا گیا: پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

رَجُلٌ فِي شِعْبٍ مِنَ الشِّعَابِ يَتَّقِي اللّٰهَ وَيَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهِ۔ وہ شخص جو کسی وادی میں رہتا ہے، اللہ سے ڈرتا ہے اور لوگوں کو ان کے شر کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے۔[7]

امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے:

دِرْهَمُ رِبًا يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ أَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلَاثِينَ زَنْيَةً[8] ایک شخص سود کا ایک درہم کھائے یہ اس سے زیادہ سخت [گناہ] ہے کہ آدمی ۳۳ بار زنا کرے۔

معلوم ہوا کہ سود جو ایک مالی ظلم ہے اس کی حرمت زنا کی حرمت سے زیادہ ہے۔

اگر ہم اس طرح کی احادیث جمع کرنے کی کوشش کریں جو مختلف امور کے درمیان اقدار کا تعین کرتی ہیں تو ہمیں باقاعدہ ریاضی حساب کے ساتھ ان سے وہ اقدار ہاتھ آئیں گے جو زندگی کی مختلف ترجیحات میں موجود ہیں۔ جیسے نبی ﷺ فرماتے ہیں:

يَوْمٌ مِنْ إِمَامٍ عَادِلٍ أَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّينَ سَنَةً.[9] عادل حکمران کی زندگی کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

اور یہ کہ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ[10] عالم کی فضیلت عابد پر اس طرح ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ایک ادنیٰ مسلمان پر۔

اسی طرح فرمایا: فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ[11] ایک فقیہ شیطان کے لیے سو عابدین سے زیادہ بھاری ہے۔

۷- متفق علیہ [شارحین حدیث کہتے ہیں کہ اس سے مراد فتنے کا زمانہ ہے، ورنہ عام حالات میں گوشہ نشینی افضل نہیں ہے]۔ (مترجم)

۸- مسند احمد، ج ۵، ص ۲۲۵۔

۹- منذری الترغیب میں کہتے ہیں کہ اسے طبرانی نے الکبیر اور الأوسط میں نقل کیا ہے اور الکبیر کی سند حسن ہے۔

۱۰- یہ بھی ایک حدیث کا حصہ ہے جسے امام ترمذی نے حضرت ابواُمامہؓ سے روایت کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ حسن صحیح غریب ہے [۲٦٨٦]۔ دیکھیے: صحيح الجامع الصغير ۴۲۱۳۔

۱۱- اسے ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہتے ہیں: یہ غریب حدیث ہے۔ ہمیں ولید بن مسلم کے علاوہ اس کا کوئی

اس سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے جو اپنی توجہ ایک ایسے کام کی طرف کرتے ہیں جو فی نفسہٖ اسلام میں مطلوب یا ممنوع ہوتی ہے مگر کسی دوسری چیز کے مقابلے میں آئے تو وہ اس سے کئی گنا زیادہ مطلوب یا اس سے کئی گنا زیادہ ممنوع ہو جاتی ہے۔ اس وقت اسلامی ممالک دو عظیم خطرات سے دوچار ہیں: ایک استعمار اور دوسری لادینیت [سیکولرزم]۔ ان کی زمین بھی حملے کی زد میں ہے اور ان کا عقیدہ بھی۔ یعنی ان کے مادی اور معنوی دونوں قسم کی دولت پڑا کہ پڑا ہے اور وہ اس سے چھینی جا رہی ہے۔ اگر یہ دونوں حملے کامیاب ہو گئے اور ان کے ممالک کے ساتھ ان کا عقیدہ بھی منہدم ہوا اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا تو باقی شعائر اسلام کو قائم رکھنا ممکن نہ رہے گا۔ نہ یہی ہو سکے گا کہ لوگ پھر بھی اسلام کے اوامر کو قائم کریں اور اس کے احکام کو عملی جامہ پہناتے رہیں۔ اس بنا پر لوگوں کے ذہنوں کو دوسرے مسائل کی طرف موڑنا اور ان کو اسلامی پستی کا محور بنانا، اہم اور بنیادی مسائل سے لوگوں کی توجہ ہٹانا ہے۔ اور بنیادی مسئلہ ہے: اسلامی ممالک پر بیرونی قبضہ اور براہ راست یا بالواسطہ طور پر ان کے اوپر اپنا اقتدار قائم رکھنا، اسلامی عقیدے کو مختلف طریقوں سے منہدم کرنا اور مختلف صورتوں میں لادینی افکار اور مذاہب کو عام کرنا۔ تو کیا ان حالات میں یہ جائز ہے کہ مسلمان اس مسئلے پر دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں کہ تراویح کی رکعتیں آٹھ ہیں یا بیس، اور یہ کہ ایک مسجد میں دوسری جماعت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اسی طرح کیا یہ جائز ہوگا کہ ہم ایسے مسائل میں سنت اور بدعت کا معرکہ گرم کریں جس کا عقیدے کے ساتھ کوئی دور کا تعلّق بھی نہ ہو؟!

میں یہ نہیں کہتا کہ ان امور کے بارے میں علمی بحث بھی نہ کی جائے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اس کی وضاحت اس وقت ہونی چاہیے جب اس کا تعلّق عقیدے کے ساتھ ہو۔ عبادات میں صحیح طریقے کی وضاحت مستحسن ہے، کیوں کہ عبادات شارع کی طرف سے متعین ہوتی ہیں ان میں

بقیہ ۱۱: اور طریق معلوم نہیں ہے۔ امام ابن الجوزی العلل میں کہتے ہیں: صحیح نہیں ہے۔ عراقی کہتے ہیں: اس کی سند ضعیف ہے۔ امام البانی ضعيف الجامع الصغير میں کہتے ہیں: یہ موضوع حدیث ہے۔

کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے باوجود اگر اس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے اور یہ دو مسلمان گروہوں کے درمیان جھگڑے کا ذریعہ بنتی ہے تو اس سے اجتناب ضروری ہوگا کیوں کہ اس کے نتیجے میں ایک ایسا منکر سامنے آرہا ہے جو پہلے والی منکر سے زیادہ بڑی اور خطرناک ہے۔ اس سے یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جائیں۔ حالانکہ ان کو جس صورتِ حال کا سامنا ہے اس میں ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی قوت کو تقسیم کریں یا بنیادی مسائل کو چھوڑ کر دوسری چیزوں میں اپنے آپ مصروف کرلیں۔[12]

● شیخ محمد الغزالی

ترجیحات کے مسئلے کی طرف جن لوگوں نے توجہ دی ان میں سے ایک، نامور داعیِ اسلام شیخ محمد الغزالی حفظہ اللہ ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابوں خاص طور پر ان کتابوں میں جو ماضی قریب میں لکھی گئیں، اس مسئلے کا بھرپور اہتمام کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنے دعوتی سفر میں ایسے لوگ دیکھے جو اسلام کے ساتھ یا اسلامی دعوت کے ساتھ نسبت رکھتے تھے مگر انھوں نے اسلام کے پودے کو الٹا دیا تھا۔ اس کے بنیادی پیڑ کو انھوں نے ہلکی شاخوں میں تبدیل کیا تھا اور فروع کو ان اوراق کی مانند قرار دیا تھا جن کے ساتھ ہوائیں اٹھکیلیاں کھیلتی ہیں۔ جب کہ انھوں نے پتوں کو پیڑ اور تنے کا قائم مقام بنادیا تھا جس کی طرف ہر فکر کو متوجہ کرنا وہ ضروری سمجھتے تھے، اسی کا پورا پورا اہتمام کرتے تھے اور اسی کے لیے کام کرتے تھے۔

اس مقام پر میں شیخ غزالی کی ایک ہی عبارت پر اکتفا کروں گا، جو اُن کے ذہن رسا کی نمائندگی کرتی ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں ترجیحات کے مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے، اس کو پختہ کرنے کا بہت خیال رکھا ہے اور انھوں نے اسلام کی ایک جامع فکر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں ہر چیز کو اس کا پورا پورا حق ملے اور ہر چیز کو اپنے مطلوبہ مقام پر رکھے۔
شیخ غزالی اسلامی تہذیب کا زوال اور امت مسلمہ کی ترقی اور پھر پستی کے بارے میں اپنی کتاب

۱۲-الفکر الإسلامی الحدیث فی مواجهة الأفکار الغربیة، ص ۶۵-۶۹ طبع دار الفکر۔

الدعوةُ الإسلامیةُ تستقبلُ قرنها الخامسَ عشرَ میں اَلتَّصْوِیْرُ الْجُزْئِیُّ لِلإسلامِ کے عنوان کے تحت بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اسلام کے کچھ اوپر ساٹھ یا ستر شعبے ہیں، مگر کیا یہ سب ایک دوسرے کے اوپر الجھے پڑے ہیں اور ان میں کوئی ترتیب اور توازن نہیں ہے۔ کیا یہ اس چیز کی طرح ہے جسے کسی شخص نے بازار سے خریدا ہو اور پھر کسی نے کسی طرح اپنے تھیلے میں ٹھونس دیا ہو؟ نہیں...... یہ ایسے شعبے ہیں جو خطرات اور قدر و قیمت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے اس کی جامع صورت میں ایک مخصوص مقام ہے۔ جس سے یہ تجاوز نہیں کرسکتی۔

ایمان کے ان شعبوں کو ملانے والا جال کسی وزارت یا کسی ادارے کے لیے وضع کردہ اس نقشے کی مانند ہے جن میں کوئی مدیر ہوتا ہے، کوئی اس کا معاون ہوتا ہے، کچھ ملازم ہوتے ہیں اور کچھ نگران ہوتے ہیں۔ ان سب کے درمیان ایک متعین تعلق اور ارسال وقبول اور نفاذ وانتاج کا ایک نظام ہوتا ہے۔

ایمان کے یہ شعبے جو کئی عشروں پر مشتمل ہیں ایک چلتی ہوئی گاڑی کی مانند ہیں، جس کی ایک ظاہری شکل وصورت اور ایک انجن ہوتا ہے۔ اس میں ایک ڈرائیور ہوتا ہے، اس میں تیل ڈالا جاتا ہے۔ اس کے پہیے ہوتے ہیں، روشنیاں ہوتی ہیں، سیٹیں ہوتی ہیں اور اس طرح کے اور بہت سے پرزے ہیں جو مل کر گاڑی بنتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک کام اور ایک ذمہ داری ہوتی ہے۔

اسلامی ثقافت اپنے پہلے دن سے کچھ لازمی ارکان کچھ اضافی امور، بعض اصول اور بعض فروع پر مشتمل ہے اس میں کچھ قلبی اعمال [عقیدے کی باتیں] ہیں اور کچھ جسمانی۔

مگر بعض لوگوں میں یہ نئی بات رواج پکڑ گئی کہ اسلام کا کوئی جز اتنی وسعت بھی اختیار کرسکتا ہے کہ وہ باقی اجزا کا حق مارے۔ جیسا کہ جسم میں بعض اجزا اتنے پھول جاتے ہیں کہ اس کی وجہ جسم کے باقی اجزا کو مطلوبہ بڑھوتری نہیں ملتی اور جسم ہلاکت سے دوچار ہوجاتا ہے۔

یہ عقلی کوتاہی سب سے پہلے جن لوگوں کو لاحق ہوئی وہ خوارج تھے۔ دوسرے الفاظ میں فقاہت کا یہی خلل تھا جس کی وجہ سے انھوں نے حضرت علیؓ سے یہ شرط لگائی کہ یا تو وہ تحکیم سے بیزاری کا اعلان کرے یا وہ ان کے خلاف جنگ کریں گے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے بڑوں یعنی بنوامیہ کے خلفا سے بیزاری کا اعلان کریں یا اس کے خلاف جنگ ہوگی۔

ایک خاص فکر نے انسان کی عقل پر قبضہ کیا، اس نے اس کے سارے نفسیاتی خلا کو پر کیا اور دوسری افکار کے لیے کوئی جگہ خالی نہ چھوڑی جو اسے ناپسند تھیں۔

مجھے ایک آدمی ملا جو بھلائی کے ساتھ معروف تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا: کیا آپ فلاں شیخ کے کرامات پر یقین رکھتے ہیں؟ میں نے کہا: میں نے ان کے حالات نہیں پڑھے۔ اس نے کہا: یہ کتاب لے لیں۔ اس میں ان کی پوری سیرت بیان کی گئی ہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد وہ دوبارہ مجھے ملا اور پوچھا: آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے کہا: میں کتاب پڑھنا بھول گیا تھا۔ اس نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: وہ کیوں؟ میں نے کہا: یہ کوئی زیادہ ضروری نہیں تھا۔ اگر میں مر جاؤں تو اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تمھارا شیخ کون تھا اور اس کی کرامات کیا تھیں؟ وہ چلا گیا اور میرے بارے میں اس بات کی اشاعت کرتا رہا کہ میں 'گم راہ' ہوں اور میں اولیا کی کرامات پر ایمان نہیں رکھتا۔

ایک اور شخص مجھے ملا۔ اس نے کہا: موسیقی کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ اگر یہ جہادی موسیقی ہو جس کا مقصد جرأت دلانا اور قربانی پر ابھارنا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر ایسی جذباتی موسیقی ہو جس کے ذریعے کسی جائز اور مفید کام کا شوق دلایا جاتا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر یہ برے جذبات ابھارنے والی اور فحش موسیقی ہو تو پھر جائز نہیں ہے۔ وہ چلا گیا اور میرے بارے میں یہ تبلیغ کرتا رہا کہ میں اباحیت پسند ہوں اور میں حرام [یعنی] موسیقی سنتا ہوں۔

ان دونوں افراد کا ایک بات پر ایمان تھا اور انھوں نے اسی کو دین سمجھ رکھا تھا۔ وہ تمام حالات اور افراد کو اسی کے کٹھہرے میں کھڑا کر کے ان کے بارے میں فیصلہ کرتے تھے۔

یہ پھلاہٹ جو دین کے کسی مخصوص پہلو کو لاحق ہوتا ہے یہ وہ راز ہے جو کبھی ایسے فقہا کا پیدا کردہ ہوتا ہے جن کی فکر تو تیز ہوتی ہے مگر ان کے دل عبادت گزاروں کے نہیں ہوتے، یا ان صوفیوں کی تخلیق ہوتا ہے جن کے احساسات تو عشق کی انتہا پر ہوتے ہیں مگر ان کے پاس فقہا کی عقل نہیں ہوتی۔

یہی راز ان محدثین کی کاوشوں میں بھی کارفرما ہوتا ہے جو نصوص یاد تو کر لیتے ہیں مگر انھیں اپنے ٹھیک ٹھیک مقام پر نہیں رکھتے اور ان میں اجتہاد کا ملکہ نہیں ہوتا۔

اسی طرح یہ ان اصحابِ رائے کی کارگزاری ہوتی ہے جو مصلحت کو تو دیکھتے ہیں مگر اسے کسی صحیح نص کے ساتھ جوڑ نہیں سکتے۔

یا یہ ان حکمرانوں کی کرم فرمائی ہوتی ہے جو کچھ مقررہ اہداف کے لیے کام کرتے ہیں اور اس کے ذریعے وہ عوام کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں مگر تقویٰ کے میدان میں ان ہاتھ لمبا نہیں ہوتا۔

یہ بھی عام طور پر ہوتا ہے کہ لوگ انفرادی عبادتوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں مگر جب بات نصیحت یا زجر کی آتی ہے یا امرونہی کا موقع ہوتا ہے یا حکمرانوں کی ناراضی مول لینے کا مرحلہ ہوتا ہے تو وہاں طویل خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔

یہ خرابی ان لوگوں سے بھی پیدا ہوتی ہے جو مراسم عبادت میں خوب ماہر ہوتے ہیں اور وہ شارع کی طرف سے آئی ہوئی اطاعتوں میں ذرہ برابر بھی کمی بیشی نہیں کرتے مگر باوجود اس کے وہ ان کی حکمتوں سے کوئی آگاہی نہیں رکھتے اور نہ ان میں سے کسی چیز سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

نماز کے نتیجے میں نظم وضبط اور طہارت آتی ہے مگر وہ باہم متفرق اور پراگندہ ہوتے ہیں۔

حج ایک تعمیری سفر ہے جو دل اور اعضا کو سکینت اور رحم سے معمور کرتا ہے مگر لوگ مناسک

حج کے وقت بھی اور اس کے بعد بھی سخت خُو اور برے ہوتے ہیں۔

اسلامی کی دعوت ان لوگوں کے کانٹے صاف کر دیتی ہے جو کم سمجھ والے اور زیادہ سرگرم ہوتے ہیں اور وہ اپنے ناقص فہم کی وجہ سے بھلائی کی جگہ برائی پر چلتے رہتے ہیں......

اسلامی دعوت کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں پہلے اختلافی امور پیش نہیں کیے جاتے خواہ وہ اپنے علم برداروں کے لیے کتنی ہی اہمیت رکھتے ہوں۔ زمین پر بیٹھ کر کھانا اور ہاتھوں سے کھانا سنت عادیہ میں سے ہے۔ اس کا عبادات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دین کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہوگا کہ اسے ان فروعی امور کے پس منظر میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

اسی طرح عورت کے چہرے پر نقاب ایک ایسا مسئلہ ہے جسے بعض فقہا نے قبول کیا ہے اور بعض نے قبول نہیں کیا۔ چنانچہ کسی طرح بھی یہ بات درست نہیں ہوگی کہ اللہ کے دین کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے اسی مسئلے کو سب سے پہلے ان پر لازم کیا جائے۔

اس حدیث پر غور کریں جسے امام بخاری نے نقل کیا ہے، جو اس حوالے سے ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ اسلام کے پیغام کو اس کی اصل شکل میں؛ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو محکم کیا ہے، پیش کرنے کا طریق کار کیا ہے۔

یوسف بن ماہک سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں بیٹھا تھا کہ ان کے پاس ایک عراقی آیا اور کہنے لگا: کون سا کفن بہتر ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ارے کمبخت! [کفن جیسا بھی ہو] تمھیں کیا تکلیف ہے؟

پھر اس عراقی نے کہا: اُم المؤمنین! مجھے اپنا مصحف تو دکھائیے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: کیوں؟ اس نے کہا: شاید میں اس کے مطابق قرآن کا کوئی نسخہ تیار کرلوں، کیوں کہ لوگ اس کو غیر مرتب پڑھ رہے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تمھیں اس سے کیا تکلیف ہے؟ پھر پوچھا: ہاں! اور تم نے

اس سے پہلے قرآن کو پڑھا ہے؟ قرآن جب پہلے پہل نازل ہو رہا تھا اس وقت عموماً مفصلات نازل ہوتی تھیں جن میں جنت اور جہنّم کا ذکر ہوتا تھا۔ پھر جب لوگ اسلام کے لیے برضا و رغبت آمادہ ہوئے تو پھر حلال و حرام کے احکام نازل ہونا شروع ہوئے۔

اگر سب سے پہلے یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو۔ تو لوگ کہتے کہ ہم شراب کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اسی طرح اگر شروع ہی میں یہ حکم نازل ہوتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم تو زنا کو نہیں چھوڑ سکتے۔ مکہ میں جب میں چھوٹی بچی تھی اور کھیلا کرتی تھی تو یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ۔ (القمر ۵۴:۴۶) ان سے نمٹنے کے لیے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور وہ بڑی آفت اور زیادہ تلخ ساعت ہے۔

مگر سورۂ بقرہ اور نساء اس وقت جا کر نازل ہوئیں جب میں نبی ﷺ کے ساتھ تھیں۔

راوی کہتا ہے کہ پھر اس نے اپنا مصحف نکالا مگر اسے دینے کے بجائے اس میں سے ایک سورت املا کرائی۔

لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو دعوت کا کام کرتے ہیں مگر ان میں فقہ اور سمجھ بوجھ نہیں ہوتی۔ وہ اس دین پر احسان کے بجائے اس کا نقصان کرتے ہیں۔ اور ان میں ایسے بھی ہیں جو اپنی کوتاہی کو استعلا کے پردے میں چھپاتے ہیں اور الٹا دوسروں پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔

یہ قصور بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ میں نے بعض ایسے طالب علم بھی دیکھے ہیں جو اسلام کو چاروں طرف سے محدود کرتے کرتے اس کو مرد کے چہرے پر داڑھی اور عورت کے چہرے پر نقاب تک محدود کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تصویر بھی حرام ہے خواہ وہ کاغذ پر کیوں نہ ہو، اور اسی طرح وہ موسیقی کو بھی مسترد کرتے ہیں خواہ وہ شریفانہ ماحول میں اور اچھے الفاظ کے ساتھ کیوں نہ ہو۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ اس طرح کے امور میں کسی حکم کا فیصلہ کردوں، میرا مطلب تو صرف یہ ہے کہ جو بھی کام کرنا ہو وہ اپنے اندازے کے مطابق ہونا چاہیے۔ کوئی شخص جو طرزِ عمل بھی

اختیار کرے اس سے دین کی بلند ترین چوٹی قرار نہ دے۔ حالانکہ وہ دین کے فروعی معاملات میں سے ہوں اور جن کی خاطر جنگ وجدل کرنا دین کے پاؤں پر کلہاڑی مارنے اور اُمت مسلمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے مترادف ہے۔[۱۳]

ترجیحات کے مسئلے کے بارے میں یہ تحقیق اس دعوت کا تسلسل، اس کا تکملہ اور کسی حد تک اس کی تشریح اور تفصیل ہے، جس کی طرف ان نامور مصلحین نے لوگوں کو بھلایا تھا۔ مجھے امید ہے کہ یہ موجودہ اسلامی فکر میں ایک دراڑ کو بند کرنے کا ذریعہ بنے گی۔ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ أَوَّلاً وَآخِرًا.

رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَآ أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَاتَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَآ أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○ (البقرة ۲:۲۸۶)

اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں، ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ۔ ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔ [آمین]

❖❖❖

۱۳-الدعوة الإسلامية تستقبل قرنها الخامس، ص ۶۸-۷۱۔

یادداشت

دین میں ترجیحات

علامہ یوسف القرضاوی

ترجمہ

گُل زادہ شیرپاؤ

منشُورات

دین میں ترجیحات ہر مسلمان کی زندگی کا اہم عملی مسئلہ ہے۔ آج اُمت کے بہت سے مسائل کی وجہ یہ ہے کہ ترجیحات کو اُلٹ دیا گیا ہے۔ فرع اصول سے زیادہ اہم ہوگئی ہے۔ اُمت مسلمہ کی نشاتِ ثانیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ انفرادی و اجتماعی طور پر اپنے تمام معاملات میں اہم اور غیر اہم کا تعین کر کے اہم کو غیر اہم پر مقدم کرے۔ مصنف نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کی ہے اور احکام الٰہی اور فرامین نبوی سے ترجیحات کے تعین کے لیے رہنمائی دی ہے۔ اس کے مطالعے سے دین پر عمل کی راہ آسان ہوتی ہے۔

یوسف مصطفٰی القَرَضاوی [پ ۹ ستمبر ۱۹۲۶ء، مصر]۔ جامعہ ازہر سے ۱۹۵۳ء میں کلیہ اصول دین سے بی۔ اے اور ۱۹۵۴ء میں تدریس کی سند حاصل کی۔ ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹریٹ کی۔ ڈاکٹر قرضاوی عنفوان شباب ہی سے اسلام کی دعوتی سرگرمیوں سے وابستہ ہوگئے۔ وہ ایک خطیب اور علم و تحقیق کی دُنیا کے عظیم رجال میں شمار ہوتے ہیں۔ سو سے زائد چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں۔

علامہ قرضاوی میں ایک فقیہ کی دِقّت نظر بھی پائی جاتی ہے اور ایک ادیب کی شان بھی، ایک مجدد کی فکری عظمت اور ایک داعی کی حرارت ایمانی بھی۔ وہ متعدد عالمی تحقیقی و علمی اداروں سے وابستہ ہیں۔

اِنھیں شاہ فیصل ایوارڈ برائے خدمات اسلامی سال ۱۴۱۳ ہجری، کے علاوہ اسلامی بنک برائے معاشی ترقی کا ایوارڈ سال ۱۴۱۱ ہجری اور سلطان حسن البلقیہ [شاہ برونائی] ایوارڈ برائے فقہ اسلامی، سال ۱۹۹۷ء بھی دیا گیا۔

منشُورات ۱۹۹۳ سے ملک میں تعمیری لٹریچر کی اشاعت میں سرگرمِ عمل ہے۔ ہماری دین کے وسیع تصور کے مطابق ہم زندگی کے ہر گوشے سے متعلق ادب کی ہر صنف شائع کرتے ہیں۔

04136 / 240